دونوں جہان کے سردار ختم الرسل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ

جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے

فَهُوَ رَدٌّ (بخاری و مسلم)

وہ مردود ہے

نیز فرمایا

اِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰهِ وَخَیْرَ الْهَدْیِ

بہترین باتوں کی کتاب قرآن ہے اور بہترین راستہ محمدؐ کا راستہ ہے

هَدْیُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا

اور بدترین اُمور وہ ہیں جو دین میں نئے نکالے جائیں اور دین میں

وَکُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (مسلم)

ایجاد کی ہوئی ہر نئی چیز گمراہی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ
لازم پکڑو میرے طریقے کو اور خلفاء راشدین کے طریقے کو

الْمَهْدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا
جنھیں اللہ نے ہدایت دی ہے۔ اسی پر بھروسہ کرو اور اسی کو دانتوں سے پکڑو

بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ
اور خبردار دین میں نئی نئی باتوں سے بچے رہنا

فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ
ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر

بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)
بدعت گمراہی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

الحمد للہ کہ "بدعت کیا ہے" کو اللہ نے کافی مقبولیت دی اور اس کے
[نس]ل سے اس کے ذریعہ بہت سے ذہنوں کا سدھار ہوا۔ اس تازہ ایڈیشن
[می]ں ہم ایک "نصیحت نامے" کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں جو معنوی اعتبار سے
[خ]اص اہمیت رکھتا ہے۔

مولانا بدرِ عالم میرٹھی ثم مدنی کے نام نامی سے اونچا علمی حلقہ تو پہلے
[ہی] واقف تھا لیکن ان کی تالیف ترجمان السنۃ کی اشاعت کے بعد
[ع]امۂ مستطیعین بھی ان کے بلند علمی مرتبے سے واقف ہو گئے ہیں۔ مولانا موصوف
[ص]رف متبحر عالم ہی نہیں بلکہ اونچے درجے کے شیخ، صاحبِ سلوک اور صراطِ زہدُ
[تق]وی کے فرخندہ صفات رہرو ہیں۔ ہندوستان سے ہجرت فرما کر آپ
[مد]ینہ میں جا بسے ہیں اور آپ کے کمالات نے بہت بڑے حلقے کے قلوب
[می]ں گھر کر لیا ہے۔ توصیف و تعریف میں تطویل ہماری عادت نہیں۔ مختصر یہ
ہے کہ موصوف اُن معتنم ہستیوں میں سے ہیں جنہیں دیکھ کر صحابہ رضوان اللہ علیہم
[ا]ور اولیاء اللہ رحمۃ اللہ علیہم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

آپ نے جملہ عوام و خواص کی بہی خواہی اور دینی دردمندی میں ایک نصیحت نامہ
بطورِ وصیت تحریر فرمایا ہے جس کی ایک کاپی عاجز کے حصے میں بھی آئی ہے۔

عاجز اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اسے شائع کر دے تاکہ جن لوگوں کے قلوب اس سے متأثر ہوں اور اللہ انھیں اس کے ذریعے گمراہی سے بچا لے ان کی اصلاح کا ثواب صاحبِ وصیت کو پہنچتا ہے اس میں سے کوئی رتی عاجز کے حصے میں بھی آجائے۔

مولانا کے فرمودات لفظ بہ لفظ نقل ہیں۔ لیکن عوام کی تسہیل کے لئے میں نے حاشیے میں آیات اور مشکل الفاظ کا ترجمہ دیدیا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اعتراض کرے کہ یہ نصیحت نامہ کسی بلند پایہ علمی تحقیق اور کسی مدلل بحث پر تو مشتمل ہے نہیں۔ محض سادہ سی نصیحتیں ہیں جنھیں وعظ کے انداز میں پیش کر دیا گیا۔ پھر اس اہتمام کے ساتھ شریکِ کتاب کرنے سے کیا حاصل؟

جواب یہ ہے کہ تمام ذخیرۂ علم و استدلال تو محض وسیلہ و ذریعہ ہے اصل مقصود وہی ہے جو اس نصیحت نامے میں موجود ہے۔ نیز ہم جیسے گناہگاروں کی ہزار دلیلیں بھی وہ کام نہیں کر سکتیں جو کسی خدا پرست دلی کے چند سادہ کلماتِ نصیحت کر سکتے ہیں۔

از دل خیزد بر دل ریزد

مولانا بدرِ عالم کے خلوص، جذبِ دروں اور صفائے نیت ہمیں توقع ہے کہ ان کی صاف و سادہ نصائح بھی انشاء اللہ دلوں کو اپیل کریں گی اور اللہ سے ڈرنے والے ان کا اثر لیں گے۔ واللہ الموفق وھو المستعان۔

رحمت باری تعالیٰ کا محتاج   عامر عثمانی

فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّ نَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جملہ احباب کو نسیان اور غفلت کی آفت محفوظ رکھیں اور اپنی محبت میں مست اور اپنی یاد میں محو فرمادیں۔ آمین برحمتک یاارحم الراحمین۔

۲۔ دوسری نصیحت یہ کہ میرے جملہ احباب ہر سنت کا پورا پورا اہتمام رکھیں اور کسی سنت کو خواہ وہ کتنی بھی چھوٹی سی ہو معمولی نہ سمجھیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر سنت اللہ کو محبوب ہے۔ میری جانب سے سنت پر عمل کرنے کی جتنی تاکید ہے اُس سے بڑھ کر "بدعت" سے اجتناب اور نفرت رکھنے کی تاکید ہے۔ کیونکہ بدعت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف نفرت ہے بلکہ ایذا اور تکلیف بھی ہوتی ہے اور جس چیز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو اُس سے بدتر اور کیا چیز ہوسکتی ہے۔
اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَھُمْ عَذَابًا مُّھِیْنًا[1]۔ "بدعت" ایک مہلک اور متعدی مرض ہے۔ اس کے مریضوں سے متعدی امراض کی طرح دُور دُور رہنا چاہیے۔ یعنی بدعت کی محفلوں میں بھی شرکت نہ کرنی چاہیے اور اہلِ بدعت سے اختلاط بھی نہ رکھنا چاہیے۔ قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے بدعتیوں کو دیکھ کر بڑی نفرت کے انداز میں فرمائینگے:۔

"سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ بَدَّلَ بَعْدِیْ"

یعنی جنھوں نے میرے بعد دین میں کوئی تبدیلی کی اور بدعت پھیلائی

---

[1] جو لوگ اللہ اور اسکے رسولؐ کو تکلیف پہنچاتے ہیں انپر دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ کی لعنت ہے اور اللہ نے تیار کر رکھا ہے ان کیلئے ذلت انگیز عذاب ۱۲ (احزاب)

وہ مجھ سے دُور دُور رہیں۔ دیکھئے کہ جو ہمارے ماں باپ بلکہ دنیا جہان سے زیادہ شفقت کرنے والے ہیں۔ وہ اہلِ بدعت سے کتنے بیزار نظر آرہے ہیں۔ کیونکہ بدعت ایجاد کرنے کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ ہمارا کامل دین گویا ابھی ناقص ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں بھی کسی کمی بیشی کی گنجائش ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی گویا نبوت کی ضرورت باقی ہے اور یہ ختمِ نبوت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟ اس لئے بدعت کا اثر نہ صرف مسلمان کے اعمال پر ہوتا ہے بلکہ اس کے عقائد پر بھی پڑتا ہے۔ اس لئے بدعت میں غلو کرنے سے یعنی اس کی زیادتی سے سوءِ خاتمہ[1] کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لئے سلف سے لیکر خلف تک "بدعت" اور "بدعتیوں" سے سخت احتراز کرنے کی تاکید کرتے چلے آئے ہیں اور اُن کی اتباع میں آج اپنے بھائیوں کو میں بھی یہی تاکید کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ہماری نظروں میں محبوب بنا دیں اور بدعت سے سخت نفرت و کراہت پیدا فرما دیں۔ اَللّٰھُمَّ[2] حَبِّبْ اِلَیْنَا الْاِیْمَانَ وَزَیِّنْهُ فِیْ قُلُوْبِنَا وَکَرِّهْ اِلَیْنَا الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِیْنَ ط۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ زمانہ "آخری زمانہ" ہے اس لئے اپنے دین کو محفوظ کر لینا چاہیئے اور دوسرے ضدی متعصبوں کے مُنہ نہ لگنا چاہیئے۔ ہاں جو شخص سلیم الفطرت ہو اور دین کی بات سُننے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کو سمجھانا چاہیئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یعنی موت کے وقت خدا کی یاد سے غافل ہو جانیکا اندیشہ [2] اے اللہ! محبوب بنا دیجئے ہمارے لئے ایمان کو اور زینت دیجئے ہمارے دلوں کو ایمان سے اور ناگوار بنا دیجئے ہمارے لئے کفر کو اور فسق و معصیت کو اور شامل کر دیجئے ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے والوں میں ۱۲

کی سنت پر عمل کرنے کی ترغیب دلانے میں کوئی کمی باقی نہ رکھنا چاہیئے۔ اصل بات یہ ہے کہ سب سے پہلے نفس کی اصلاح کرنی لازمی ہے پھر اس کے بعد اپنے اہل وعیال اور اہلِ شہر اور جملہ مسلمین کی۔ کیونکہ بے عمل کی دعوت ہمیشہ بے اثر ہوتی ہے اور باعمل کی دعوت کبھی بے کار نہیں جاتی۔

۳۔ سب احباب کو یہ نصیحت اور وصیت ہے کہ وہ کسی مسلمان کو کسی وجہ سے حقیر و ذلیل نہ سمجھیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کفٰی[لہ] بالمرءِ اثماً ان یحقر مُسلماً۔ اوکما قال۔ بات یہ ہے کہ اسلام اتنی بڑی نعمت ہے کہ جس کو یہ نصیب ہو گئی اُس کو سب کچھ نصیب ہو گیا۔ اس لئے گناہ خواہ کتنا ہی ذلیل چیز ہو لیکن گنہگار اگر ایماندار ہو تو اپنے ایمان کی وجہ سے وہ پھر محترم ہے اور ایک نہ ایک دن جنت میں جا کر رہے گا۔ پھر توبہ اور استغفار کا دروازہ اس کے لئے ہر وقت کھلا ہے کسی کو کیا خبر کہ اس نے دن کی روشنی میں یا رات کی اندھیری میں کسی وقت توبہ کر لی ہو یا آئندہ توبہ کرے۔ پھر جب معاف کرنے والا معاف کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہے تو ہم گناہگاروں کا حق کیا ہے کہ اپنے دوسرے گنہگار مسلمان بھائی کو ذلیل وحقیر سمجھیں۔ پھر یہ فیصلہ کون کر سکتا ہے کہ ایک گنہگار مسلمان اور اس کے ناصح میں زیادہ قابلِ گرفت کون ہے۔ اس لئے لازم یہ ہے کہ ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کو عزت اور احترام کے ساتھ سمجھائے اور اپنے دل میں اس پر شرمندہ رہے کہ گنہگار میں بھی ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے گناہ بخش دے اور اپنی رحمت واسعہ سے جنت الفردوس عطا کرے۔

۴۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ حسنِ ظن رکھے اور

لہ آدمی کے گناہگار ہونے کیلئے یہی بات کافی ہے کہ وہ مسلمان کی تحقیر کرے ۱۲

اُس کے سامنے اور اُس کے پیچھے اُس کی تعریف میں زیادہ مبالغہ بھی نہ کرے اسلئے احباب سے التماس ہے کہ وہ میرے بعد میری تعریف میں مبالغہ نہ کریں بلکہ اخلاص اور تضرع کے ساتھ میری مغفرت کی ہمیشہ دعا مانگا کریں اور اس میں بھی شرعی طریقہ کا لحاظ رکھنا لازم سمجھیں۔ یعنی کسی دن کی تخصیص ہرگز نہ کریں اور اسی طرح اجتماع بھی ہرگز لازم نہ سمجھیں۔ بلکہ جس سے جس طرح ممکن ہو اپنی اپنی جگہ ایصالِ ثواب کا خیال رکھیں۔ ہاں خبرِ وفات پہنچنے پر پہلی بار اگر مخلص احباب جمع ہو کر قرآن کریم ختم کریں تو کچھ تقسیم کئے بغیر اس کا ثواب بخش دیں تو مناسب ہے لیکن آئندہ کے لئے اس کو ہرگز مقررہ رسم نہ بنائیں اور جن چیزوں کا اُنکو علم نہیں ہے اور نہ میں اُن کا مستحق ہوں وہ میری طرف منسوب نہ کریں۔ یعنی ملک سب اللہ کا ہے اور اسی کا تصرف اس میں جاری ہے اس لئے کسی معذور بندے کی طرف کسی کام کی نسبت کرنا بہت بڑی غلطی اور مالکِ حقیقی کی بہت بڑی حق ناشناسی ہے۔ تعالیٰ اللہ عما یشرکون[۱] ؕ

۵۔ جس طرح حق تعالیٰ کا یہ حق کہ اُس کی ذات وصفات میں کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھیرائے، نہ کسی بزرگ اور نہ کسی ولی کو اور اس کی کتاب یعنی قرآن کریم کا حق یہ ہے کہ اُس کے حکموں کو مانا جائے اور ان پر عمل کیا جائے، اور اُس کی تلاوت کی جائے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حق یہ ہے کہ آپ پر ایمان لائے اور یقین رکھے کہ آپ کے بعد کوئی اور نبی پیدا نہ ہوگا جان دل سے آپ کی شریعت کی اتباع کرے اور بدعت سے کامل احتراز کرے اور آپ کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے اوقات میں سے ایک حصہ بصد ذوق شوق آپ پر درود بھیجنے کے لئے وقف کرے۔ اس لئے احباب کو تاکید کرتا ہوں

---

[۱] اللہ جل شانہٗ اُن سے بلند و برتر ہے جنھیں مشرکین اسکا شریک ٹھیرا رہے ہیں (نحل و نمل)

کہ وہ ذکر اللہ سے، جس طرح اُن کو تعلیم دیا گیا ہے۔ غفلت نہ کریں اور زبان سے بھی ایک تسبیح کلمۂ توحید کی آہستہ آہستہ پڑھ لیا کریں۔ کیونکہ حدیث شریف میں اسی کلمہ کو افضل الذکر کہا گیا ہے اور کچھ نہ کچھ حصۂ قرآن کریم کا روزمرہ تلاوت کریں اور درود شریف پڑھنا بھی حسب استطاعت اور وقت اپنے ذمے لازم سمجھیں!!

تنبیھا:۔۔۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں اہلِ بدعت کی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔ کیونکہ ہر شخص متبع سنت ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے اس لئے اس کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھنے والے لوگوں پر نظر کرے اگر وہ اکثر اہلِ بدعت ہوں اور وہ ان سے خوش رہے اور اُن کی بدعتوں کی اصلاح بے خوفی کے ساتھ صاف صاف نہ کرے تو ایسے شخص کو بدعتی ہی سمجھنا چاہئے یا جو اہلِ بدعت کی مشہور رسمیں ہوتی ہیں جیسے میلاد شریف کرنا اور اسمیں قیام کرنا اور عرس وغیرہ کو ماننا (جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کے بدعت ہونے کی صراحت فرمائی ہے) وہ بھی بدعتی ہے خواہ کتنا ہی متبع سنت ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔

دین میں مداہنت[۱] کرنے والے کی قرآن کریم میں بڑی مذمت آئی ہے اصلاحِ خلق کے معنی ان میں گھل مل جانا نہیں ہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ اگر وہ اصلاح پذیر نہ ہوں تو ان سے الگ ہو جائے اور ان سے اپنی بیزاری کا اعلان کردے پس جس شخص کے ہم نشین اکثر اہلِ بدعت ہوں اور وہ اسی طرح اپنی بدعتوں پر قائم رہیں اور اُس سے خوش رہیں اور وہ ان سے خوش رہے تو ایسے شخص کو بھی بدعتی

---

[۱] باطل کی تردید و توبیخ میں غفلت برتنا۔ اثباتِ حق میں کمزوری دکھانا۔ خلاف دین اُمور میں رواداری اختیار کرنا۔ برائی کے معاملہ میں درگذر اور ڈھیل سے کام لینا ۱۲ (ج)

سمجھنا چاہیئے اور صرف اُس کے دعوے پر مغالطہ نہ کھانا چاہیئے۔

حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہٗ اپنے مکتوبات جلد دوم کے مکتوب نمبر ۲۹ میں مداہنت اور صلح کل رکھنے کی مذمت میں فرماتے ہیں:۔

"مخدوما! اہلِ زمانہ کی زبانوں پر عام طور پر یہ بات چڑھی ہوئی ہے کہ صوفیاءِ کرام کا مسلک و مشرب یہ ہے کہ مخلوق کے حال سے بالکل تعرض نہ کیا جائے اور کسی سے بُرے نہ بنیں۔ چونکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے اور بہت سے فتنوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے اس لئے دل میں یہ آیا کہ اس بارے میں کچھ لکھا جائے۔ مکرما! جو شخص اس قسم کا لغو خیال رکھتا ہے (امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو مسلک صوفیاء کے خلاف کہتا ہے اور سمجھتا ہے) پتہ نہیں کہ وہ کس جماعت کے صوفیاء کے متعلق یہ بات کہتا ہے۔ ہمارے پیروں یعنی مشائخ نقش بندیہ ؒ کا طریقہ خود اتباعِ سنت اور اجتناب از بدعت ہے۔ جیسا کہ اِن حضرات کی کتابوں سے اور اُن کے رسائل سے یہ بات ظاہر و ہویدا ہے۔"

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ جو کہ اکابر صوفیاء میں سے ہیں، فرماتے ہیں جو شخص صاحبِ بدعت سے محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ اُس کا عمل حبط کر دے گا اور اس کے قلب سے ایمان کی نورانیت سلب کر لے گا اور میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ یہ جان لے گا کہ کوئی شخص صاحبِ بدعت سے بغض رکھتا تھا تو اس بغض رکھنے والے کو یقیناً بخش دے گا" اگرچہ اس کے نیک عمل قلیل ہی کیوں نہ ہوں۔ اے مخاطب! تو جب کسی بدعتی کو ایک راستہ پر چلتا دیکھے تو دوسرا راستہ اختیار کر لے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ

وسلم نے ان الفاظ میں لعنت فرمائی ہے۔" جو کوئی بدعت ایجاد کرے یا کسی بدعتی کو ٹھکانہ دے اس پر اللہ کی اُس کے فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت پڑتی ہے۔ نہ ایسے شخص کا فرض قبول نہ نفل۔" حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔" اے عائشہؓ! وہ لوگ جنھوں نے دین میں تفریق پیدا کر دی اور گروہ در گروہ ہوئے اصحاب بدعت اور اربابِ ہوا و ہوس ہیں اُن کو توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی، میں ان سے بری ہوں، وہ مجھ سے۔" اگر مشرب صوفیاء کرام ترک امر بالمعروف نہی عن المنکر کا کام ہو اس دن کو اچھا دن نہ سمجھیں۔ پس مطلب ظاہر ہے یہ جس روز صوفیاء مداہنت برتیں وہ دن خیر کا دن نہیں ہے۔ حضرت عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ:-

" بندہ صریح الایمان نہیں پا سکتا تاوقتیکہ اللہ کیلئے بغض کرے۔"

جس کسی میں یہ صفت پیدا ہو گئی کہ اللہ کے لئے محبت رکھتا ہے، اور اللہ کے لئے بغض رکھتا ہے تو وہ مستحق ولایت ہو گیا (رواہ احمدؒ)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کسی نے اللہ کے لئے محبت کی اور اللہ ہی کیلئے بغض رکھا اور اللہ کے لئے عطا کیا اور اللہ کے لئے منع کیا اس کا ایمان کامل ہو گیا۔ (رواہ ابوداؤد) اس کے بعد اس مضمون کی چند اور احادیث پیش کی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ دوستانِ محبوب سے محبت اور دشمنانِ محبوب سے عداوت لوازم محبت میں سے ہے۔ محب صادق بے اختیار ان دونوں باتوں کو عمل میں لاتا ہے اور کسب و عمل کا محتاج نہیں ہوتا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[۱] الآیۃ۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ طالبِ حق کو (غلط قسم کے لوگوں سے) بیزاری بھی ضروری و ناگزیر ہے (اس کے بعد چند آیات اس مضمون کی اور پیش کی ہیں) "اہلِ وحدت وجود" میں جو حضرات مستقیم الاحوال ہیں اُن کا دینِ متین میں تشرع اور پختہ ہونا بھی مشہور ہے۔ تحریر کا محتاج نہیں۔ عجیب تماشے کی بات ہے کہ جو لوگ مشرب کم آزاری اور مسلک صلح کل اختیار کئے ہوئے ہیں وہ یہود' جوگیہ' براہمہ اور زنادقہ وغیرہم کے ساتھ تو اچھے ہیں ان سے صلح، صحبت' انبساط و محبت رکھتے ہیں' لیکن اہلِ سنت و جماعت سے جو کہ فرقۂ ناجیہ ہے غلظت و عداوت کا معاملہ کرتے ہیں' اُن کی صلح دوسروں سے ہے۔ اس جماعت حقّہ کو ایذا و آزار پہنچاتے ہیں اور اس کو بیخ و بُن سے اُکھاڑنا چاہتے ہیں۔ اچھی صلح کُن پالیسی ہے کہ محمدیوں سے عداوت اور غیر محمدیوں سے محبت و مودت۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیں اگر ترکِ تعرض[۲] محمود ہوتا تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجبات دین سے نہ ہوتے اور اللہ تعالیٰ امر و نہی کرنے والوں کو خیر امت کا لقب نہ دیتا۔

۶۔ آخر میں مکتوبات حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ تعالےٰ نمبر ۱۱ جو مواعظ و نصائح میں شیخ عبدالحلیم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نام لکھا گیا اسکے چند اقتباسات بغرض نفع رسانی برادران درج کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ مسلمان بھائیوں کو اس سے نفع بخشیں۔

---

[۱] یقیناً تمہارے لئے اسوۂ حسنہ ہے حضرت ابراہیم اور ان کے پاکباز ساتھیوں کے کردار میں (ممتحنہ) [۲] ترکِ تعرض یعنی خلاف شرع اُمور میں ڈھیل دینا اور ان کے ابطال و استیصال کی کوشش نہ کرنا۔ خلافِ دین اُمور کو مٹانے میں جد و جہد کرنا تو لازمۂ ایمان ہے۔ (ع)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ الآیۃ۔ اس آیت سے
واضح ہوتا ہے کہ طالب حق کو (غلط قسم کے لوگوں سے) بیزاری بھی ضروری و
ناگزیر ہے (اس کے بعد چند آیات اس مضمون کی اور پیش کی ہیں) "اہلِ وحدت
وجود" میں جو حضرات مستقیم الاحوال ہیں اُن کا دین متین میں تشرع اور پختہ ہونا
بھی مشہور ہے۔ تحریر کا محتاج نہیں۔ عجیب تماشے کی بات ہے کہ جو لوگ مشرب
کم آزاری اور مسلک صلح کل اختیار کئے ہوئے ہیں وہ یہود، جوگیہ، براہمہ اور
زنادقہ وغیرہم کے ساتھ تو اچھے ہیں ان سے صلح، صحبت، انبساط، محبت رکھتے
ہیں، لیکن اہلِ سنت وجماعت سے جو کہ فرقہ ناجیہ ہے غلظت وعداوت کا
معاملہ کرتے ہیں، اُن کی صلح دوسروں سے ہے۔ اس جماعت حقہ کو ایذا و
آزار پہنچاتے ہیں اور اس کو بیخ وبُن سے اُکھاڑنا چاہتے ہیں۔ اچھی صلح کُل پالیسی
ہے کہ محمدیوں سے عداوت اور غیر محمدیوں سے محبت ومودت۔ خوب اچھی طرح
سمجھ لیں اگر ترک تعرض[۲] محمود ہوتا تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر واجبات دین سے
نہ ہوتے اور اللہ تعالیٰ امر ونہی کرنے والوں کو خیر امت کا لقب نہ دیتا۔

۶۔ آخر میں مکتوبات حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ
نمبر ۱۱۱ جو مواعظ ونصائح میں شیخ عبدالحلیم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نام لکھا گیا اسکے
چند اقتباسات لغرض نفع رسانی برادران درج کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ
مسلمان بھائیوں کو اس سے نفع بخشیں۔

ے[۱] یقیناً تمہارے لئے اسوۂ حسنہ ہے حضرت ابراہیم اور ان کے پاکباز ساتھیوں کے
کردار میں (ممتحنہ) ے[۲] ترکِ تعرض یعنی خلاف شرع اُمور میں ڈھیل دینا اور
ان کے ابطال واستیصال کی کوشش نہ کرنا۔ خلافِ دین اُمور کو مٹانے میں جدوجہد
کرنا تو لازمۂ ایمان ہے۔ (ق)

"اے بھائی! ناجنس اور مخالف کی صحبت سے بچتے رہنا اور بدعت
کی مجلس سے گریزاں رہنا" حضرت یحییٰ معاذ رازی قدس سرہٗ کا
مقولہ ہے کہ ان تین اصناف سے اجتناب کرو (۱) علمائے غافلین
(۲) قرائے مداہنین (۳) متصوفۂ جاہلین۔ جو شخص مسندِ مشیخت
پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کا عمل موافق سنتِ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نہیں ہے اور نہ وہ خود زیورِ شریعت سے آراستہ ہے
خبردار خبردار اس سے دُور رہنا، بلکہ احتیاطاً اس شہر میں بھی نہ
رہنا جس میں ایسا مکار رہتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ عرصہ بعد اس کی
طرف دل کا کچھ میلان ہو جائے اور کارخانۂ روحانیت خلل پذیر ہو۔"
"مکرر لکھتا ہوں کہ آدابِ نبوی کا خیال نہ رکھنے والے اور سُننِ
مصطفوی کو چھوڑنے والے کو ہرگز ہرگز "عارف" خیال نہ کرنا، اس کے
ظاہری تبتّل[۱] وانقطاع، خوارقِ عادت، زہد و توکل اور زبانی "معارفِ
توحیدی" پر فریفتہ و شیفتہ نہ ہو جانا۔ مدار کار اتباعِ شریعت پر ہے
اور "معاملۂ نجات" پیروی نقشِ قدم رسول سے مربوط ہے۔ حضرت عبداللہ
بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے "جس نے آداب سے سُستی برتی وہ سنن
سے محروم ہوگا۔ جس نے سُنن سے غفلت اختیار کی وہ فرائض سے محروم
ہوا اور جس نے فرائض سے تہاون[۲] کیا وہ معرفت سے محروم ہو گیا۔" اگر
کوئی گناہ وقوع میں آجائے تو بہت جلد اس کا تدارک توبہ و استغفار سے
کر لینا چاہیئے۔ گناہِ پوشیدہ کی توبہ پوشیدہ طریقہ پر اور گناہِ آشکارا کی
علانیہ طور پر توبہ ہو۔ توبہ میں دیر نہ کی جائے۔ انسان کو چاہیئے کہ دُرع:

---

[۱] غیر اللہ سے کٹ کر پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہونا [۲] سُستی، غفلت، تساہل ۱۲

تقویٰ کو اپنا شعار بنائے اور منہیات میں قدم نہ رکھے۔ کیونکہ اس راہِ سلوک میں نواہی سے باز رہنا در حقیقت اوامر کے امتثال سے زیادہ ترقی بخش اور سودمند ہے۔ تمام افعال و حرکات میں اس کا قصد کرے کہ نیت صحیح ہو۔ جب تک نیت صالح نہ ہو حتی الامکان کوئی قدم نہ اٹھائے۔ لوگوں کے ساتھ اختلاط بقدرِ ضرورت کرے۔ وہ جو برائے افادہ و استفادہ ہو البتہ محمود بلکہ ضروری ہے۔ ہر نیک و بد کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہئے، خواہ اُس سے باطن میں انبساط پیدا ہو یا انقباض۔ جو شخص عذرخواہی کرے اس کے عذر کو قبول کرنا چاہئے۔ اخلاق اچھے ہوں، خواہ مخواہ اعتراض کسی پر نہ کیا جائے۔ نرم و ملائم گفتگو ہو، کسی کے ساتھ سختی و درشتی سے معاملہ نہ کرے۔ ہاں اللہ کے لئے سختی کر سکتا ہے۔ حضرت محمد بن سالم رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ اولیاء کی پہچان کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا، اولیاء کی علامت یہ ہے "لطف لسان" حسنِ اخلاق، بشاشتِ چہرہ، سخاوتِ نفس، قلتِ اعتراض، عذرخواہ کے عذر کو قبول کرنا، تمام مخلوقِ خدا پر شفقت کرنا، خواہ نیکوکار ہوں یا بدکار۔

حضرت ابو عبداللہ احمد مقری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جواں مردی یہ ہے کہ جو جس شخص سے کدورت رکھتا ہو اس سے حسن خلق سے پیش آئے اور جس آدمی سے کراہت کرتا ہو اس پر مال خرچ کرے اور جس سے نفرت ہو اُس سے اچھا سلوک کرے۔ بات چیت کرنے میں "رعایتِ قلت" مدِ نظر ہے زیادہ سونا اور زیادہ ہنسنا بھی درست نہیں، کیونکہ اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اپنے تمام اُمور اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرے اور خدمتِ مولا میں چست ہو جائے۔ ایسا کریگا تو تدبیرِ اُمور سے فارغ ہو جائیگا اور سب کام غیب سے بن جائینگے

یحییٰ معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "جس قدر تجھے اللہ سے محبت ہوگی مخلوقِ خدا بھی تجھ سے اتنی ہی محبت کرے گی۔ تجھے خدا کا جس قدر خوف ہوگا مخلوق بھی تجھ سے اتنا ہی ڈرے گی اور تو جتنا خدا کے حکموں میں مشغول ہوگا مخلوق بھی تیرا اتنا ہی اتباع کرے گی" کسی پر اعتماد سوائے فضلِ پروردگار کے نہ ہو۔ اہل وعیال کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیئے اور بقدرِ ضرورت ان سے اختلاط ہو، تاکہ اُن کا حق ادا ہو جائے۔ "موانست تام" ان سے نہ ہو۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ سے اعراض کا اندیشہ ہے۔ "احوالِ باطن" نااہل سے نہ بیان کئے جائیں۔ "مالداروں" سے حتی المقدور میل جول نہ رکھائے۔ جمیع حالات میں سنتِ نبوی کو اختیار کیا جائے اور بدعت سے حتی الوسع اجتناب ہونا چاہیئے۔ سالک کو چاہیئے کہ عبادت میں متوانی نہ ہو، عیوب مردم پر نظر نہ کرے اور اپنے عیوب ہمیشہ پیشِ نظر رکھے، اپنے آپ کو کسی مسلمان پر ترجیح نہ دے، سب کو اپنے سے بہتر سمجھے، ہر مسلمان سے حسنِ ظن اعتقاد رکھے کہ اس کی برکت اور دعا سے مجھے بخشش کا ذریعہ میسر ہو سکتا ہے، سلف صالحین کے حالات پیشِ نظر رکھے، مسلمان کی ہم نشینی پسند کرے۔ کسی کی غیبت کی جانب خود بھی مائل نہ ہو اور جہاں تک ہو سکے دوسروں کو بھی اس سے روکے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا شیوہ بنائے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں انفاقِ مال پر حریص ہو۔ حسنات کے صدور سے خوشی محسوس کرے اور سیئات کے ارتکاب سے دور دور رہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص ایسا ہو کہ اپنا گناہ اس کو اداس کرے اور نیکی اُس کو خوش کرے بس وہ مومن کامل ہے۔

اس مسکین کی التماس تمام [illegible] دوستوں سے یہ ہے کہ اس [illegible] تعالیٰ کو

دعاؤں سے فراموش نہ کرو گے اور اللہ تعالیٰ کے کرم عمیم سے درخواست کرو گے کہ یہ گنہگار تباہ کار قیامت کے دن کم از کم زمرۂ عاصیان مرحوم میں داخل و شامل ہو جائے۔ ؎

کجا باد کجا زنجیر زلفش عجب دیوانگی اندر سر افتاد

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت)

بندہ محمد بدر عالم غفرلہ

؎ پاک ذات ہے تیرے رب کی جو عزت والا پروردگار پاک ہے ان باتوں سے جن کی نسبت کفار و مشرکین اس کی طرف کرتے ہیں اور سلام ہے رسولوں پر اور تمام خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو رب ہے سارے جہان کا۔ (الصّٰفّٰت)

فہرستِ مضامین

مطبع :- نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند

اشاعت سوم

فروری ۶۲ء

قیمت تین روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

از:۔ ماہر القادری

اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اس پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سب سے زیادہ اپنی "توحید" کا ذکر فرمایا ہے یہی وہ "محور" ہے جسکے اردگرد اسلام، ایمان اور اخلاق کے تمام تقاضے گردش کرتے ہیں "توحید" اسلام اور ایمان کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد میں اگر فرق آگیا اور یہ عقیدہ خدانخواستہ مجروح ہو گیا تو پھر ایمان، اسلام اور عبادت وتقویٰ سب کے سب نامعتبر قرار پاتے ہیں اور یہ وہ خسارہ اور نقصان ہے جسے نہ رسول کی محبت پر کر سکتی ہے اور نہ کسی ولی کی عقیدت! اور نہ کوئی نیکی اس کا بدل ہو سکتی ہے!

انبیاء کرام کی بعثت کی غرض و غایت ہی یہ تھی انسانوں کے سامنے خالقِ کائنات کی توحید معبودیت، اور اس کے "الٰہ" ہونے کے عقیدے کو پیش کریں۔ چنانچہ یہ نفوسِ قدسیہ بعثت سے لے کر نفسِ واپسیں تک "توحید" ہی کا درس دنیا کو دیتے رہے ہے۔ یہی نقطۂ توحید اُن کی دعوت کا آغاز بھی تھا، وسط بھی تھا اور نقطۂ اختتام بھی تھا!

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا

(اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول مگر اس کو بھی حکم دیا کہ بے شک بات یوں ہی ہے)

فَاعْبُدُوْنَ۔ کہ کوئی "الٰہ" نہیں سوائے

\+ + + + میرے، سو بندگی کرو

\+ + + + میری

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں صرف اسی پر بس نہیں کہا کہ "مجھے اللہ مانو اور میری بندگی کرو" بلکہ اُس نے بار بار طرح طرح سے عنوان بدل اور مثالیں دے کر، یہ بھی فرمایا کہ مجھ جیسا کوئی نہیں۔ میری خدائی میں کوئی شریک نہیں۔ میرے سوا نہ کوئی کسی کی مشکل رفع کر سکتا ہے نہ کسی کو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں ہی خالق ہوں۔ رازق ہوں، حاجت روا اور مشکل کشا ہوں۔ میں کسی کو کچھ دینا چاہوں تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں کسی کو نہ دوں تو کوئی اُسے دلوا نہیں سکتا۔ ہر جاندار کی چوٹی میرے ہاتھ میں ہے۔ کائنات میں بلاشرکتِ غیرے متصرف میں ہوں۔ میری ہی ربوبیت کے سہارے دونوں جہاں چل رہے ہیں اور میری ہی قدرتِ کاملہ کونین کے نظام کو چلا رہی ہے "حی" صرف میں ہوں کہ میری ذات کے سوا ہر جان اور ہر شے ہالک اور فانی ہے۔ "قیوم" صرف میری ذات ہے ا پانی میں برساتا ہوں، رزق میں دیتا ہوں، کھیتیاں میں اُگاتا ہوں، دریا میرے حکم سے رواں دواں ہیں، ہوائیں میرے حکم سے چلتی ہیں، چاند سورج میرے حکم کے تابعدار ہیں۔ غرض تمام کائنات میں میری اور صرف میری حکومت اور خدائی ہے اور اس میں میرا کوئی شریک، ساجھی اور ہاتھ بٹانے والا بھی نہیں ہے! عزتیں اور ذلتیں سب کو میرے در سے ملتی ہیں۔ عالم الغیب والشہادہ صرف میری ذات ہے، کونین کی تمام مخلوق میری محتاج ہے اور ہر کوئی میرے ہی در کا فقیر اور بھکاری ہے! خالق میں ہوں میرے سوا

کوئی انسان ایک مکھی اور مچھر تک کو پیدا نہیں کر سکتا۔

یہ ہے "توحید" کے اجمال کی تفصیل، جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ اور بار بار پیش فرمائی ہے! اس عقیدۂ توحید کا نہ صرف یہ کہ اقرار کرنا اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے بلکہ اپنے عمل سے بھی اس اقرار و ایمان کا پورا پورا ثبوت دینا چاہئے۔ دعا اور عبادت میں، دفعِ بلا اور طلبِ نعمت میں، استمداد و استعانت میں، اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح کسی بندے سے چاہے وہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو۔ اگر معاملہ کیا جائے گا تو اس سے "توحید" کا عقیدہ مجروح ہو گا اور ظروف و احوال اور کیفیات کے اعتبار سے "شرک" یا "شبہ شرک" کا ارتکاب لازم آئے گا۔

عرب کے مشرکین خدا کے وجود کے منکر تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق بھی مانتے تھے، مگر وہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں "سفارشی" سمجھ کر اُن کے ساتھ وہ معاملہ کرتے تھے جو اللہ کے ساتھ کرنا چاہئے۔ یعنی بُتوں کے روبرو سجدہ ریزی اُن کی دُہائی دینا، اُن سے مدد چاہنا، اُن کو کائنات میں متصرف اور دخیل سمجھنا، ان مشرکانہ حرکات کے ساتھ اُن کا "خدا کو ماننا" اللہ کے یہاں مقبول نہ ہو سکا اور اُن کو مشرک قرار دیا گیا۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُونَ۔

اور پوجتے ہیں جو اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو نہ کچھ فائدہ دیویں اُن کو نہ کچھ نقصان۔ اور کہتے ہیں "یہ سفارشی ہیں اللہ کے پاس"۔ کہو کیا بتاتے ہو تم اللہ کو جو نہیں جانتا وہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں؟ سو وہ پاک ہے ان سب سے جن کو یہ شریک بتاتے ہیں!

دوسری آیت میں کفّارِ قریش کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:-

وَمَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی۔ — پوجتے ہیں ہم اُن کو صرف اس لئے کہ وہ ہمکو اللہ کے نزدیک کردیں۔

یہ بُت جن کی کفّار قریش پرستش کیا کرتے تھے، جن سے مرادیں مانگتے تھے اور جن کے ناموں کی دُہائی دیتے تھے اُن کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین نے نیک اور برگزیدہ اشخاص (رجال صالحین) کے ناموں پر بتوں (ود، سواع، یغوث، نسر، اساف، نائلہ) کے نام رکھ لئے تھے۔

"البدایہ والنہایہ" میں علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ص ۱۰۶ پر راویوں کے ناموں کے ساتھ روایت نقل کی ہے:-

ودا رجلاً صالحاً وکان محبباً فی قومہ فلما مات عکفوا حول قبرہ۔ — وَدّ ایک مرد صالح تھا جو اپنی قوم میں محبوب تھا جب وہ مر گیا تو اس کی قبر کے ارد گرد لوگ گھومنے (طواف کرنے) لگے۔

اس روایت میں تفصیل ملتی ہے کہ کس طرح شیطان نے ان لوگوں کو بہکایا۔ اور ان لوگوں نے آگے چل کر وَدّ کی تمثال کی پوجا شروع کر دی یہانتک کہ:-

حتی اتخذوہ الٰھاً یعبدونہ من دون اللہ۔ — یہانتک کہ لوگوں نے اُسے "الٰہ" بنالیا اور اللہ کے سوا اُسے پوجنے لگے۔

پھر آگے چل کر علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

ومقتضی ھذا السیاق ان کل صنم عندہ عبدہ طائفۃ من الناس — اس سیاق عبارت سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس طرح کے تمام بُت انسانوں کے گروہوں سے تھے۔

+ + + +

اس تصریح سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کفارِ قریش جن مشہور بتوں کی پرستش کرتے تھے، اُن کے نام شروع شروع میں اولیاء اور صلحاء کے ناموں پر رکھے گئے تھے اور ان بتوں کی پرستش کے پیچھے صالحین کی ارواح کی پوجا اور اُن سے طلب واستمداد کا تصور بھی کسی نہ کسی حد تک موجود تھا۔

اہلِ بدعت کی طرف سے جو یہ کہا جاتا ہے کہ ہم دنیا میں جو ایکدوسرے سے امداد طلب کرتے ہیں۔ ایک شخص دوسرے کے پاس اپنی حاجت لیجاتا ہے، اُس سے عرض معروض کرتا ہے، جب ایسا کرنا شرک نہیں ہے تو پھر انبیاء اور اولیاء اور صلحاء سے طلبِ امداد شرک کیوں ہونے لگا! اس لئے کہ "شرک" تو یہ ہے کہ کوئی "کسی کو" خدا یا بالذات قادر، مختار اور معطی سمجھ کر اُس سے امداد چاہے۔ بندوں میں بالذات قدرت نہیں ہے، اللہ کی عطاء کی ہوئی قدرت ہے تو اللہ کی دی ہوئی قدرت کی بناء پر انسانوں سے استمداد واستعانت شرک نہیں ہے؟"

یہ نہایت فریب آمیز مغالطہ ہے جو اہلِ بدعت کی طرف سے دیا جاتا ہے، اُن کے تمام علم کلام کی بنیاد ہی اسی "ذاتی" اور "عطائی" کی تقسیم اور تفریق پر ہے۔ یہ وہی استدلال ہے جو نمرود بادشاہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس سے فرمایا۔

..... رَبِّیَ الَّذِی یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ۔ میرا رب وہ ہے جو مارتا اور جلاتا ہے (یعنی جسکے اختیار میں زندگی اور موت ہے)۔

+ + + +

تو اس کے جواب میں نمرود نے کہا۔

..... اَنَا اُحۡیٖ وَاُمِیۡتُ ۔ میں بھی مارتا اور جلاتا ہوں (یعنی زندگی اور

موت میرے اختیار میں بھی ہے۔ + + + +

اہلِ بدعت کی طرح نمرود نے بھی "ذاتی اور عطائی" قدرت کے لفظی مغالطہ کو اپنے استدلال کی بنیاد بنایا اور یہ اتنی احمقانہ بات ہے کہ اس کا جواب دینا خود انسانی عقل کی توہین ہے۔ اس لئے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس جاہلانہ اور احمقانہ استدلال کی تردید کئے بغیر اپنی گفتگو کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔

قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ۔

ابراہیمؑ نے کہا۔ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا مغرب سے نکال لا۔ یہ سُن کر وہ منکرِ حق ہکا بکا رہ گیا۔

اہلِ بدعت کے اس مغالطہ کی تردید خود اُن آیتوں سے ہوتی ہے، جو اُوپر پیش کی گئی ہیں۔ مشرکین عرب اپنے "بتوں" کو (اور یہ ذہن میں رکھئے کہ صلحاء اولیاء کے ناموں پر ان بتوں کے نام رکھے گئے تھے) "خدا" نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ ان "بتوں" کو اللہ کی بارگاہ میں اپنا "شفیع" اور ذریعۂ تقرب خیال کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس فعل اور عقیدہ کو "شرک" سے تعبیر کیا اور وہ اس لئے کہ وہ تعظیم میں، دفع بلا اور طلبِ رزق و منفعت میں ان "بتوں" کے ساتھ وہ معاملہ کرتے تھے جو اللہ کے ساتھ کرنا چاہیئے۔

کہا جا سکتا ہے کہ لکڑی اور پتھر کی بنی ہوئی مورتیوں میں کسی کو کچھ دینے کسی کی عرض و معروض سُننے اور کسی کی امداد کرنے کی طاقت کہاں سے ؟ بیشک نہیں ہے۔ مگر جب مشرکین عرب ان بتوں کو "الٰہ" نہیں سمجھتے تھے تو پھر ان کے اس فعل کو "نادانی" اور "حماقت" کہنا چاہیئے تھا۔ اہلِ بدعت کے خود تراشیدہ نظریہ کی بناء پر تو کفارِ قریش کے اس فعل کو "شرک" نہیں کہا جا سکتا۔

مگر اللہ تعالیٰ نے اسے "شرک" فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قول ہی حق ہے۔

قرآن کریم کی آیتیں واضح طور پر بتاتی ہیں کہ غیر اللہ کو "الٰہ" نہیں بلکہ مخلوق اور بندہ سمجھتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ تعظیم، پرستش اور دعا و استمداد کا وہ معاملہ کرنا جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا حق ہے "شرک" ہے!

آج بزرگانِ دین کی قبروں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جا رہا ہے جو مشرکین عرب "بتوں" کے ساتھ کرتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "الفوز الکبیر" میں لکھتے ہیں:۔

"اگر تُو مشرکینِ عرب کے عقائد اور اُن کے اعمال اور اُن کے حالات کی پوری پوری تصویر سے واقف ہونا چاہتا ہے تو اِس زمانہ کے عوام و جہلاء کو دیکھ لے کہ وہ قبروں اور استھانوں پر جاتے ہیں اور طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ غرض اس زمانہ کی آفتوں میں سے کوئی آفت نہیں جو اس زمانہ کی ایک قوم اس کا ارتکاب نہیں کرتی اور اُن کے مثل اعتقاد نہیں رکھتی۔ خدا ہم کو ایسے عقیدوں اور عملوں سے بچائے۔ (اُردو ترجمہ)

جس طرح "توحید" ایمان کا جوہر، اسلام کی روح اور اخلاق و عبادات کی جان اور مغز ہے کہ اس کے بغیر ان میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول اور معتبر نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے "شرک" کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ	اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا اس کے سوا جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کیساتھ

اِفْتَرٰى اِثْمًا عَظِيْمًا۔ (النساء) جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرا اُس نے بہت بڑا جھوٹ گھڑا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

+ + + +

ایک طرف "توحید" کی اہمیت قرآن پاک بتلاتا ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی "غیر اللہ" کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ روا رکھنا چاہیے تو وہ "شرک" ہے۔ دوسری طرف "شرک" کی یہ خوفناک مذمت کہ ہر بڑے سے بڑا گناہ معاف ہو سکتا ہے، مگر "شرک" معاف نہیں ہو سکتا۔ یہ ناقابلِ معافی گناہ ہے۔

"توحید" کی اس عظیم الشان اہمیت اور "شرک" کی اس قدر خوفناک مذمت کے بعد ایک صاحبِ ہوش انسان اور ایک مسلمان کا رویہ کیا ہونا چاہیے یہی کہ وہ نہ صرف یہ کہ کھلے ہوئے شرک سے بچے، بلکہ اس کے دواعی، محرکات، تعبیرات اور مشابہت و مثال سے بھی اجتناب کرے۔

"زہر" زندگی کا قاتل ہے، تو ہر وہ انسان جس کو اپنی زندگی عزیز ہوتی ہے ہر اُس چیز سے جس میں زہر کے چھو جانے کا وہم بھی ہوتا ہے اجتناب کرے گا چاہے وہ چیز دیکھنے میں کتنی ہی خوش رنگ اور ذائقہ میں کتنی ہی مزیدار کیوں نہ ہو۔ بالکل اسی طرح جس کو اپنا ایمان عزیز ہوگا اور وہ یہ جانتا ہوگا کہ "شرک" سے ایمان کی موت واقع ہو جاتی ہے تو وہ "شرک" کے وہم و شائبہ سے بھی دُور رہے گا۔ اور "شرک" کے معاملہ میں کسی تاویل، نکتہ، لطیفہ اور لفظی ہیر پھیر کے پاس بھی نہ پھٹکے گا اور نہ اُس کو دلیل بنائے گا۔

وَاَخْرَجَ اَحْمَدُ بْنُ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا

امام احمد نے ذکر کیا کہ معاذ ابن جبل نے روایت کی کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاہے تجھے قتل کیا جائے یا جلایا جائے

وان قُتِلتَ وحُرِّقتَ۔ — تم قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے مگر تو اللہ کیساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا۔

پس جس دل میں "توحید" گھر کر گئی اور رچ گئی ہو گی وہ غیر اللہ کی عقیدت و احترام میں "توحید" کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھے گا اور اس سے کوئی ایسا قول وفعل صادر نہ ہو گا جس سے "توحید" پر ذرہ برابر بھی حرف آتا ہو۔ اور "شرک" سے اتنی سی بھی مشابہت پیدا ہوتی ہو جتنی اُکڑ دپر سفیدی۔

اور یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امّت کو یہی تعلیم دی ہے۔ اسی لئے "غیر اللہ" کی قسم کھانے کو شرک قرار دیا گیا کہ "قسم" میں جس شدّتِ عظمت کا احساس مضمر ہوتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص رہے۔

اخرج الترمذی عن ابن عمرؓ قال سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من حلف بغیر اللہ فقد اشرک۔
(مشکوٰۃ، باب الایمان والنذور)

ترمذی نے ذکر کیا کہ روایت کی ابن عمرؓ نے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ فرماتے تھے کہ جس نے قسم کھائی غیر اللہ کی سو اُس نے شرک کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو "ملک الملاک" (بادشاہوں کا بادشاہ) کہنے سے منع فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور شہنشاہی سے مشابہت کا پہلو نکلتا ہے۔

قربان جائیے اس موحدِ اعظم (علیہ السلام) اور "شرک وبدعت" کے ماحی وقاطع (روحی لہ الفداء) کے کہ جس نے "جو اللہ چاہے اور جو محمدؐ چاہیں" تک کے کہنے سے روکا ہے۔

اخرج فی شرح السنۃ عن حذیفۃ — حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تقولوا ما شاء اللہ وشاء محمد وقولوا ما شاء اللہ وحدہٗ

(مشکوٰۃ - باب الاسامی)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوں نہ بولا کرو "جو چاہے اللہ اور جو چاہے محمد" بلکہ یوں بولا کرو کہ "جو اللہ تعالیٰ تنہا چاہے"

+ + + + +

مشکوٰۃ شریف کی ایک اور حدیث ہے:-

اخرج مسلمٌ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یقولنّ احدکم عبدی و امتی کلکم عبدُ اللہ وکلُّ نساءِکم اِماءُ اللہِ ولا یقلِ العبدُ السیّدہٗ "مولائی" فانّ مولاکم اللہ۔

مسلم نے ذکر کیا کہ ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی یوں نہ بولے کہ "میرا بندہ اور میری بندی" تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری عورتیں سب اللہ کی بندی ہیں۔ اور غلام بھی اپنے آقاؤں کو "میرا مولا" (مالک) نہ کہے۔ کیونکہ تم سب کا "مولا" (مالک) اللہ ہے۔

+ + + +

ایک طرف "توحید" کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شدید احتیاط اور دوسری طرف وہ لوگ جو اپنے "عاشقانِ رسول" ہونے کا دم بھرتے ہیں اُن کی توحید کے معاملہ میں بے پروائی، تساہل اور ڈھیل کا یہ عالم ہے کہ ایسے ایسے نکتے تراشتے اور لطیفے اختراع کرتے ہیں جن سے "توحید خالص" غبار آلود بلکہ مجروح ہوتی ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ کے ترجمہ میں "ی" کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے

فرمایا:-

"تم ہو جاؤ اے میرے بندو ..... (یعنی محمد رسول اللہ کے بندو)

حالانکہ پورا قرآن اہلِ بدعت کی اس "نکتہ شناسی" کی نفی کرتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ۔	کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اسکو کتاب اور علم و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ، تم ربانی بنو۔

+ + + +

جس کے دل میں "توحید" کا مزہ اور اس کی اہمیت کا صحیح احساس ہو گا، کیا وہ اس قسم کے خطرناک نکتے تراش سکتا ہے۔ ایسے لطیفے شعر و شاعری کی دنیا میں تو زیب دیتے ہیں، مگر "قرآن کے ساتھ یہ شاعرانہ سلوک" روا نہیں رکھا جا سکتا۔ (معاذ اللہ)

اسی ذہنیت کے لوگوں نے۔ مشکل کشا، غریب نواز، داتا اور گنج بخش۔ جیسے القاب، جن کے اطلاق کی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہو سکتی ہے۔ صلحاء اور بزرگوں کے لئے تراش لئے ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جو اس قسم کے شعروں پر ؎

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہی لیلونگا محمدؐ سے (توبہ)

جھومتا ہے، اور ؎

اپنا اللہ میاں نے ہند میں نام
رکھ لیا خواجہ غریب نواز (استغفر اللہ)

جیسے مشرکانہ شعروں پر "صدائے احتجاج و نفرت" بلند نہیں کرتا۔

یہی وہ لوگ ہیں جو اس نکتہ پر وجد کرتے ہیں کہ ؎

احد میں اور احمد میں فقط ہے " میم " کا پردہ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو " احمدِ بے میم " اور عرب کو " عرب بے ر " کہتے ہیں۔ اُن کے شعروں میں، تقریروں اور تحریروں میں، جگہ جگہ ایسی چیزیں ملتی ہیں جو " توحیدِ خالص " کو مشتبہ اور ملتبس بناتی ہیں اور " شرک بدعت " کے لئے گنجائش نکالتی ہیں۔

انبیاء کی دعائیں

" وحی " اور " نبوت و رسالت " اتنا بڑا شرف ہے کہ اس شرف کے مقابلہ میں دنیا کے تمام اوصاف مل کر بھی اس شرف کی برابری نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کا تمام اُمت، قوم یا پوری انسانی سوسائٹی میں اپنے ایک " بندے " کو نبوت و رسالت کے لئے منتخب فرمانا اور اُس پر ایسے مخفی طریقہ سے وحی کرنا کہ جس کا " نبی " کے سوا نہ کوئی احساس کر سکتا ہے اور نہ تحمل! اس سے بعض لوگ دھوکا کھا کر " نبی " سے اُلوہی صفات منسوب کر سکتے ہیں کہ " عقیدت و احترام " کے دوراہہ پر شیطان کے لئے غالی معتقدین اور توہم پرست نیازمندوں کو گمراہ کر دینا بہت آسان ہے۔

اس لئے قرآن پاک کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اُس نے انبیاء کے حالات بالکل سادہ الفاظ میں پیش کئے ہیں۔ جس میں سب سے زیادہ زور اُن کی " عبدیت " اور " بشریت " پر دیا گیا ہے۔ خود انبیاء کرام کی زبانی اس کی نفی کرائی گئی ہے کہ وہ کائنات میں کوئی اختیار رکھتے ہیں یا لوگوں کے نفع و نقصان کے مالک ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے کہتے ہیں:-

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ میں تیرے لئے معافی ضرور چاہوں گا اور

لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ۔ مالک نہیں میں تیرے نفع کا اللہ کی یہاں کسی چیز کا!

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان سے اللہ تعالیٰ نے کہلوایا:۔

قُلْ لَا اَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ۔ تو کہہ میں مالک نہیں اپنے واسطے برے کا نہ بھلے کا مگر جو اللہ چاہے۔

یہاں تک کہا گیا۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ تو کہہ میں کچھ نیا رسول نہیں ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ (بھی کیا ہونے والا ہے)

+ + + + +

اور اللہ تعالیٰ نے یہ کہلوا کر۔

قُلْ لَا اَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ ...... تو کہہ میں نہیں کہتا کہ میرے پاس خزانے ہیں اللہ کے اور نہ میں غیب جانتا ہوں

"ذاتی" اور "عطائی" کی جاہلانہ اور گمراہ کن تفریق کے بُت کو بھی پاش پاش کر دیا۔ جب نبیؐ کے پاس بھی اللہ کے دیئے ہوئے خزانے نہیں ہیں تو پھر اور کس کے پاس ہو سکتے ہیں؟

جب نفع و نقصان کا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی مالک نہیں ہے اور انبیاء کرام تک اس معاملہ میں اپنے عجز و عدم اختیار و قدرت کا اظہار کرتے ہیں تو پھر نبی اور رسول سے بڑھ کر ایسا کون "اللہ کا پیارا اور چہیتا" ہے جسے ہم اللہ کے دیئے ہوئے خزانوں کا مالک، انسانوں کے نفع و نقصان کا مختار اور احوالِ کائنات میں متصرف مان لیں۔ اگر کوئی انبیاء، اولیاء اور صلحاءِ اُمت کے بارے میں ایسے عقائد رکھتا ہے تو اللہ کی کتاب کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کرتا ہے اور قیامت

سکے دن انبیاء۔ اور اولیاء سے اُس کی عقیدت، عشق و محبت اور نیاز مندی کے یہ دعوے اُس کے منہ پر مار دیئے جائیں گے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عین تمنا تھی کہ بیت المقدس کے بجائے "کعبہ" کو اُمتِ مسلمہ قبلہ قرار دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اس تمنا اور آرزو کو پورا فرما دیا۔ مگر اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا "قیاس مع الفارق" کی بدترین مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "رضا" کا پابند تھا۔ یا جو آپ کی رضا ہوتی تھی وہ ضرور بالضرور پوری ہو کر رہتی تھی۔ بندے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے پابند ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی "رضا" اور "تمنا" کا پابند نہیں ہے۔

يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ (ج) فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ٥ (التوبہ)

یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو گئے تو اللہ ایسے فاسق لوگوں سے ہرگز راضی نہ ہوگا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ محبوب و مقرب، اطاعت گذار بندے تھے۔ حضورؐ نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیا تھا۔ حضورؐ کا قدم صراطِ مستقیم سے بال برابر اِدھر اُدھر نہیں ہوا۔ آپ کی اکثر و بیشتر دعائیں بھی اللہ تعالیٰ قبول فرما لیتا تھا کہ قبولیت و اجابت تو نطقِ محمدی کی راہ دیکھتی رہتی تھیں۔ اس شرف و اعجاز کے باوجود قرآن یہ بھی بتاتا ہے:۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ۔ (التوبہ)

اے نبی! تم ایسے لوگوں کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو۔ اگر تم ستر مرتبہ بھی اُن کے معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔

+ + + +

یہ آیت "مشرکانہ عقائد" پر ضرب نہیں، شاہ ضرب MASTER STROKE لگاتی ہے۔ یہ آیت کسی ذرا سے بھی اشتباہ کے بغیر دوٹوک انداز میں بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بعض اوقات انبیاء کرام اور ان میں بھی امام الانبیاء اور اور افضل الرسل تک کی درخواست اور دعا قبول نہیں ہوتی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور درخواست تک کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز میں یہ عالم ہو تو پھر دنیا کے پردے پر کون ایسا انسان اور عالمِ برزخ میں کون ایسی روح ہے جس سے ہم استغاثہ کرتے ہوئے یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کا کہا ٹال ہی نہیں سکتا۔ اور یہ جس بات پر اَڑ جائیں بس اُسے پورا ہی کرا کے رہیں گے، جو کوئی اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے وہ درحقیقت عبد اور معبود کے رابطہ اور تعلق سے ناواقف ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت، کبریائی اور بے نیازی کے بارے میں بڑا سطحی اور پست تصور رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔ حضورؐ کی تبلیغ کی بدولت عرب کی پوری آبادی کو ہدایت نصیب ہوئی اور جب سرکارؐ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو عرب کے طول و عرض میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی پرستش نہ ہوتی تھی۔ قیامت تک جس کسی کو بھی رشد و ہدایت ملے گی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اتباع اور فرمانبرداری میں ملے گی، جہاں حضور کی اتباع نہیں۔ وہاں ہدایت کی روشنی نہیں مگر ہدایت کا دینا اور سیدھی راہ پر لانا اور چلانا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضۂ اختیار سے باہر تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ	تُو راہ پر نہیں لاتا جس کو تُو چاہے بلکہ اللہ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ	راہ پر لاتا ہے جس کو وہ چاہے اور وہی

وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ + (اللہ) خوب جانتا ہے کہ کون راہ پر آئینگے۔

اگر انبیاء اور صلحاء کی ارواح سے استغاثہ جائز ہوتا تو قرآنِ پاک میں کوئی ایک آیت تو اس کے جواز میں نازل ہوتی یا کم سے کم کسی قرآنی آیت سے اس کا کوئی اشارہ ہی نکلتا ہوتا۔ انبیاءِ کرام کی دعائیں قرآنِ پاک میں مرقوم اور مسطور ہیں۔ ان میں کسی نبی نے اپنے پچھلے گذرے ہوئے نبی اور رسول کو مصیبت کے وقت نہیں پکارا، نہ اُن سے اللہ کے حضور دعا کرنے کی درخواست کی، انتہا یہ ہے کہ کسی قرآنی دعا میں "بہ حقِ فلاں" یا یہ کہ "یا اللہ! تو فلاں نبی کے وسیلہ سے ہماری دعا قبول فرما" تک نہیں ملتا۔

حضرت نوح علیہ السلام براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں:۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ + (والصافات) +

اور نوح جب اس نے پکارا اس سے پہلے پھر قبول کر لی ہم نے اُسکی دعا سو بچا دیا اُس کو اور اُسکے گھر والوں کو بڑی گھبراہٹ (پریشانی) سے۔

حضرت ایوب علیہ السلام مصیبت میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں:۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

اور ایوب جس وقت پکارا اُس نے اپنے رب کو مجھ پر پڑی ہے تکلیف اور تو ہے سب رحم والوں سے رحم والا۔

حضرت یونس علیہ السلام بھی اپنے رب ہی سے غم کے اندھیروں میں فریاد کرتے ہیں:۔

فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

پھر پکارا ان اندھیروں میں (یونس نے) کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا خطاکاروں میں سے۔

اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تنزیہہ کامل اور ایسی عصمت جہاں سرے سے بھول چوک اور نسیان وذہول کا امکان ہی نہ ہو، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو سزاوار ہے۔ حضرت یونسؑ سے بہ تقاضائے بشریت تھوڑی سی بھول ہو گئی کہ وحی کا انتظار کئے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے، پھر اللہ کے اس فرمانبردار بندے اور مقدس نبی نے اپنے اللہ سے معافی طلب کی۔ حضرت زکریا علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حضور اپنی تمنا پیش کرتے ہیں:۔

وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ۔ (پارہ - ۱۷)	اور زکریا کو (دکھ) جب پکارا اُس نے اپنے رب کو، اے رب! نہ چھوڑ مجھ کو اکیلا اور تُو ہے سب سے بہتر (والی اور) وارث۔

یہ تو چند دعائیں ہیں جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ قرآن میں جہاں بھی کسی نبی کی دعا اور مصیبت کے وقت فریاد واستغاثہ کا ذکر آیا ہے تو ہر نبی نے براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کی ہے اور وہ اس لئے کہ اُن نفوسِ قدسیہ کو اللہ تعالیٰ کا یہ ہی حکم تھا۔ وہ دنیا کو اسی کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی فریادرس اور مشکل کشا ہے اور نہ مصیبت کو ٹال دینا کسی کے بس میں ہے۔

وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ۔ وَإِن يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (ھود)	اگر اللہ تمھیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اُس کے سوا کوئی نہیں جو تمھیں اس نقصان سے بچا سکے اور اگر وہ تمھیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

دعا کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگیں اور اُسی کو پکاریں اور

اس طرح پکاریں کہ اس دعا، پکار، فریاد و استغاثہ میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی شرکت اور میل نہ ہو:۔

فَادْعُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔ — سو پکارو اللہ کو خالص کر کے واسطے بندگی کے، چاہے منکرین برا ہی کیوں نہ مانیں۔

خدا چیلنج دیتا ہے کہ میرے سوا بیکس کی پکار کو بھلا اور کون پہنچ سکتا ہے اور میرے سوا اس کے دکھ درد کو کون دور کر سکتا ہے۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ۔ — بھلا کون پہنچتا ہے بیکس کی پکار کو جب اس کو پکارتا ہے اور دور کر دیتا ہے اس کی مصیبت کو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں گے، اس پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر اس عقیدہ میں کہیں ایسی شدت اور بے اعتدالی نہ پیدا ہو جائے کہ جس سے "توحید" پر حرف آتا ہو۔ اس لئے اللہ تعالٰی نے تنبیہ فرمائی:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ۔ — اے ایمان والو! جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔

اس آیت میں "وَلَا شَفَاعَۃٌ" (اور نہ سفارش چلے گی) میں اس قسم کے "عقیدۂ شفاعت" کی تردید منظور ہے۔ جیسے بادشاہوں کے یہاں امیر، وزیر اور اُن کے مصاحب اور مقربین سفارش کیا کرتے ہیں کہ جو اپنی چرب زبانی سے بادشاہ سلامت کو متاثر کر دیتے ہیں، یا کسی دباؤ کی وجہ سے بادشاہ اُن کی سفارش ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اللہ کے دربار میں اُس کی اجازت اور حکم کے بغیر کسی کو لب کشائی کی جرأت

ہی نہیں ہو سکتی۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ کون ہے جو اُس کی جناب میں اُسکی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔

احادیث میں ملتا ہے کہ جب قیامت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مقام محمود" اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عطا فرمائے گا۔ تو آپؐ سجدے میں گر جائینگے اور اس کے بعد حضورؐ کو شفاعت کی اجازت ہوگی۔

یہ "شفاعت" وزیروں اور امیروں کی "سفارش" شاہانِ بے خبر کے درباروں جیسی نہیں ہے۔ یہ "شفاعت" ایک مطیع و فرمانبردار اور اللہ کی مرضی پر چلنے والے نیک بندے کی، خدائے علیم و خبیر کے حضور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "عالم الغیب" نہیں

ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب اور جتنا علم مناسب سمجھا وحی کے ذریعہ انبیاء کرام کو عطا فرمایا ہے اور یہ وہ علم ہے جسے قرآن اظہارِ غیب" اور "اطلاعِ غیب" کہتا ہے:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے، کہ تمکو غیب پر مطلع کردے غیب کی باتوں کی اطلاع دینے کیلئے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔

یہ علم جو انبیاء کو عطا کیا گیا ہے "اظہارِ غیب" اور "اطلاعِ غیب" ہے۔ مگر اس "اطلاع و اظہار" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز انبیاء کرام کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہتی اور ان کو ہر بات کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اس عقیدہ کی خود قرآن نفی کرتا ہے:۔

فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ کہا میں نے آیا خبر ایک چیز کی کہ جسکی تجھ کو

مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ۔ (النمل) اُسکی خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے خبر لیکر

ہُدہُد حضرت سلیمان علیہ السلام سے یہ کہہ رہا ہے کہ "میں ایسی چیز کی خبر لایا ہوں جس کی آپ کو خبر نہ تھی"۔ اور ملکِ سبا کے حالات کا علم نہ رکھنے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی منزلت میں ذرہ برابر کمی نہیں آجاتی کہ سارے جہان کے حالات کا علم رکھنا نبوت کا لازمہ ہرگز نہیں ہے۔

فَلَمَّا رَآ اَیْدِیَھُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْہِ نَکِرَھُمْ وَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ۔

پھر جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں اُن سے ڈرا۔ وہ بولے مت ڈرو ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں قومِ لوط کی طرف۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان و منزلت کا کوئی ٹھکانا ہے کہ نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام خود "ملّتِ ابراہیمی" پر تھے۔ اُن کا یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے فرشتوں کو نہیں پہچان سکتے اور دل میں خوف محسوس کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ فرشتے بتاتے ہیں کہ آپ خوف نہ کیجئے ہمیں، تو لوط کی بدکار قوم کیطرف اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ صحیحین میں بھی ایک واقعہ ملتا ہے کہ جبریل علیہ السلام آدمی کی شکل میں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال وجواب کرتے رہے اور جب وہ اُٹھ کر چلے گئے تو حضورؐ کو بتایا گیا کہ یہ جبریلؑ تھے۔

اگر حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے نافرمان بیٹے کے انجام کی خبر ہوتی تو آپ اُس کے بچانے کی تمنا نہ کرتے، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ مگر برسوں تک اپنے پیارے اور چہیتے بیٹے یوسفؑ کی خبر نہ معلوم کر سکے کہ اُن کا

نورِ نظر کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ یہاں تک کہ اس غم میں پتلیاں سفید ہو گئیں اور سب سے بڑھ کر خود سیدنا آدم علیہ السلام کا واقعہ اُن کے "غیب" پر مطلع ہونے کی نفی کرتا ہے۔ اگر آپ کو مستقبل کا علم ہوتا اور شیطان کے دل کی بات جان لیتے تو شیطان لعین کے دھوکے میں نہ آتے۔

"غیب" اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے۔ اس میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے کو "عالم الغیب" فرمایا ہے۔ اور کسی تشابہ اور ابہام کے بغیر دو ٹوک انداز میں کہا ہے:۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ۔	کہ نہیں جانتے وہ جو ہیں آسمانوں اور زمین میں غیب کو، مگر اللہ! اور نہیں خبر رکھتے کب اُٹھائے جائیں گے۔

"غیب" کی عمومی نفی کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے خود آپؐ کے عالم الغیب ہونے کی نفی کرائی:۔

قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔	کہہ میں نہیں اختیار رکھتا اپنی جان کے کسی نفع اور نقصان کا، مگر جو کچھ اللہ چاہے اور جو میں جانتا غیب تو بیشک بہت سی لیتا بھلائی اور نہ چھوتی مجھے کوئی برائی، میں تو فقط ڈرانیوالا اور خوشخبری سنانے والا ہوں اُن لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بے شمار واقعات اسکی شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ "عالم الغیب" نہ تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جو تہمت لگائی گئی تھی، تو کتنے دن تک حضورؐ مضطرب رہے! یہاں تک کہ وحی الٰہی نے حضرت صدیقہؓ کی پاکبازی کا اعلان کر کے اس تہمت کا قلع قمع

11200

کر دیا اور وحی کے بعد حضورؐ کے قلب مبارک کو چین آیا۔ حضورؐ عالم الغیب ہوتے تو اس افواہ سے مضطرب ہونے کی ضرورت کیا تھی! اور آپؐ صحابہؓ سے فرما سکتے تھے کہ میں نبی ہوں اور نبی پر تمام مشرق و مغرب کے احوال و مقامات منکشف ہوتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ عائشہ اس تہمت سے پاک اور بری ہیں۔ جو صحابہؓ حضورؐ کی بیان کی ہوئی "وحی" پر ایمان لاتے تھے، وہ آپؐ کے ذاتی علم یا "عطائی غیب" سے بتائی ہوئی حقیقت پر بھی یقین کر لیتے۔

مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر حدیبیہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی افواہ سُنکر آپؐ صحابہ کرامؓ سے بیعت لینا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ حضرت عثمانؓ کی شہادت واقع نہیں ہوئی تھی۔ یہ محض افواہ تھی۔ اگر حضورؐ علم الغیب ہوتے تو افواہ کے سُنتے ہی فرما دیتے کہ یہ خبر غلط ہے۔ عثمانؓ مکہ میں زندہ ہیں۔ صحابہ کرامؓ کی اتنی بڑی جماعت تک کو اصل واقعہ کا کشف نہیں ہوتا اور وہ بھی اصل حقیقت سے بے خبر اور لاعلم رہتے ہیں۔

مشکوٰۃ کے باب "اعلان النکاح" میں ہے کہ ایک شادی میں کچھ چھوکریاں دف بجا رہی تھیں اور شہداءِ بدر کا ذکر کر رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک کہنے لگی۔

وَفِينَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِي غَدٍ	ہم میں ایک نبی ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

حضورؐ نے اس پر تنبیہ کے انداز میں فرمایا۔

"دَعِي هٰذَا وَقُولِي بِالَّذِي كُنْتِ تَقُولِينَ	یہ بات چھوڑ دے اور وہی کہہ جو کہتی تھی۔
(۲) أَخْرَجَ الْبُخَارِي عَنْ أُمِّ الْعَلَاءِ الْأَنْصَارِيَّةِ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا أَدْرِي وَاللّٰهِ	بخاری نے ذکر کیا کہ نقل کی اُمّ العلاء انصاریہ نے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا، پھر قسم ہے

لَا أَدْرِي وَأَنَا رَسُولُ اللّٰهِ — اللہ کی قسم نہیں جانتا حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں
مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ۔ — کہ کیا معاملہ ہوگا میرے ساتھ اور کیا معاملہ ہوگا تمہارے ساتھ

اور قرآن پاک میں تو یہاں تک فرما دیا گیا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ — تمہارے آس پاس کے بادیہ نشینوں میں منافق ہیں
مُنٰفِقُوْنَ ط وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ (تفع) — اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں
مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ (قف) لَا تَعْلَمُهُمْ — انھیں تُو نہیں جانتا۔ ہم جانتے ہیں!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ یہ خطاب فرما کر کہ "ان (منافقین) کو تُو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔" کیا معاذ اللہ رسولؐ کی شان کو گھٹانا چاہتا ہے؟ بات یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کے احوال کا جاننا اور مستقبل کے تمام واقعات کی خبر رکھنا' یہ "نبوت و رسالت" کے فرائض میں داخل ہی نہیں ہے۔ خود قرآن کہتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے واقعات شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ "عالم الغیب" نہ تھے۔ یہ ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جس میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "عالم الغیب" نہ ہے نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہونا چاہیئے۔ یہ شان تو اللہ تعالیٰ کی ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے اور ماضی' حال اور مستقبل کی تمام جزئیات کا اُسے علم ہے اور یہ "زمانوں" کی تقسیم تو ہم حادث و فانی انسانوں کے لئے ہے۔ اللہ کے لئے ہر زمانہ "حال" ہی ہے۔

کیا شان ترے جمال میں ہے — ہر وقت زمانہ حال میں ہے

کوئی شک نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشخاص کے متعلق اور بعض آنے والے حالات کے بارے میں خبریں بھی دی ہیں اور پیشین گوئیاں بھی فرمائی ہیں اور وہ "حق" ثابت ہوئی ہیں۔ قیامت کے آثار و علائم اور مستقبل میں آنے والے

لئے پیش آنے والے بعض فتنوں کی بھی حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم و بصیرت کی بناء پر خبر دی ہے اور یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو علم نہیں دیا گیا۔ مگر خود قرآن اور احادیث آپؐ کے "عالم الغیب" ہونے کی نفی کرتے ہیں اور ایسے واقعات بھی بتلاتے ہیں جن سے "غیب" کے اثبات کے مقابلہ میں "نفی" ثابت ہوتی ہے۔

معجزات و کرامات حق ہیں مگر.....!

انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے بیشک معجزات عطا فرمائے تھے جو انبیاء کے معجزات میں شک کرتا ہے اُس کا ایمان معتبر نہیں۔ فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے معجزہ سے جادوگروں کے سحر کو باطل فرما دیتے ہیں۔ مگر اس سے یہ اصول اور کلیہ وضع کرنا کھلی ہوئی گمراہی ہے کہ دنیا کے پردے پر جہاں کسی پر کوئی جادو کرتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس سے واقف ہو جاتے ہیں اور جو کوئی انھیں مدد کے لئے پکارے تو وہ اللہ کے دیئے ہوئے معجزے سے جادو اُتار دیتے ہیں۔ اس کی نہ قرآن میں کوئی دلیل ملتی ہے، نہ احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے۔ یہانتک کہ توریت و انجیل میں بھی ایسی بات بیان نہیں کی گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے معجزات عطا فرمائے تھے کہ آپ خدا کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیا کرتے تھے اور مُردوں کو جلا دیتے تھے۔

وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

مگر آپ کے واقعہ "رفع" کے بعد سے لے کر آج تک کسی مسلمان نے اپنے مُردے کے جِلائے جانے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے استغاثہ نہیں کیا۔

اور نہ صحابہؓ نے آنکھیں دُکھتے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی دُہائی دی کہ آپ تو مادرزاد اندھوں کو اچھا کر دیا کرتے تھے دُکھتی ہوئی آنکھوں کا اچھا کر دینا آپ کے لئے کیا مشکل ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ جب صحابہؓ کو سفر میں اور جنگوں (سرایا) میں کوئی مصیبت پیش آتی ہو، یا جو صحابۂ کرامؓ باہر کی بستیوں میں رہتے تھے وہ کسی پریشانی میں مبتلا رہتے ہوں تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لئے پکارتے ہوں اور اُن کا یہ عقیدہ رہا ہو کہ ہم جہاں سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکاریں گے آپ ہماری فریاد کو سن لیں گے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر کتنا سخت وقت آکر پڑا تھا، اُن کا مکان روضۂ رسولؐ سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا۔ تاریخ و آثار میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ حضرت عثمانؓ نے ان جان لیوا مشکلات میں حضورؐ کے نام کی دہائی دی ہو، یا وہ صحابۂ کرام جو اس کشمکش سے سخت بیزار تھے انھوں نے ہی قبرِ رسولؐ پر آکر حالات کو بدلنے کے لئے حضورؐ سے استغاثہ کیا ہو۔

کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور اہلِ بیت کرام پر قیامت گذر گئی۔ مگر ان نفوسِ قدسیہ میں سے کسی نے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امداد کے لئے پکارا اور نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دہائی دی۔

جسے ہم معجزہ کہتے ہیں، قرآن کی اصطلاح میں اُسے "آیت" کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خود زندگی اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی "آیت" تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عالمین کے لئے رحمت بناکر بھیجا۔ اور تمام انسانیت کے لئے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو آخری معیار قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ

نے حضورؐ کو معجزات بھی عطا فرمائے۔ اس معجزہ (تکثیر) کا آپ سے بار بار ظہور ہوا کہ تھوڑی چیز آپؐ کی معجز نمائی سے "بہت" ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اسکی کوئی روایت صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں نہیں ملتی کہ صحابہ کو جب رزق، پانی اور دوسری اشیاء کی تنگی ہوتی ہو تو صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا ہو کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے "خیر کثیر" عطا فرمایا ہے۔ آپؐ ہماری قلتِ اشیاء کو کثرت سے بدل دیجئے۔

انبیاء کرام کے معجزات کی یہ نوعیت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے معجزات ظہور میں آتے ہیں اور جب نہیں چاہتا اُن کا صدور نہیں ہو سکتا ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے بارہا پانی میں، دودھ میں کھانے میں اور پھلوں میں غیر معمولی برکت ہو ہو گئی ہے اور دوسری طرف یہ عالم ہے کہ آپؐ کی جگر گوشہ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں فاقے ہو رہے ہیں۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر دل متاثر ہوتا ہے مگر رضائے الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم ہے۔ غزوۂ خیبر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی آنکھوں میں آشوب تھا۔ حضورؐ لعابِ دہن لگاتے ہیں اور دُکھتی آنکھیں آن کی آن میں اچھی ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف یہ شانِ اختیار - - - - - - - - اور دوسری طرف یہ مجبوری اور بے اختیاری کی یہ کیفیت کہ خود آپؐ پر جادو کا اثر ہوتا ہے اور آپ اُسے دُور نہیں فرما سکتے۔

شبِ اسراء میں "سطحِ زمان و مکان" کا یہ عالم کہ ایک رات میں افلاک سدرہ و عرش اور عالم وراء الوراء اور لامکان تک کی سیر کر آئے۔ دوسری طرف بعض غزوات میں یہ کیفیت ہے کہ صحابہ کرام کے پاس پوری سواریاں نہیں ہیں۔ گرمی کی شدت ہے، زمین تپ رہی ہے۔ بعض بعض نے تو اپنے پیروں

پر پتھر پیٹ سے لپیٹ لئے ہیں۔ حضورؐ ان حالات کو دیکھتے ہیں اور دل دکھتا ہے۔ مگر راضی بہ رضا ہیں۔ ورنہ اگر آپ کے اختیار میں ہوتا تو طے ارض کے معجزے کے زور سے اسلامی لشکر کو آن کی آن میں منزلِ مقصود پر پہنچا دیتے اور صحابہ کرامؓ سفر کی صعوبتوں سے بچ جاتے۔

احادیث میں یہ معجزہ بھی ملتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک خفیہ مشورت ہوتی ہے جس کا القاء مدینہ میں بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو جاتا ہے اور دوسری طرف حدیث کی کتابیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ حدیبیہ، مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت واقع نہیں ہوتی۔ صرف افواہ سُن کر آپؐ صحابہ سے بیعت لینا شروع کر دیتے ہیں، اور کئی دن تک اصل حقیقت سے رسول اللہ اور صحابہ باخبر نہیں ہو پاتے۔

حضرت سیدنا یعقوب علیہ السلام ہی کے واقعہ کو لے لیجئے کہ ایک طرف تو آپ پیراہنِ یوسفؑ کی خوشبو بہت دُور سے سونگھ لیتے ہیں اور دوسری طرف یہ عالم ہے کہ برسوں تک حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات سے بے خبر رہتے ہیں اور اس غم میں آپ کی آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں۔

جو لوگ اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اُن کے ہر کہے کو مان لیتا ہے اور وہ قبر و برزخ سے لوگوں کی مشکل کشائی کرتے رہتے ہیں اور مخلوق کے درد و مصیبت کو دُور کرنا اُن کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں ہے، کاش سورۃ یوسفؑ میں تدبّر و تفکر کی اُن کو توفیق نصیب ہوتی ہوتی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام برسوں تک شدید حزن و ملال میں مبتلا رہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی اور مشیت و حکمت اپنے مقرب و برگزیدہ نبی کے اس اضطراب، بے چینی اور غم و اندوہ کی پروا نہیں کرتی۔ یہ حزن و ملال اسی وقت

دُور ہوتا ہے جب اللہ کی مشیّت کو منظور ہوتا ہے۔ جب انبیاء کرام تک رضاءِ الٰہی کے مقابلہ میں اتنے بے اختیار ہوں، تو وہ کون ایسا ولی اور اللہ کا پیارا ہے جو انبیاءِ کرام سے زیادہ اللہ کی بارگاہ میں مقرب اور محبوب ہے اور مشیتِ الٰہی جس کے اشاروں پر چلتی ہے۔ (معاذ اللہ)

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر سینکڑوں میل دُور کے ایک مقام کو منکشف فرما دیا تھا۔ آپ نے "ساریہ! الی الجبل" کا نعرہ مدینے سے بلند کیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ساریہؓ کو حضرت عمرؓ کی یہ آواز سنوا دی۔ یہ کرامت ہے اور حق ہے۔ مگر اس کرامت سے کیا یہ اُصول وضع کیا جانا قرینِ صواب ہے کہ مملکتِ اسلامیہ کا ایک ایک شہر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا اور اسلامی فوجوں کو جب اور جہاں کہیں بھی کوئی خطرہ پیش آتا تھا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ میں بیٹھ کر اُسے دیکھ لیا کرتے تھے اور وہیں سے فوج کے کمانڈروں کو کرامت کے ذریعہ مطلع فرما دیا کرتے تھے اور کیا اس واقعہ کے بعد سے صوبوں کے گورنروں اور حضرت عمر فاروقؓ کے درمیان گفتگو دُور دُور ہی سے کرامت کے ذریعہ ہو جایا کرتی تھی۔ حالانکہ تاریخ بتاتی ہے اور ٹھیک بتاتی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس جنگ کے میدانوں سے خبر آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو آپ انتہائی مضطرب رہتے تھے اور بعض گورنروں کی جب شکایتیں آپ تک پہنچی ہیں تو آپ تحقیق حال کے لئے سینکڑوں میل کے دشوار گذار سفر کی صعوبت برداشت فرما کر صوبہ کے صدر مقام پر پہنچے ہیں۔

ایک طرف تو "بر طارمِ اعلیٰ نشینم" کا یہ عالم کہ سینکڑوں میل کا واقعہ فاروقِ اعظمؓ پر منکشف ہو جاتا ہے اور دوسری طرف ۔ ع

گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

کی یہ کیفیت کہ تو تو خنجر لے کر آپ کے قتل کرنے کے لئے آتا ہے اور آپ کو اس کے ارادے کی آمد کی اور اُس کے خنجر کی خبر نہیں ہو پاتی۔

عبدیت اور بشریت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" اور اُس کے لوازم سے جب بحث کی جاتی ہے تو اہلِ بدعت بہت چراغ پا ہوتے ہیں کہ یہ "وہابی" اس عنوان سے حضورؐ کی شان گھٹاتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل اپنا جیسا بشر سمجھتے ہیں۔

اس بحث کے آغاز سے قبل ایک مثال عرض کی جاتی ہے۔ قارئین کرام اس پر ضرور غور فرمالیں کہ بعض سیدھی اور سچی باتیں بھی بعض اوقات آدمی کو بہت کچھ کھٹکنے لگتی ہیں۔ اس مثال سے اسی قسم کے خدشوں اور وسوسوں کا ازالہ مقصود ہے۔

کسی بادشاہت میں بادشاہ نے اپنے ایک مقرب، ندیم اور پسندیدہ آدمی کو صوبہ کا والی اور حاکم مقرر کر دیا ہے۔ یہ حاکم بادشاہ کا پوری طرح فرمانبردار اور نیازمند ہے کچھ لوگ جو اس حاکم سے غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں۔ یہ کہنے لگتے ہیں کہ اس حاکم کو تو بادشاہ نے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے۔ بس جو کچھ یہ حاکم چاہتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے، خود بادشاہ سلامت اس والی کے رضا جو ہیں۔ حقیقی بادشاہ نے اپنے تمام اختیارات اس حاکم کو عطا کر دیئے ہیں۔ کسی ملکی مسئلہ پر یہ حاکم اڑ بیٹھے اور ضد کرنے لگے تو بادشاہ سلامت کو اس کی ضد پوری کرنی پڑتی ہے۔ یہ حاکم بادشاہ کا در اصل انتہائی محبوب ہے اور محب اور محبوب میں اپنا پرایا نہیں ہوا کرتا جو محبوب کی مرضی ہی محب کی مرضی۔ عشق و محبت میں۔ ع

من تو شدم تو من شدی

کا معاملہ ہوتا ہے۔

ملک کے دوسرے اربابِ فکر اور اہلِ کار جو بادشاہ اور حاکم صوبہ کے فرقِ مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور ملکی سیاست اور بادشاہت کے مسائل کی نزاکتوں سے واقف ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ صوبہ کے حاکم کی شان میں اس طرح کا غلو خود نظامِ سلطنت میں ابتری پیدا کر دے گا اور بادشاہ اور عمّال اس عقیدے کے بعد قریب قریب ایک ہی سطح پر آ جائیں گے تو اس عقیدت کے غلو کے جواب میں اگر وہ یہ کہیں:۔

"بھائیو! ایسا نہ کہو۔ یہ صوبہ کا حاکم تو بادشاہ سلامت کا نوکر اور چاکر ہے۔ بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی تو آخر یہ کھاتا پیتا انسان تھا اُس وقت اس کی یہ حیثیت کہاں تھی؟ بادشاہ کی جوتیوں کے طفیل اس کو یہ عزت اور منصب ملا ہے اور تم جو عقیدت اس حاکم کے بارے میں رکھتے ہو۔ اُس کا علم اگر اس حاکم کو ہو جائے تو وہ اسے کسی عنوان پسند نہ کرے گا۔ بلکہ اپنے عقیدت مندوں پر اُلٹا خفا ہوگا۔ بادشاہ سلامت خود مختار حاکم ہیں۔ ہوشیار اور معاملہ فہم ہیں، وہ اس حاکم کی ہر بات کیوں مان کس طرح سکتے ہیں۔ اُن پر اُنکے کسی ماتحت کا زور چل کیسے سکتا ہے؟ اور اُن کے دربار میں تو یہ حاکم ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ بالکل چاکروں اور غلاموں کی طرح بادشاہ سلامت چاہیں تو اس حاکم کو بھرے دربار سے نکلوا دیں۔ بادشاہ کو سب کچھ اختیار ہے۔ جس کو عزت دی ہے اُس سے چھین

بھی سکتا ہے ـــــ اور ہاں! فلاں فلاں معاملہ میں تو اس حاکم کی درخواست
کو جہاں پناہ نے رد کر دیا۔ آقا پھر آقا ہے۔ نوکر پھر نوکر ہے"
یہ الفاظ اگر سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے دیکھے جائیں یعنی کسی کو ان کا
پس منظر نہ معلوم ہو کہ کس مبالغہ آمیز عقیدت کے جواب میں یہ کہے گئے ہیں تو
بعض پڑھنے اور سننے والوں کے دل میں یہ کھٹک پیدا ہو سکتی ہے کہ "والیٔ صوبہ
اور حاکم علاقہ کی شان میں سوءِ ادب یا کم سے کم خفت کا پہلو اختیار کیا گیا ہے"
مگر جب کسی کے سامنے اس قضیہ کا پس منظر ہوگا کہ بعض لوگوں نے اپنی
کم فہمی کے سبب حاکم صوبہ کو بادشاہ کا مدِ مقابل ٹھہرا دیا تھا اور وہ ایسی ایسی مبالغہ
آمیز باتیں حاکم کی شان میں کہتے تھے۔ اُس کے جواب میں یہ کچھ کہا گیا تو اس عبارت
میں اسے کوئی کھٹک محسوس نہ ہوگی کہ مقصود "حاکم صوبہ" کی خفت اور اہانت نہیں
ہے۔ بلکہ حاکم صوبہ کو بادشاہ سلامت کے مدِ مقابل جو ٹھہرایا جا رہا تھا اُس کی تردید
مقصود ہے۔

شرک و بدعت کے رد میں بعض موحدین کو یہی اندازِ بیان اختیار کرنا پڑا
ہے جس کو اہلِ بدعت "اہانتِ رسولؐ" کے عنوان سے اور اس پر طرح طرح کے
حاشیے چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک
ایک ادا کے فدائی اور جاں نثار تھے اور حضورؐ کی معمولی سے معمولی سنت کو بھی
جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اُن کی پوری زندگی "احیاءِ سنت" ہی کی
جد و جہد میں گذری اور اُن کی یہی تمنا، آرزو اور کوشش رہی کہ مسلمان "سنتِ
رسولؐ" کو اپنی زندگی کا نصب العین "محور" اور غایت و مقصود بنا لیں ـــــ ہاں،
یہ ضرور ہے کہ بعض موحدین علماء سے لفظوں میں بے احتیاطی ضرور ہوگئی ہے۔
بات قرینہ اور خوبصورتی کے ساتھ محتاط انداز میں کہنی چاہئے تھی۔ ان بزرگوں

کی پوری زندگی میں ہم سنّتِ رسولؐ کو جلوہ گر پاتے ہیں۔ اس لئے اُن سے "اہانتِ رسولؐ" جیسا غارت گرِ ایمان جرم منسوب نہیں کر سکتے۔ اُن کے دینی شغف اور دوسرے حالات کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان حضرات کی نیت بخیر تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ مطہرہ پر اسی لئے تو عمل کرتے تھے کہ حضورؐ کی محبت اور عقیدت اُن کے دلوں میں رچی اور بسی ہوئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کا بھی ہمیں اعتراف ہے کہ لفظوں کی بے احتیاطی اور بدسلیقگی کے سبب خود اُن کے مشن کو اس لئے نقصان پہنچا کہ مخالفین نے اس لفظی اونچ نیچ اور اظہار و بیان کی بے اعتدالی کو نمک مرچ لگا کر عوام مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور اُن کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ تختۂ گل پر جو کیچڑ کے چھینٹے پڑ گئے تھے۔ فریقِ مخالف نے اِن کو اتنا نمایاں کیا کہ جیسے یہ پھولوں کا تختہ نہیں ہے۔ بلکہ سارے کا سارا گھورا اور تمام کا تمام مزبلہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ اہلِ بدعت نے مُحمدٌ عبدہٗ ورسولہٗ کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کی براہِ راست زد "توحید" کے عقیدہ پر جا کر پڑتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مالکِ کون و مکان" سے "احمد بے میم" اور "عالم الغیب" سے لے کر:۔ ع

وہ جو کہ مستویِ عرش ہے خدا ہو کر۔ اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

تک کہہ دیا ہے اور اس اپنی عقیدت اور عشقِ رسولؐ پر یہ لوگ ناز بھی فرماتے ہیں۔ حالانکہ وہ "عشقِ رسول" جس سے عقیدۂ توحید مجروح ہوتا ہو نہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک معتبر ہے۔ اس قسم کی "محبت" قدر و ستائش کی جگہ ناپسندیدگی بلکہ عتاب کا باعث ہوگی۔

قرآن پاک ہی نے ہمیں اس کی تعلیم دی ہے۔ اسی بنا پر ہم اللہ کے نبیوں اور رسولوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے اور اُن سب کی عزت و احترام کرتے ہیں اور ہمارے قلوب تمام انبیاءِ کرام کی عقیدت' احترام اور محبّت سے معمور ہیں تمام انبیاء جن میں نبیِ آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی شامل ہیں۔ اس طرح ہیں جیسے ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ہی گھر کے بھائی ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں انبیاءِ کرام کے جو واقعات بیان کئے گئے جن کی چند جھلکیاں اُوپر پیش کی جاچکی ہیں اُن میں اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ ترین بندوں کی "بشر" اور "عبد" کی حیثیت ظاہر کی گئی ہے اور "عبد" بھی کیسے؟ اللہ تعالیٰ کے انتہائی فرمانبردار اور اپنے معبود کے آگے اپنا عجز و نیاز پیش کرنے اور اُس سے ڈرنے والے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاءِ کرام کو شرفِ وحی سے بھی نوازا تھا اور اُن کو معجزات بھی عطا کئے تھے۔ مگر اس تمام اکرام و اعزاز اور تقرب کے باوجود وہ "بشر" اور "بندے" ہی تھے۔

قرآنِ پاک میں جگہ جگہ انبیاءِ کرام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ جن سے اُن کی "اُلوہیت" کی نفی ہوتی ہے اور اُن کی "بشریت" اور "عبدیت" کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور سے واپس آئے ہیں تو آپ نے دیکھا کہ قوم گئوسالہ پرستی کی لعنت میں مبتلا ہے۔ اس پر آپ کو خیال ہوا کہ آپ کے بھائی اور جانشین حضرت ہارون علیہ السلام سے شاید اصلاحِ حال میں کچھ کوتاہی ہوئی۔ اس پر آپ نے غضب میں آکر:۔

وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ	اور ڈال دیں وہ تختیاں اور پکڑا سر اپنے بھائی کا۔ لگا کھینچنے اُس کو اپنی طرف۔ وہ

اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ کَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝

بولا کہ میرے ماں جائے بھائی لوگوں نے مجھ کو کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھ کو مار ڈالیں۔ سو مت ہنسا مجھ پر دشمنوں کو اور نہ ملا مجھکو گنہگاروں میں۔

حضرت ہارون علیہ السلام کے اس جواب پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوتا ہے کہ شدتِ غضب میں جو اپنی ہوائے نفس کے لئے نہیں۔ بلکہ خالص اللہ تعالیٰ ہی کے لئے یہ غضب اور غیرت تھی۔ اُن سے پوری نیک نیتی کے باوجود بے اعتدالی ہوگئی ہے تو آپ نے فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی:-

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ؕ

(موسیٰ) نے کہا۔ اے میرے رب مجھے معاف کر اور میرے بھائی کو۔ اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تو سب سے زیادہ رحم کرنیوالا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عصا اور یدِ بیضا کے معجزات عطا فرمائے تھے۔ ضربِ کلیمی کے اثر سے سمندر پھٹ گیا تھا اور فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی دنیوی زندگی میں حضرت کلیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے کلام فرمایا۔ یہ تمام شرف و مجد اپنی جگہ درست اور بجا۔ مگر وہ بہرحال "عبد" اور "بشر" ہی تھے۔ سارے جہان کے احوال و کوائف آپ پر روشن نہیں تھے۔ اسی بناء پر آپ نے اپنے بھائی ہارونؑ کے بارے میں ایک ایسا خیال قائم کیا تھا جو واقعہ کے مطابق نہ تھا جس کی تفصیل ابھی اُوپر گزر چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی تنزیہی عصمت جس میں ذہول و نسیان کا شائبہ تک نہ ہو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیبا ہے۔

حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو قرآنِ پاک میں بار بار "عبد"

کہا گیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ۔ — سب تعریف اللہ کو جس نے اُتاری اپنے بندہ پر کتاب۔

واقعۂ معراج کا ذکر فرمایا تو اُس میں بھی:۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ۔ — پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو۔

فرمایا گیا یعنی حضورؐ کی "عبدیت" کا اظہار اور اعلان۔

واقعۂ معراج اتنا بڑا اشرف تھا کہ کسی نبی اور رسول کو یہ شرف اور تقرب عطا نہیں فرمایا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا دیکھا۔ آپؐ کو کیا دکھایا گیا قرب کی منزلیں کس طرح طے کیں۔ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایسے عظیم الشان اور محیر العقول واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے "اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" کا اعلان کیا کہ لوگ واقعۂ معراج سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں اور صاحبِ معراج کی "عبدیت" کا عقیدہ ترو تازہ رہے اور کسی مشرکانہ تصور سے یہ عقیدہ دبنے نہ پائے۔ پھر خود آپؐ کی زبانِ وحی ترجمان سے آپؐ کے "بشر" ہونے کا اعلان کرایا گیا:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔ — تُو کہہ میں بھی آدمی ہوں جیسے تم (بجز اس کے کہ مجھ پر وحی کی جاتی ہے)

اِس آیت میں بھی "مِثْلُکُمْ" غور طلب ہے۔ رسول اللہؐ سے صرف یہی نہیں کہلوایا گیا کہ اَنَا بَشَرٌ (میں بشر ہوں) بلکہ "بشریت" کے ساتھ اس کا اظہار ضروری سمجھا گیا کہ مِثْلُکُمْ (تم جیسا بشر ہوں) تاکہ آپ کی "بشریت" میں کسی اُلوہی صفت کے تشابہ کا بھی امکان نہ رہے۔

اس آیت میں ذرا سا بھی ابہام اور تشابہ نہیں۔ یہ ایک محکم آیت ہے۔

جس کے ایک سے زیادہ معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ اب کوئی قرآنی تحریف پر ہی تُل جائے اور "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کو "اِنَّ مَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" (یعنی میں تم جیسا بشر نہیں ہوں) بنادے تو ایسے ظالم، گستاخ اور محرفِ قرآن کو ہم لائقِ خطاب ہی نہیں سمجھتے۔

ہمارا ایمان ہے کہ جہاں تک فضیلت کا تعلق ہے کوئی بشر حضورؐ کی برابری نہیں کرسکتا۔ آپؐ انبیاء کے سردار اور رسولوں کے پیشوا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بعد ہر عزت و عظمت کی سزاوار سرکار ہی کی ذات ہے۔ حضورؐ کے نعلین مبارک سے جو ذرے چھو جائیں خدا کی قسم وہ ذرے ہماری روحوں سے زیادہ لطیف اور مبارک ہیں۔ مگر ان تمام صفات و کمالات کے باوجود آپؐ ہیں "بشر" ہی۔ اُلوہی صفت کے آپؐ حامل نہیں۔ بلکہ بشری صفات کے آپ حامل ہیں اور اس پر قرآن اور احادیث گواہ ہیں۔ جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "بشر" نہیں مانتا یا آپؐ کو "بشر" کہتے ہوئے ہچکچاتا ہے وہ اللہ کے کلام کو جھٹلاتا ہے۔ یا کم سے کم اُسے اشتباہ و تشکیک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یا اُسے اس بات کا زعم اور دعوےٰ ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں رسول اللہؐ کی حقیقت کو وہ زیادہ جانتا ہے۔ (معاذ اللہ)

حضورؐ کی تمام زندگی قرآن کے اس اعلان "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کی شاہد ہے۔ اللہ نے چاہا تو رات کی رات میں لامکاں تک کی سیر کرادی اور جب نہ چاہا تو تاریخ و سیر میں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ حضورؐ جب مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرماتے ہیں تو عبداللہ ابن اریقط جو مسلمان بھی نہ تھا، اُس کی خدمات مدینہ کے سفر میں راستہ بتانے کے لئے حاصل کی جاتی ہیں اور شبِ معراج میں فلک الافلاک کی سیر کرنے والا کئی دن کی مسافت کے بعد قبا پہنچتا ہے اور اس سفر میں ایک غیر مسلم دلیلِ راہ ہوتا ہے۔

اللہ نے چاہا تو یہ بھی ہوا کہ سراقہ بن جعشم نے ہجرت کے وقت راستہ میں حضورؐ کا تعاقب فرمایا اور جب حضورؐ کے قریب پہنچنے کا ارادہ کیا تو گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور سراقہ زمین پر گر پڑا اور ایک بار تو گھوڑے کے پیر بھی زمین میں بری طرح دھنس گئے۔ دوسری طرف یہ واقعہ بھی تاریخ و سیر میں ملتا ہے کہ غزوۂ اُحد میں عبداللہ بن قمیہ کی تلوار حضورؐ کے مغفر پر پڑی تو دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چُبھ گئیں اور چہرۂ مبارک سے خون جاری ہوگیا۔ دونوں واقعات اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو سراقہ کے گھوڑے کو زمین میں دھنسا دیا۔ مگر غزوۂ احد میں ابنِ قمیہ کی تلوار نے آپؐ کو زخمی کر دیا اور اُس تلوار کی زد کو روکنا اللہ کی مشیئت اور حکمت کو منظور نہ تھا۔ حضورؐ یہ تو نہیں چاہتے تھے کہ خود زخمی ہو جائیں اور تیر انداز صحابہؓ کی غفلت کی وجہ سے مسلمانوں کی شکست ہو جائے یہی وہ مقدرات تھے جن کا رد کرنا حضورؐ کے قبضۂ اختیار میں نہ تھا۔ اس لئے کہ آپؐ "عبد" اور "بشر" تھے!!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کافروں کے جادو اور زہر کا بھی اثر ہو جاتا ہے۔ آپؐ کے صاحب زادے حضرت ابراہیم وفات پاتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کے اختیار میں ہوتا تو لختِ جگر کو بھلا مرنے دیتے؟ اور بیٹے کے غم میں یہ اشک باری بشری فطرت کا عین تقاضا تھی "الآن کما کان" تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کہ وہاں کسی تغیر و حادثہ کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ بشر کو اللہ تعالیٰ نے جسم عنایت فرمایا ہے لہٰذا اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی شباب اور اس کے بعد ادھیڑ عمر اور قدرے بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے۔ مسلم (جلد اوّل) کی روایت ہے:۔

"ایک بار حضورؐ نے بیماری کی حالت میں نمازِ عشاء پڑھنے کے لئے مسجد میں جانے کا ارادہ کیا۔ جب چلنے لگے تو غش آگیا۔ جب افاقہ ہوا تو گھر والوں سے دریافت کیا کہ مسجد میں لوگوں نے کیا نماز پڑھ لی؟۔ گھر والوں نے جواب دیا کہ نہیں، آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کئی مرتبہ اسی طرح ہوا"۔ اور وہ اس لئے کہ آپ "بشر" تھے۔

"بشر" اور "عبد" ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اُسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے اور ہم بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور اُسی سے دعا مانگتے ہیں کہ بندوں کی فریاد کو وہی پہنچ سکتا ہے۔ دلوں کے چھپے ہوئے خطروں کو وہی جان سکتا ہے اور دل کی دھڑکن کو وہی سن سکتا ہے، جو حی و قیوم ہے جس کی ذات کو فنا نہیں، جسکو نہ اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند، اور نہ دنیا کے کارخانے کے چلانے سے اُسے تھکن محسوس ہوتی ہے، نہ جس پر بیماری کا کوئی اثر ہوتا ہے، جو لم یلد ولم یولد ہے۔ جس سے کونین کا ایک ذرہ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ ہم شما کا کیا ذکر، انبیاء اور صلحاء بھی اُس کے محکوم، تابع فرمان اور اُس کی رضاء کے چاہنے والے ہیں۔ اور اُس کی مشیت کے آگے دم بخود ہیں۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک مستند واقعہ کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے:۔

"مصعب بن عمیرؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صورت میں مشابہ اور علَم بردار تھے، ابن قمیہ نے اُن کو شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی، بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ بدحواسی میں اگلی صفیں

پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔ حضرت حذیفہؓ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں حضرت حذیفہؓ چلاتے ہی رہے کہ میرے باپ ہیں، لیکن کون سنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہو گئے اور حضرت حذیفہؓ نے ایثار کے لہجہ میں کہا۔ مسلمانو! خدا تم کو بخش دے" (صحیح بخاری غزوۂ احد) بحوالہ سیرۃ النبی جلد اول۔

یہ صحابہ کرامؓ ہیں حضورؐ کے تربیت یافتہ۔ خود حضورؐ موقعۂ واردات پر موجود ہیں۔ مگر صحابہ کی بے خبری اور لاعلمی کے سبب ایک مسلمان کی شہادت واقع ہو جاتی ہے۔ حضور بھی صحابہؓ کرام کو متنبہ نہیں فرماتے کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اگر حضورؐ کو اس کشمکش کا علم ہوتا تو صحابہ کو روکنا اور ٹوکنا آپؐ پر فرض ہو جاتا۔ جب صحابۂ کرام جو انبیاء کے بعد اُمت میں سب سے افضل ہیں۔ اُن کا یہ عالم ہو کہ نظروں کے سامنے کے آدمی کو کشمکش میں نہ پہچان سکیں تو ہم کسی ولی، قطب، غوث اور ابدال کے بارہ میں کیسے یہ "حسن ظن" قائم کر لیں کہ اُس پر ساری دنیا کے احوال و کوائف ہمہ وقت منکشف رہتے ہیں اور اُس کو جہاں سے بھی پکارا جائے وہ پکارنے والے کی پکار سُن لیتا ہے اور اس کی مصیبت کو دُور کر دیتا ہے۔
اس تفصیل کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پڑھئے:۔

اخرج الشیخان عن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ بن مریم فانما انا عبدہٗ فقولوا عبد اللہ ورسولہ۔

مشکوٰۃ کے باب المفاخرہ میں لکھا ہے کہ بخاری و مسلم نے ذکر کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا۔ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسا حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کو نصاریٰ نے بڑھایا، سو میں تو اُس کا بندہ ہوں (میرے بارے میں) یہی کہو کہ "اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ :-

"میرے مرتبہ کو نہ گھٹانا"

اس لئے کہ پچھلی اُمتوں کے احوال آپؐ کے سامنے تھے کہ انھوں نے بعض انبیاء کے مرتبہ کو گھٹایا نہیں تھا۔ بلکہ حد سے زیادہ بڑھا دیا تھا اور ظاہر ہے کہ جو کوئی کسی نبی کا اُمتی اپنے نبی کے رتبہ کو گھٹاتا ہے اُس کا ایمان ہی کب سلامت رہتا ہے۔ خوف 'الحاد اور بے دینی سے نہیں ہے کہ وہ تو ظاہر ہو جاتی ہے۔ محلِ خوف وہ "عقیدت" ہے جو اُس شخص کو جس سے عقیدت ہوتی ہے بڑھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ ایسی عقیدت خوفناک اور پُرخطر اس لئے ہے کہ عقیدت مند اتنا کچھ کرنے کے بعد اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے اور جس کی محبّت اور عقیدت میں کیا ہے اُس کی خوشنودی مجھے حاصل ہوگی۔

نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت آپ کے معجزات اور آپ کے "کلمۃ اللہ" اور "روح اللہ" ہونے سے دھوکا کھا گئے اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کے بندے اور بشر ہونے کی حقیقت کو بھلا بیٹھے۔ یہاں تک کہ اُنھیں ابن اللہ بنا دیا اور یہ شرک کرنے کے بعد بھی وہ "موحد" ہونے کے دعویدار ہیں اور اس حسنِ ظن بلکہ غلط فہمی اور جہالت و حماقت کا شکار ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں "ابن اللہ" کا عقیدہ رکھنا "توحید" کے منافی اور مخالف نہیں ہے۔

ایک اور حدیث ہے جس کے راوی حضرت انسؓ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا :-

اِنّی لَا اُرِیدُ اَن تَرفَعُونِی فَوقَ مَنزِلَتِی الَّتِی اَنزَلَنِیھَا	بے شک میں نہیں چاہتا کہ بڑھاؤ تم مجھ کو زیادہ اس رتبہ سے جو اللہ نے مجھے بخشا ہے۔

اللہ تعالیٰ انا محمد بن عبداللہ میں تو وہی محمد ہوں بیٹا عبداللہ کا۔ اللہ کا
عبدہ ورسولہ۔ (رواہ رزین) بندہ اور اُس کا رسول۔

جس مسلمان کو حضورؐ کے ارشاد اور فرمان و نصیحت کا پاس ہو گا اُس کے قلم، زبان اور کسی دوسرے عمل سے ایسی بات ظاہر ہو ہی نہیں سکتی جو "محمد بن عبداللہ" کو "ارباب من دون اللہ" بنا دے۔

حضور کا یہ فرمانا کہ:-

انی لا ارید ان ترفعونی فوق منزلتی۔۔۔ بے شک میں نہیں چاہتا کہ تم بڑھاؤ مجھ کو زیادہ میرے رتبہ سے۔۔۔

اور یہ ارشاد:-

لا تطرونی مجھ کو میری حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ۔

کتنی نفسیاتی حکمتوں کا حامل ہے۔ اور اس سے شرک آمیز عقیدت کی جڑ کٹتی ہے۔ اُس "عبدِ کامل" کے قربان جائیے کہ جس نے اُمت کو گمراہی اور ضلالت کے فتنوں سے بچانے کے لئے کیسے کیسے خطروں، ذہن و نفس کی چوریوں اور شیطان کے فریب سے خبردار فرما دیا ہے۔

یہ حدیثیں دو حقیقتوں کو سامنے لاتی ہیں:-

۱۔ ایک تو یہ کہ حضورؐ کی مدح و منقبت اور توصیف و نعت اس انداز میں کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے جس سے کسی دوسرے نبی کی منقصت نکلتی ہو۔ کوئی شک نہیں کہ حضورؐ "سید الانبیاء" ہیں۔ مگر اس قسم کے اشعار ؎

آج یوسفؑ بھی اُنکی غلامی میں ہیں تونے دیکھا زلیخا ہمارا نبیؐ

خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کا سبب نہیں ہو سکتے۔ بلکہ بارگاہِ رسالت سے ان کو رد ہی کر دیا جائے گا۔ شاعری میں اس قسم کے شعروں کی اچھی خاصی

تعداد طنی ہے۔

۲ — دوسری حقیقت اور حکمت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات میں سب سے افضل ہیں۔ اس لئے دنیا کے جس بڑے سے بھی بڑے انسان پر آپ کو فضیلت دی جائے گی تو اس "فضیلت" اور انداز نعت و توصیف پر :۔

"لا تطروني" مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ

کے انتباہ اور مخالفت و قدغن کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد تمام مجد و شرف حضورؐ ہی کے لئے سزاوار ہے اور ایسی تعریف جس میں حضور کو تمام مخلوقات سے افضل کہا جائے "حد سے زیادہ بڑھی ہوئی نہیں ہو سکتی" "حد سے زیادہ بڑھی ہوئی" وہی نعت رسولؐ اور توصیف ہو گی جس میں حضورؐ کو حدِ شریعت سے بڑھا کر مرتبۂ الوہیت کے برابر پہنچا دیا جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری صفات اور بشرانہ کمالات میں "الوہیت" کا رنگ پیدا کیا جائے۔

قرآن پاک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے یہ کہلوایا جاتا ہے :۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ (اے نبی!) کہہ کہ میں مالک نہیں ہوں اپنے واسطے بُرے کا نہ بھلے کا' مگر جو اللہ چاہے۔

اب اگر کوئی رسول اللہ علیہ وسلم کی اس انداز میں تعریف کرتا ہے کہ ساری مخلوقات آپ کے در سے پل رہی ہے آپ کائنات کے مالک و مختار ہیں' آپ حاضر و ناظر ہیں' آپ ہر اُمتی کے حال پر نگاہ رکھتے ہیں' آپ پریشان حالوں کی فریاد سُنتے اور اُن کی مشکلوں کو کھولتے ہیں تو وہ آپ کو "حد سے

زیادہ بڑھاتا" ہے اور ایسا کرنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی "عالم الغیب" نہیں ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ پاک نے فرمایا:-

"ہم نے بعض رسولوں کا تم سے ذکر کیا اور بعض رسولوں کا ذکر ہی نہیں کیا"

وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (النساء)

یعنی ہم نے داؤد کو زبور دی، ہم نے اُن رسولوں پر وحی نازل کی جنکا ذکر اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور اُن رسولوں پر بھی جنکا ذکر تم سے نہیں کیا۔ (یعنی تمھیں جنکے احوال کی اطلاع نہیں دی)

+ + + + +

قرآن پاک تو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض رسولوں کے حالات تک کی اطلاع نہیں دی۔ مگر اسکے برخلاف کوئی اگر حضورؐ کو "عالم الغیب" کہے یا یہ کہ "ماکان ومایکون" کا علم آپؐ کو دیا گیا ہے اور کائنات کے احوال کی کوئی اگلی پچھلی بات آپؐ سے چھپی ہوئی نہیں ہے تو یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

"حد سے زیادہ بڑھانا"

جس کی ممانعت آئی ہے۔ تو جو لوگ "عشقِ رسول" کے نام پر حضورؐ سے الوہی صفات منسوب کرتے ہیں اُن کا یہ "عشق" خود اُن کی ذات کے لئے آخرت میں وبال بن جائے گا اور اس قسم کے فاسد عقائد سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برأت اور بیزاری کا اظہار فرمائیں گے۔ یہ "عشق" کی عجیب و غریب قسم ہے کہ "محبوب" کچھ کہتا ہے اور عشاق کچھ اور کہتے ہیں، بلکہ اُس کے کہنے کا اُلٹ کرکے دکھاتے ہیں۔ محبوب کے حکم کی خلاف ورزی کرکے اُس سے دعویٰ محبت

کرنا محبت نہیں نفس کا فریب اور شیطان کا پھونکا ہوا افسوں ہے۔

یہ "عطائی" اور "ذاتی" کی بحث و تفریق، جس کی طرف چند صفحے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے بڑی دھوکے میں ڈالنے والی چیز ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انبیاء، اولیاء اور شہداء کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ کائنات میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔ قبر و برزخ میں ہزاروں میل سے لوگوں کی فریاد سُنکر اُن کی مصیبتوں کو ٹال دیں۔ کون و مکان کا کوئی ذرّہ اُنسے پوشیدہ نہ ہو۔ رزق، اولاد، دولت، جاہ و منصب کے وہ بانٹنے اور عطا کرنے والے ہوں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو "ذاتی خدا" ہے، بہت سے "عطائی خدا" بنا دیئے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی غیرتِ تفرید و توحید اس "شرک" کو کسی عنوان گوارا نہیں کر سکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا۔

"کہ مجھے میری حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ"

"عبدیت" اور "بشریت" کا کتنا واضح اقرار اور کھلا ہوا اعتراف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہی صرف ایسی ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ ہر بڑے سے بڑے انسان اور اللہ تعالیٰ کے مقرب سے مقرب بندے کی ذات و صفات اور کمالات کی ایک حد ہے اور سب سے نمایاں اور روشن حد تو "بشریت" اور "اُلوہیت" کی حد ہے کہ اس کا "ٹوٹنا" نہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حد شکنی سے خوش ہو سکتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر عاشقِ رسولؐ اور سرکارؐ کا قدر شناس اور کون ہو سکتا ہے۔ انھوں نے حضورؐ کی مدح و توصیف میں ایسا مبالغہ نہیں کیا جس سے یہ "حد" ٹوٹی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی اُن پر رحمتیں ہوں کہ انھوں نے انتہائی عقیدت و

محبت کے باوجود اس "حد" کو چھوا تک نہیں۔ بلکہ اس "حد" کی حفاظت کرتے رہے۔

عیسائی، ہندو اور بودھ جتنے مشرکین اور کفار زمین کے پردے پر پائے جاتے ہیں اُن کا فسادِ عقائد اس باب میں مشترک ہے کہ انھوں نے اپنے نبیوں، پیشواؤں اور رشیوں، منیوں کو مبالغہ آمیز عقیدت سے "الٰہ" بنادیا ہے اور انھوں نے "بشریت" اور "اُلوہیت" کی حد کو توڑ دیا ہے وہ ان بڑے لوگوں کو "خدا" نہیں کہتے۔ مگر اُن کی عقیدت نے اُن سے "اُلوہی صفات" منسوب کردی ہیں۔ "کالی مائیں" کو کائنات میں تصرف کرنے کا ذرہ برابر اختیار نہیں ہے۔ مگر ہندو "کالی کی جے" پکارتے ہیں۔ مسلمانوں کا تو بس ایک ہی "نعرہ" اور "جیکارا" SLOGAN ہے اور وہ ہے "اللہ اکبر" مسرت کے وقت، مصیبت کے عالم میں، جنگوں اور معرکوں میں اُنکی زبان سے "اللہ اکبر" بلند ہوتا ہے تاریخ میں، سیر میں، احادیث میں ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی کہ صحابۂ کرام نے "اللہ اکبر" چھوڑ کر یا اُس کے ساتھ ساتھ "یارسول اللہ" کا بھی نعرہ بلند کیا ہو۔ وہ ایسا نعرہ بلند کیسے کرسکتے تھے، جب کہ وہ توحید و رسالت کی حد کو جانتے اور پہچانتے تھے اور اُن کا اس بات پر یقین جازم اور ایمان کامل تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی کی فریاد اور پکار کو نہیں سُن سکتا۔ تکبیر اُسی کے نام کی بلند ہونی چاہیئے۔ جو کائنات میں "سب سے بڑا" (اکبر) ہے؟ اور جو سمیع و بصیر، علیم و خبیر اور علیٰ کلِ شیءٍ قدیر ہے۔

اہلِ بدعت نے "نعرۂ تکبیر" کے توڑ پر "نعرۂ رسالت" اختراع کیا ہے کہ وہ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں "یارسول اللہ" کا نعرہ بلند کرتے ہیں اب

یہ ہے:—

"وہ حد سے بڑھانا"

جس کی حضور نے ممانعت فرمائی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور ارشاد کی مخالفت کرکے کوئی شخص سعادت حاصل نہیں کر سکتا اور ایسی "عقیدت" ان لوگوں کے مُنہ پر ماری جائے گی۔

"نعرۂ رسالت" کے مقابلہ میں "نعرۂ حیدری" (یا علیؓ) حال ہی میں ایجاد کیا گیا ہے۔ ایسا ہونا تعجب خیز نہیں ہے کہ اہلِ بدعت نے "توحید" کے معاملہ میں ہمیشہ ڈھیل اور بے پروائی سے کام لیا ہے اور یہ ذہنیت "مشرکانہ عقیدت اور بدعت واحداث" کے مسئلہ میں، ہر دور میں یکساں رہی ہے۔

عبدیت نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات آپ کے "روح اللہ" ہونے اور آپ کی معجزانہ ولادت سے دھوکا کھا کر حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں اس قدر غلو کیا کہ جناب مسیحؑ کو "ابن اللہ" بنا دیا۔ اُن کی اس گمراہی سے آنے والی انسانی نسل کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں انبیاء کرامؑ کے معجزات کا ذکر فرمایا وہاں انبیاء کے "عبد" اور "بشر" ہونے کا بار بار ذکر کیا اور نبیوں اور رسولوں کی زندگی کے ایسے واقعات پیش کئے جن سے اُن کی عبدیت اور بشریت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی یہ شان تھی کہ اُنگلی کا اشارہ فرمایا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ دستِ مبارک میں کنکریاں کلمہ پڑھنے لگیں۔ درخت کو اشارہ کیا تو وہ چلنے لگا۔ بھوکا پیاسا اُونٹ رحمتِ عالمؐ کو دیکھ کر اس طرح بلبلانے لگا جیسے وہ اپنی بھوک پیاس کی فریاد کر رہا ہے۔ طشت میں ہاتھ ڈال دیا تو انگشتانِ مبارک سے پانی کی دھاریں نکلنے لگیں۔ صاحبِ معراج

رحمۃ اللعٰلمین، سراجِ منیر کائنات میں سب سے افضل و اعلیٰ، دنیا میں بہت بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے۔ لیکن پوری تاریخ انسانی میں "انسانِ کامل" ایک ہی پیدا ہوا۔ جس عمل پر اطاعتِ رسولؐ کی چھاپ نہ ہو وہ عمل اللہ کے یہاں قبول ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام فضائل و مناقب اپنی جگہ مسلّم، مگر ان فضائل و معجزات کو دیکھ کر لوگ دھوکا نہ کھا جائیں اس لئے خود قرآن میں آپؐ کی بشریت اور عبدیت کا بہ تکرار اظہار کیا گیا اور آپؐ کی زبانی کہلوایا گیا کہ:-

"میں کسی بھلائی اور بُرائی پر قدرت نہیں رکھتا۔"

نمازوں میں "محمداً" کے بعد "وعبدہٗ" پڑھا جاتا ہے اور پانچوں وقت ایک مسلمان کے یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے "بندے" ہیں اور بندے اور اللہ میں سب سے زیادہ نمایاں امتیاز "احتیاج" ہے کہ بندہ کسی مقام رفعت و تقرب پر بھی پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ بندگی اور احتیاج لازم و ملزوم ہیں۔ اور جو اللہ تعالیٰ سے خود احتیاج رکھتا ہو، کیا وہ تمام کائنات کے انسانوں کی احتیاج کو پورا کر سکتا ہے۔

معاملہ کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ میں (معاذ اللہ) اُنیس بیس کا فرق ہے اور آپؐ کی ذات اور صفات اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات سے بس کچھ ہی نیچی ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضورؐ کائنات میں سب سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت کے مقابلہ میں یہ آپ کی علوِ مرتبت اور افضلیت کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ پس گفتگو میں تقریر و تحریر اور شاعری میں کوئی اشارۃً و کنایۃً، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفت اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت کے مماثل یا مشابہ ٹھیرتی

ہو۔ یا آپؐ کی صفات میں "اُلوہیت" کا امتزاج اس سے ہو جائے دینی نقطۂ نگاہ سے رد کر دینے کے قابل ہیں اور ایسی باتوں سے نہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے اور نہ رسول کی خوشنودی۔

زیارتِ قبور قرآنِ کریم میں "زیارتِ قبر" کا کوئی حکم، اشارہ اور ایماء تک نہیں ملتا اور نہ کسی نبی اور صالح اُمتی کا کوئی ایسا واقعہ مذکور ہے کہ فلاں نبی نے اپنے سے پہلے نبی کی قبر کی زیارت کے لئے سفر کیا تھا یا نبی کے کسی صحابی نے نبی کے وفات پانے کے بعد اُس کی قبر کی مجاورت کی تھی۔

اگر قبروں کی زیارت دین کی کوئی بہت بڑی اور ناگزیر ضرورت ہوتی تو اس کا ذکر قرآن پاک میں ضرور آتا۔ "زیارتِ قبور" دین کا کوئی ایسا رُکن اور شعار کبھی نہیں رہا کہ جس کے ترک کر دینے سے کوئی دینی قباحت یا اعتقاد کی خرابی لازم آئے۔ ورنہ اس کا کسی نہ کسی عنوان سے قرآن ضرور ذکر کرتا۔

کتاب اللہ کے بعد دین کا ماخذ سُنّتِ رسول اللہؐ ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت منصوص ہے۔ کتاب و سنت ہی کی اساس پر دین کی ساری عمارت قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی "اسوۂ حسنہ" کو دنیا کے لئے نمود اور مثال (MODIL) قرار دیا ہے۔ حقیقت میں جس منزل میں حضور کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں۔ بس وہی صراطِ مستقیم ہے۔

حدیث میں ملتا ہے:۔

کنتُ نھیتکم عن زیارۃ القبور میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے منع کیا تھا

فزوروھا فانھا تزھدُ فی الدنیا وتذکر الاٰخرۃ۔ سواب قبروں کی زیارت کیا کرو کہ یہ چیز دنیا سے بے رغبت کرتی اور آخرت کو یاد دلاتی ہے۔

+ + + + +

شروع شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کی ممانعت فرمادی تھی اور اس ممانعت کا سبب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ عرب بُت پرستی کے عادی تھے۔ وہ کفرو شرک سے نکلکر نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ حضورؐ کو اندیشہ تھا کہ ممکن ہے بعض طبیعتیں "قبروں" کی زیارت میں کسی ایسی بے اعتدالی کا ثبوت دیں جو اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ اور مبغوض ہو۔ ممانعتِ قبور کی مدت کا تعین مشکل ہے کہ کتنے زمانہ تک یہ ممانعت باقی رہی۔ پھر حضورؐ نے زیارتِ قبور کی اجازت دے دی اور اُس کی غرض کسی رمز وکنایہ کے بغیر بالکل واضح اور کھلے ہوئے لفظوں میں بتا بھی دی۔ یہ کہ قبروں پر اس لئے جاؤ کہ وہاں جانے سے (۱) دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو۔ اور (۲) آخرت کی یاد آئے۔

حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ قبروں پر پھول اور چادریں چڑھاؤ اور اہلِ قبور سے اپنے لئے اللہ کے حضورؐ دعا کرنے کے لئے درخواست کرو۔ یا اُنسے نُصرت واعانت چاہو اور وہاں سے فیض حاصل کرو۔ اس قسم کا کوئی حکم، ایماء اور اشارہ تک حضورؐ کے کسی قول اور فعل سے نہیں ملتا۔

ایک طرف حضورؐ نے زیارتِ قبور کی غایت بتادی اور دوسری طرف خود اپنی "قبر" کے بارے میں اُمت کو متنبہ کیا:۔

اخرج النسائی عن ابی ھریرۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے

علیہ وسلم یقول لَا تجعلوا قبری عیدًا وصلّوا علیَّ فانَّ صلوٰتکم تبلغنی حیث کنتم۔

ہوئے سُنا کہ میری قبر کو "عید" مت بناؤ۔ اور درود بھیجو مجھ پر اسلئے کہ تمہارا درود مجھ تک پہنچایا جاتا ہے چاہے تم کہیں بھی ہو۔

"عید" کہتے ہیں میلہ لگانے کو، اور اسے سب لوگ جانتے ہیں کہ میلوں ٹھیلوں میں کیا کیا ہوتا ہے اور میلے کس طرح جمتے اور لگتے ہیں۔

ایک طرف یہ فرمایا کہ "میری قبر کو عید نہ بناؤ" دوسری طرف یہود و نصاریٰ پر لعنت کی گئی کہ ان بدبختوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو "سجدہ گاہ" بنا لیا تھا۔

اخرج الشیخان عن عائشۃ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فی مرضہ الذی لم یقم منہ لعن اللہ الیھود والنصارٰی اتخذوا قبور انبیائھم مساجد۔

بخاری اور مسلم نے بروایت حضرت عائشہؓ نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری میں جس سے اُٹھے نہیں، فرمایا کہ لعنت ہو اللہ کی یہود و نصاریٰ پر کہ انھوں نے پیغمبروں کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے قبل اُمت کو جس فتنہ سے متنبہ فرمایا وہ یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ نے فرطِ عقیدت اور غلوِ احترام کے سبب اپنے نبیوں اور پیغمبروں کی قبروں کو مساجد بنا لیا تھا اور اُن کا یہ فعل قابلِ لعنت ہے۔ مساجد میں لوگ چراغ جلاتے ہیں۔ فرش اور پردوں کا انتظام کرتے ہیں۔ پھر رکوع و سجود کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں۔ یہی باتیں اگر کسی نبی اور ولی کی قبر پر کی جائیں تو ایسا کرنے والوں نے اس قبر کو گویا "مسجد" بنا لیا اور اس فعل کے کرنے والے پر حدیث

میں لعنت آئی ہے۔

ایک اور ارشاد نبوی ہے:۔

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَعَنَ اللّٰہ زائراتِ القبور والمتخذین علیھا المساجد والسُّرج۔ (مشکوٰۃ باب المساجد)	ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لعنت کی اللہ نے اُن عورتوں کو جو زیارت کریں قبروں کی اور ان لوگوں پر لعنت خدا کی جو بنائیں قبروں پر مسجدیں اور روشن کریں (قبروں پر) چراغ۔

اس حدیث میں قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور قبروں پر چراغ جلانے والوں کے لئے "لَعَنَ اللّٰہ" (اللہ نے لعنت کی، یا اللہ کی لعنت ہو) کی خوفناک وعید دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "قبر" کے ساتھ ہر قسم کی مشرکانہ وابستگی اور دلچسپی کی جڑ کاٹ دی ہے۔ فرمایا:۔

اخرج مسلم عن جابر قال نھیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یُجَصَّصَ القبرُ وان یُبنیٰ علیہ وان یُقعد علیہ۔	حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ منع کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے کہ قبر پر گچ کیا جائے اور اُس پر عمارت بنائی جائے اور اُس پر بیٹھا جائے۔

اس حدیث میں قبر کو پختہ بنانے اور اُس پر عمارت قائم کرنے کی صریح لفظوں میں ممانعت فرمائی گئی ہے اور "ان یُقعد علیہ" کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ "قبروں پر چڑھ کر بیٹھنے سے روکا گیا ہے۔" اس لئے کہ قبروں کے اوپر چڑھ کر بیٹھنے کا کبھی رواج نہیں رہا اور یہاں حدیث کا سباق وسیاق بتا رہا ہے کہ "یُقعد علیہ" کا مطلب یہ ہے کہ قبروں پر مُراقب ہو کر اور مجاور بنکر بیٹھنا

ممنوع ہے۔

ایک دوسری حدیث میں قبروں پر گچ کرنے، اُن پر کچھ لکھنے اور اُن پر پاؤں رکھ کر چلنے یعنی روندنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

اخرج الترمذی عن جابرؓ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبور وان یکتب علیھا وان توطأ؟	حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر گچ کرنے سے اور قبروں پر لکھنے سے اور قبروں کو روندنے سے۔

ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ واضح ارشادات ہیں، اور دوسری طرف اہلِ بدعت کا قبروں کے ساتھ سلوک دیکھئے کہ اپنے ایک ایک فعل سے فرمانِ رسولؐ کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

حضورؐ نے اپنی قبر کو "عید" بنانے سے منع فرمایا تھا اور یہاں اہلِ بدعت نے حضورؐ کے غلام جو حضورؐ کی خاکِ پا کے بھی برابر نہیں ہیں اُنکی قبروں کو مسجد، عید اور شمع و چراغ سے شبستاں بنا دیا ہے۔

قبروں پر میلے ہیں، گانا بجانا اور کھیل تماشے ہیں، طواف اور سجدے ہیں، مجاورت اور مراقبے ہیں، مزاروں سے حاجت مندوں کی عرضیاں بندھی ہوئی ہیں۔ وہاں آ آ کر مرادیں مانگی جاتی ہیں، چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ گاگر، پنکھے اور صندل کے جلوس نکلتے ہیں، کوئی قبر پر ماتھا ٹیک کر عرض معروض کر رہا ہے۔ کسی نے بارہ دری کے ستون کو تھام رکھا ہے اور صاحبِ مزار کی دہائی دے رہا ہے۔ کوئی دروازہ کے پاس جہاں دھمال صاحب رقص فرما رہے ہیں ہاتھ باندھے کھڑا ہے اور صاحبِ مزار کے جلال و جبروت کے خوف سے اندر حاضر ہونے کی ہمت نہیں کرتا۔ مجاور مزار کے چراغوں کی زائرین کو راکھ

جتا جتا کر نذرانے وصول کر رہے ہیں۔ عقیدت مندوں کے سروں پر مور کے پنکھوں کو گھمایا، گلے میں کلاوا باندھا' چند الائچی دانے ہاتھ پر دھرے' اور مٹھی گرم کر لی۔ سجادہ نشین صاحب مندروں کے مہنتوں کی طرح چڑھاوے وصول کرتے ہیں اور راوی اُن کے لئے سدا چین ہی چین لکھتا ہے۔

قبور و مزارات کے اس پورے نظام کو کیا اسلام سے کوئی دُور کا بھی واسطہ ہے؟ ان خرافات کے لئے کوئی دلیل، کوئی سند، کوئی ثبوت نقلی، عقلی، روایت سے درایت سے؟ اگر یہ حرکتیں شرک و بدعت نہیں تو پھر شرک و بدعت کسے کہتے ہیں؟

ہر بدعت گمراہی ہے!

صحیح مسلم کی حدیث ہے:۔

خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ

بہترین کلام خدا کی کتاب ہے۔ اور راستوں میں بہترین راستہ محمد کا راستہ ہے اور بدترین باتیں (دین میں) نئی نکلی ہوئی باتیں ہیں اور (دین میں) ہر نئی نکلی ہوئی بات گمراہی ہے۔

+ + + +

اس حدیث میں "ہر بدعت" کو گمراہی کہا گیا ہے۔ اس میں بدعت کی قسمیں نہیں کی گئیں کہ یہ تو (۱) بدعتِ سیئہ ہے اور یہ (۲) بدعتِ حسنہ ہے۔ حضورؐ نے "کل بدعۃ" فرما کر "ہر بدعت" کے "ضلالت" ہونے کی تصدیق فرما دی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں "اہلِ بدعت" کے لئے کتنی خوفناک وعید آئی ہے:۔

اخرج الشیخان عن سھل بن سعد — سہل بن سعد نے روایت کیا کہ رسول اللہ

قالَ قالَ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنّی فرطکم علی الحوض مَن مَرّ علیّ شرِبَ و من شرب لم یظمأ ابداً ..... علیّ اقوام اعرفهم ویعرفوننی ثم یحال بینی و بینهم فاقول اِنّهم منّی فیقال انک لا تدری ما احدثوا بعدک فاقول سُحقاً سُحقاً لمن غیّر بعدی۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں حوضِ کوثر پر تم سب سے پہلے جاؤں گا جو کوئی حوضِ کوثر کی طرف آنکلے گا اور جب (آبِ کوثر) پئے گا تو اُسے پھر کبھی پیاس نہیں لگے گی البتہ میرے پاس آئیں گے کئی فرقے کہ میں اُن کو پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھ کو پہچانتے ہونگے پھر ایک پردہ حائل ہو جائیگا میرے اور اُنکے درمیان، تو میں کہونگا یہ تو میرے ہیں۔ اس پر کہا جائیگا کہ تو نہیں جانتا، انھوں نے کیا کیا نئی نئی باتیں نکالی تھیں تیرے بعد۔ تب میں کہوں گا کہ دُوری ہو، دُوری ہو اُس کیلئے جس نے میرے دین کو متغیر کر دیا۔

"بدعت" دین میں نئی بات نکالنے کو کہتے ہیں۔ ایسی بات جس کا کتاب وسنت تو کجا آثارِ صحابہؓ تک میں اُس کا پتہ نہ ہو۔ جو لوگ "بدعتیں" نکالتے یا اُن پر عمل کرتے ہیں وہ "ترکِ بدعت" سے گھبراتے ہیں اور اُنھیں خوف لگتا ہے کہ فلاں رسم اور طریقہ کو ہم نے چھوڑ دیا تو اس سے نہ صرف یہ کہ ہم بہت بڑی سعادت سے محروم ہو جائیں گے۔ بلکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے مواخذہ بھی ہو گا اور جو کوئی اُن کی طرح بدعتوں میں مبتلا نہیں ہے یا اُن پر نکیر کرتا ہے وہ بدبخت تو ہے ہی۔ مگر ساتھ ہی بدعقیدہ بھی ہے۔

بدعت اور اجتہاد میں زمین آسمان کا فرق ہے، بدعت ضلالت ہے اور "اجتہاد" دین کی ضرورت ہے۔ اس لئے مجتہد کو نیک نیتی اور

دین کی خیرخواہی کے سبب غلطی پر بھی اجر ملتا ہے۔

"لاؤڈ اسپیکر" کے بارے میں علماء کی اکثریت نے اجتہاد کیا کہ نماز اور جمعہ کے خطبہ میں اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس "اجتہاد" سے دین کا کوئی اصول نہیں ٹوٹتا اور نہ کوئی "لاؤڈ اسپیکر" کے عدم استعمال کو دین کی کسی کوتاہی کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس اجتہاد کے مقابلہ میں قبروں پر چادر چڑھانا "بدعت" ہے کہ قبریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں بھی موجود تھیں۔ چادریں بھی اُن کے پاس تھیں۔ اگر یہ کوئی نیک کام یا دینی ضرورت ہوتی تو اس کے بتانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ گریز نہ فرماتے۔ اسی طرح اموات کا تیجا' دسواں اور چالیسواں بھی بدعت ہے کہ کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ اور سیرت اہلِ بیت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

"بدعت" پر یہ جو دلیل لائی جاتی ہے کہ ریڈیو' ٹیلیفون' ریل' ہوائی جہاز' یہ سب بدعتیں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کا وجود نہ تھا۔ اس دلیل میں کوئی وزن نہیں۔ بلکہ یہ دلیل کہنے والے کے سطح ذہن کا اتا پتا دیتی ہے کہ حضرت اس قدر عقلمند (؟) واقع ہوئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ میرے زمانہ کے بعد آلات اسلحہ اور دوسری چیزیں ایجاد ہوں تو اُن کو استعمال نہ کرنا۔ پھر ان "ایجادات" سے دین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ "بدعت" کا ہے کو ہونے لگیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ میں تمام صحابہ کرامؓ ٹھیک وہی لباس نہیں پہنتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے تھے۔ حضورؐ نے زندگی بھر میں شاید ایک بار پاجامہ پہنا ہے' سرکارؐ ہمیشہ تہمد استعمال فرماتے تھے۔ مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پاجامہ پہننے کے عادی تھے۔ سنت سترِ عورت

کا ڈھکنا اور ایسا لباس پہننا ہے۔ جس سے استکبار و غرور نہ ظاہر ہو۔ حضورؐ نے کسی خاص لباس کی قید نہیں لگائی۔

حجاج بن یوسف ثقفی نے جو مصحف مقدس (قرآن کریم) پر اعراب لگائے تھے تو اُسے جو کوئی "بدعت" کہتا ہے وہ نہایت درجہ پلید الذہن ہے۔ اور اگر وہ "بدعات" کے جواز کے لئے جان کر ایسی نکتہ آفرینی کرتا ہے تو وہ اس طرح دین میں بہت بڑے فتنہ کا دروازہ کھولتا ہے اور جس چیز (بدعت) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" کہا ہے۔ اُس کو سندِ جواز دینے کے لئے وہ تاویلیں کرتا اور حیلے تراشتا ہے۔ اس ذہنیت اور فکر و مزاج سے اللہ کی پناہ۔

حجاج بن یوسف کے زمانہ میں قرآن پاک لکھا لکھایا موجود تھا۔ اُسکی تلاوت کرنے والے تجوید کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے تو حجاج نے بس یہ کیا کہ جو "اعراب" زبان سے ادا ہوتے تھے اور اُن کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی تھی انھیں قرطاس پر منتقل کر دیا اور یہ اُس نے زیادہ تر عجمی مسلمانوں کی سہولت کے لئے کیا تاکہ تلاوتِ قرآن میں اُنھیں زحمت پیش نہ آئے اور وہ غلطیاں کرنے سے بچ جائیں۔ یہ دین میں ایک سہولت تھی۔

نماز کے لئے وقت کا پہچاننا ضروری ہے۔ اس سہولت کیلئے گھڑیوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ نماز کے لئے وقت کے پہچاننے کا حکم کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ اس حکم کی تعمیل میں ایک ایجاد سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اور یہ نہ بدعت ہے نہ احداث فی الدین ہے۔ اس فعل سے دین و شریعت میں ذرہ برابر کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔

تراویح کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول "نعمۃ البدعۃ" کو ایک کلیہ بنا کر بدعت کے حسنہ ہونے کا جو ایک نکتہ پیدا کیا گیا ہے

خود یہ نکتہ آفرینی" بدعت" کی بدترین مثال ہے۔ تراویح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پڑھی جاتی تھی اور جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی۔ مگر حضورؐ نے باجماعت تراویح پر مداومت نہیں فرمائی۔ یہ پورا سلسلہ مسنون تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس طریقہ مسنونہ کو ہمیشہ کے لئے جاری کر دیا۔ یہ لغوی معنیٰ میں "نعمۃ البدعۃ" ہے۔ شرعی اصطلاح والی وہ "بدعت" نہیں ہے۔ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" فرمایا ہے۔

قبروں پر عرس کرنا اور میلہ لگانا "نعمۃ البدعۃ" اس لئے نہیں ہے کہ کتاب وسنت بلکہ آثارِ صحابہ تک سے اس کے لئے کوئی سند نہیں ملتی۔ بلکہ حضورؐ نے اپنی قبر کو "عید" بنانے سے منع فرمایا ہے۔ لہذا قبروں پر عرس، عید و جشن اور نذر ونیاز کا یہ پورے کا پورا نظام" بدعت" ہے کہ اس کے لئے سنن وآثار میں کوئی دلیل نہیں، بلکہ ایسی باتوں کی ممانعت ہی ملتی ہے۔

"نعمۃ البدعۃ" کے لغوی معنی کو ایک کلیہ قرار دے کر دین میں ہر اضافہ، زیادتی اور احداث کو جائز اور "حسنہ" قرار دینا حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے متبعِ سنت جلیل القدر صحابی پر کتنی بڑی تہمت ہے جو لگائی جارہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں متعدد صحابہ وفات پاتے ہیں مگر کسی وفات پائے ہوئے صحابی کا نہ تیجا ہوتا ہے نہ دسواں اور چالیسواں اور نہ اُن کی قبروں پر عرس کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اس قسم کی کسی رسم کا حدیث وسیرت کی کتابوں میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ دین وشریعت میں یہ سب بعد کے لوگوں کے اضافے ہیں۔ زیادتیاں ہیں۔ خرافات وبدعات ہیں۔ قبروں پر عرس اور نذر ونیاز کی بعض صورتوں اور ہیئتوں میں "شرک" کی بقدر وافر آمیزش پائی جاتی ہے۔ جن کو برا سمجھنا اور اُن کو

دُور رہنا تو ایمان و توحید اور اتباعِ سنّت کا تقاضا ہے ہی۔ مگر قوت حاصل ہو تو اُنھیں روک دینا بھی چاہیئے۔

"بدعات" پر ہر زمانہ میں نکیر کی گئی ہے۔ متقدمین کی کتابوں میں تو اہلِ بدعت سے میل جول رکھنے تک کو ناپسند کیا گیا ہے اور وہ اس لئے کہ اُنکی صحبت میں رہ کر "بدعات" کو دیکھتے دیکھتے اُن کی "نفرت" دل سے یا تو جاتی رہتی ہے یا کم ہو جاتی ہے۔ ایمان و اسلام کا تقاضا ہے کہ بدعت و شرک اور منکرات کو دیکھ کر دل میں جھنجلاہٹ اور نفرت پیدا ہو، اس احساسِ غیرت کا باقی، زندہ اور فعال رہنا ضروری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو "اہلِ بدعت" کی تعظیم و توقیر کی ان لفظوں میں ممانعت فرمائی ہے:۔

من وقر صاحب بدعة فقد أعان على هدم الاسلام۔	جس شخص نے کسی صاحبِ بدعت (بدعتی) کی تعظیم و توقیر کی وہ در اصل اسلام کی عمارت ڈھانے میں مددگار رہا۔

+ + + + +

بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک حال پر قائم نہیں رہتی۔ اس میں اضافے ہی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پچھلی اُمتوں نے شرک و بدعات اور احداث فی الدین کے ذریعہ دین کو مسخ کر دیا تھا۔ "بدعت" کوئی ایسی ہلکی اور معمولی بُرائی نہیں ہے، جسے نظرانداز کر دیا جائے۔ یہ تو اپنی فطرت اور مزاج سے "ضلالت" ہی "ضلالت" واقع ہے۔

دین میں "نئی بات" (بدعت) نکالنا کوئی معمولی بُرائی اور ہلکی خرابی نہیں ہے۔ "بدعت" اس بات کی دلیل ہے کہ خاکم بدہن گستاخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا تو اس بات کے بتانے سے بُخل کیا یا آپ نے خیانت

فرمائی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے "بدعت" پر انہی لفظوں میں نکیر کی ہے
ایصالِ ثواب جائز ہے۔ کسی شخص نے کسی بزرگ کے یومِ وفات پر اُن کے نام سے فقراء اور حاجت مندوں کو کچھ دے دیا اور اُس دن اُن کی قبر پر بھی ہو آیا اور فرطِ محبت سے قبر پر سے پتے اور کنکریاں وغیرہ صاف کر کے ایک کپڑا اڑھا دیا چلو چھٹی ہوئی۔ مگر چھٹی کیسے ہو سکتی ہے اور معاملہ اسی نوبت پر جا کر ختم کیسے ہو سکتا ہے کہ "بدعت" کا معمولی شائبہ بھی بنار فاسد علی الفاسد کے اصول پر:۔

تا ثریا می رود دیوار کج

بن کر رہتا ہے۔ بعد کے آنے والوں نے اُن بزرگ کے "یوم وفات" کو ضروری قرار دے لیا۔ قبر پر نہ صرف یہ کہ چادریں چڑھنے لگیں، بلکہ اُن کے جلوس نکلنے لگے۔ پھر اس قبر کے کچھ لوگ متولی، سجادہ نشین اور خدام و مجاور مقرر ہوئے اور معاملہ مزار کے چراغاں اور قبر کے "غسل مبارک" (؟) سے لے کر ناچ رنگ، سجدہ و طواف اور استمداد و استغاثہ تک پہنچ گیا۔

صحابۂ کرامؓ ان معاملات میں اس قدر احتیاط برتتے تھے کہ ایک شخص نے اپنے کسی عزیز بچہ کی ختنہ پر کچھ لوگوں کو بلایا اس پر صحابہؓ نے اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں "ختنہ" کے لئے نہ کوئی اعلان ہوتا تھا اور نہ لوگوں کو اکٹھا کیا جاتا تھا۔

نفل نماز پڑھنا ایک ثواب کا کام ہے، مگر چونکہ نمازِ عید سے پہلے نفل پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول نہیں رہا اسلئے ایک شخص کو نمازِ عید سے قبل دوگانہ پڑھتے دیکھ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اُسے ٹوکا۔ اُس شخص نے جواب دیا کہ نماز کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔

جس کی وجہ سے مجھ پر عذاب ہوگا۔ حضرت علیؓ نے اس پر فرمایا :-

اِنّ اللہ لا یثیبُ علیٰ فعلٍ حتیٰ یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او یحثّ علیہ فتکون صلواتک عبثاً والعبثُ حرامٌ فلعلہ تعالیٰ یعذبک بمخالفتک لنبیہ۔

جب تک کسی کام کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا فعل سے نہ ملے اللہ تعالیٰ اُس پر ثواب نہیں دیتا۔ تیری نماز (اس لئے) ایک بے معنی اور عبث کام ہوگا اور عبث کام کا کرنا حرام ہے کیا عجب ہے کہ پروردگار عالم اپنے نبیؐ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے اس نماز کے سبب تجھے عذاب دے۔

+ + + +

+ + + +

"بدعت" پرستی یوں عیار اس لئے آئی ہے کہ "بدعت" سے ایسا اُبھرتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ سے کچھ ایسی باتیں بیان کرنے سے رہ گئیں جن کے کرنے سے آخرت میں بڑا ثواب حاصل ہوگا اور روحانیت میں ترقی ہوگی۔ یہ احساس کس قدر گمراہ کن ہے! —— توبہ!

ابو بکر شیبہ نے اپنی کتاب "مصنف" میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے کہ ایک شخص مدینہ منورہ میں روضۂ رسولؐ کے قریب کھڑا ہوا کچھ عرض معروض کر رہا تھا۔ حضرت امام زین العابدین ابن حسین رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے اُسے منع فرمایا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

لا تتخذوا قبری وثناً — میری قبر کو بت نہ بنانا۔

جُہلا کے قول و عمل کا کوئی وزن اور اعتبار نہیں۔ اہل حق نے "بدعات" پر ہمیشہ نکیر کی اور سختی کے ساتھ ٹوکا ہے۔ قرآن کی تلاوت

کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے۔ قبر کے پاس قرآن کی تلاوت کی جائے تو اس میں بظاہر کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ مگر اس میں بھی :-

اختلف الفقهاء فی حکم قراءة القرآن عند القبر فذهب الی استحبابها الشافعی ومحمد بن الحسن للتحصل للمیت برکة المجاورة ووافقهما عیاض والقرآنی من المالکیه ویریٰ احمد انهٗ لا بأس بها وکرهها مالك وابو حنیفة لانها لم ترد بها السنة۔

فقہانے قبر کے پاس تلاوت قرآن کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ شافعی اور محمد بن الحسن اس کے استحباب کے قائل ہیں تاکہ میت کو مجاورتِ تلاوت کی برکت حاصل ہو اور (قاضی) عیاض اور قرآنی نے جو مالکیہ میں سے ہیں، ان دونوں کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور امام احمد کا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے اسے مکروہ سمجھا ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق کوئی سنّت موجود نہیں ہے۔

"تلاوتِ قرآن" جیسے بے ضرر، بلکہ باعثِ ثواب فعل کے بارے میں امام مالک اور امام ابو حنیفہ کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ قبروں کے پاس تلاوتِ قرآن کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ سنت میں اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ جن لوگوں کے سامنے اُن کے اکابر اور سلف صالحین کے یہ امثال ونظائر اور طریقِ فکر ہو، وہ "بدعات" میں مبتلا ہو جائیں تو اس سے زیادہ بے دانشی اور بد توفیقی اور کیا ہو سکتی ہے؟

"گیارھویں شریف" جسے شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے اور "چھٹی شریف" جسے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور ایسی دوسری رسموں، تقریبوں اور تیوہاروں

پر جو علماءِ اہلِ حق، حامیانِ سُنّت اور ماحیانِ بدعت کی طرف سے نقد و احتساب نکیر اور گرفت کی جاتی ہے تو اس سے ان بزرگوں کا رتبہ ذرا بھی نہیں گھٹتا۔ بلکہ اُن کا موقف اور واضح ہو جاتا ہے کہ اُن سے جن "بدعات" کی نسبت کی گئی ہے اُن کے کرنے کی نہ اُنھوں نے تلقین کی اور نہ ایسی خلاف شرع باتوں کو وہ پسند فرماتے تھے۔

اگر بزرگانِ دین کے ولادت ووفات کے "یوم" منانے کو اسلام میں پسندیدہ سمجھا جاتا تو انبیاءِ سابقین ایک دوسرے کا یومِ ولادت ووفات ضرور مناتے۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کوئی قول اور عمل ضرور ملتا کہ آپؐ نے اپنی ازواجِ مطہرات حضرت خدیجہؓ، حضرت زینبؓ بنت خزیمہؓ، اپنے عمِ محترم حضرت سیدالشہدا حمزہؓ اپنے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیار اور اپنی صاحب زادیوں (زینبؓ رقیہؓ، امّ کلثوم) میں سے کسی کا یومِ ولادت ووفات منایا، یا منانے کی ہدایت فرمائی۔

خود حضور رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یومِ ولادت ووفات آپؐ کے بعد صحابۂ کرام اور اہلِ بیت اطہار نے نہیں منایا۔ خیر القرون میں ان رسموں اور تقریبوں کا رواج ہی نہ تھا۔ یہ "مولود" جو مسلمانوں میں مروّج ہے اس کا بانی مبانی سلطان ملک شاہ سلجوقی ہے، جس نے بغداد میں ۴۸۵ھ ہجری میں پہلی مرتبہ محفلِ "مولود" منعقد کی تو یہ مروجہ "مولود" نہ سُنتِ رسول ہے نہ اُسوۂ صحابہ اور نہ طریقِ سلفِ صالحین ہے۔ بلکہ یہ "سنتِ ملوک" ہے تو جس کو رسولؐ کی سنتِ مطہرہ اور صحابہ کا اسوہ پسند ہوگا، وہ اُس کی پیروی کرے گا اور جس کو بادشاہوں

کی "سنت" محبوب ہوگی وہ اس کے احیاء و بقاء کو باعثِ سعادت سمجھے گا۔

پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی

یہاں گفتگو "مروجہ میلاد" سے ہے۔ جہاں تک حضورؐ کی سیرت کے تذکرہ و بیان اور اس کی نشر و اشاعت کا تعلق ہے اُس کو زیادہ سے زیادہ عام ہونا چاہیئے۔ "سیرت النبیؐ" کے جلسوں کا انعقاد ہونا ضروری ہے کہ ان سے ایمان تازہ اور اتباعِ رسولؐ کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ پوری انسانی تاریخ اور کائنات میں "محمد" بس ایک ہی پیدا ہوا جس کی تعریف زمین و آسمان میں ہوتی ہے۔ کروڑوں آدمی اُسؐ کا نام نمازوں میں لیتے ہیں، اذان و تکبیر میں اس انسانِ کامل کا نام بلند ہوتا ہے اور پونے چودہ سو سال کی مدت میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا کہ دنیا "ذکرِ محمدیؐ" سے خالی رہی ہو۔ اس لئے کہ خود اللہ نے آپؐ کے ذکر کو بلند فرمایا ہے:۔

"وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ"

اور جس کے ذکر کو اللہ تعالیٰ بلند فرمائے کس کی مجال اور طاقت ہے جو اُس کے ذکر کو پست کر دے۔

گفتگو اس میں ہے کہ "ذکرِ رسولؐ" کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا مناسب نہیں ہے جس سے بے اعتدالیوں کے لئے راہیں نکلتی ہوں اور ایسی باتوں کو ضروری ٹھیرا لیا گیا ہو جن کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے۔ مثلاً محفلِ میلاد شریف میں "قیام" ایک ناروا جدت ہے، جس کا کوئی ثبوت کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ یا ائمہ فقہاء کے قول و فعل سے نہیں ملتا۔ بلکہ حدیث میں کھڑے ہو کر تعظیم دینے کو عجمی لوگوں کے ناپسندیدہ طریقہ سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

اخرج ابوداؤد عن ابی امامہ ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متکئاً علی عصا؟ فقمنا لہ، فقال لا تقوموا کما یقوم الاعاجم بعضہم بعضاً؟

علیہ وسلم ایک لکڑی پر ٹیک لگائے ہوئے باہر تشریف لائے۔ آپکی تعظیم کیلئے ہم کھڑے ہوگئے" (اس پر) آپنے فرمایا کہ نہ کھڑے ہوا کرو جیسے کھڑے ہو جاتے ہیں عجمی لوگ ایک دوسرے کو تعظیم دینے کے لئے۔

+ + + +

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں اپنی تعظیم کے لئے صحابہ کرام کا کھڑا ہونا پسند نہیں تھا تو حضورؐ کو یہ بات کس طرح پسند ہو سکتی ہے اور آپؐ کی خوشنودی کا سبب بن سکتی ہے کہ آپؐ کی ولادت کا جب محفلوں میں ذکر آئے تو معین تعظیم کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ محفل میلاد میں "قیام" کی رسم عجمیوں سے لی گئی ہے اور یہ عجیب منطق اور طریق استدلال و تفکر ہے کہ جو لوگ اس "عجمی بدعت" کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ناپسندیدہ تھی، برکت و ثواب کا سبب اور موجب رحمت سمجھتے ہیں، وہ تو کہلائیں "عاشقان رسول" اور جو خدا کے نیک بندے اور حضورؐ کی سنت کے متبع [illegible] عجمی بدعت سے گریز کریں وہ کہلائیں "بے ادب اور رسولؐ کی شان گھٹانے والے"۔ یہ [illegible] بڑی ناانصافی، ظلم اور غلط اندیشی ہے۔

قرآن پاک میں "میلاد آدم" کا ذکر آیا ہے۔ اگر ذکر ولادت پر قیام کرنا برکت و ثواب کا باعث ہوتا تو جن آیتوں میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق و پیدائش کا ذکر ہے ان کو تلاوت کرتے ہوئے حضورؐ کھڑے ہوتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معجزانہ ولادت کا ذکر قرآن میں سب سے زیادہ تفصیل سے آیا ہے۔ اگر انبیاء کرام کے ذکر ولادت

کے وقت "قیام" کرنے میں کوئی بھلائی ہوتی تو قرآن کی ان آیتوں کی تلاوت کے وقت جن میں مسیح علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو جاتے۔

صحابۂ کرامؓ سے زیادہ عاشقِ رسولؐ اور حضورؐ کا فدائی اور جاں نثار اور کون ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کبھی نہیں کیا کہ "ذکرِ ولادتِ رسول" کے وقت تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے ہوں۔ تابعین تبع تابعین اور ائمہ فقہ میں کسی نے "قیام" نہیں فرمایا۔

محفلِ میلاد کا "قیام" وہ بدعت ہے جو یہ بتاتی ہے کہ معاذاللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی ایک بھلائی بتلانے سے رہ گئی۔ اور صحابۂ کرامؓ بھی اس نیکی پر مطلع نہ ہو سکے اور تابعین اور ائمہ فقہ پر بھی "تعظیمِ رسولؐ" کے یہ اسرار نہ کھل سکے۔ صدیوں کے بعد جا کر یہ "نیکی اور سعادت" کچھ لوگوں پر ظاہر ہوئی اور اُسے تعظیم رسولؐ اور عشقِ نبیؐ کی نشانی اور علامت ٹھیرا دیا گیا —— ہائے "عشقِ رسولؐ" کی یہ مظلومیت!

عشق ومحبت کا صحیح تقاضا

عشق کا تقاضا کیا ہوتا ہے؟ یہی اور صرف یہی کہ عاشق اپنی مرضی اور خواہشوں کو محبوب کی رضا میں گم کر دے "عشق" محبوب کی قدم بہ قدم اور حرف بہ حرف اطاعت کا نام ہے جو بات محبوب کو پسند ہو وہی محب کو پسند ہو۔ ع

عاشقی چیست؟ بگو بندۂ فرماں بودن!

اگر کوئی شخص "عشق" کا تو مدعی ہو، مگر محبوب کے احکام کی پروا نہ کرے، اور اپنے دل اور خواہش سے ایسی باتیں نکالے جو محبوب کو پسند نہ ہوں تو ایسا "عشق" کیا معتبر کہا جا سکتا ہے؟ عشق نافرمان اور سرکش ہو ہی نہیں سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم سے اعلان فرمائیں:۔

....لَا اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا ... کہ میں اپنی جان کے بھی نفع نقصان

وَّلَا ضَرًّا.... کا اختیار نہیں رکھتا۔

اس کے مقابلہ میں "عاشقانِ رسولؐ" (؟) اپنے قول و عمل سے اس کا ثبوت دیں کہ حضورؐ! آپؐ فرماتے ہیں "کہ میں اپنی جان کے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔" مگر ہم تو آپؐ کو تمام کائنات کے نفع و نقصان کا مختار سمجھتے ہیں۔ آپؐ ہی کے در سے ساری دنیا کو رزق، اولاد، صحت اور مال و متاع تقسیم ہوتا ہے۔ آپ مالکِ کون و مکاں اور دونوں جہاں کے مختار اور رکھوالے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں:۔

واللہ لا ادری واللہ لا ادری وانا رسول اللہ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (مشکوٰۃ، باب البکاء والخوف)

قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا، قسم ہے اللہ کی میں نہیں جانتا، حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں کہ کیا معاملہ ہوگا میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ۔

مگر ہم "عاشقانِ رسول" تو آپؐ کے اس ارشاد کے توڑ پر آپ کو "عالم الغیب" کہتے اور سمجھتے ہیں اور آپؐ کی ذات کے لئے "علم غیب" ثابت کرنا ہمارا سب سے زیادہ دل پسند موضوع ہے۔

آپؐ نے فرمایا:۔

"تم میں کوئی یوں نہ بولے کہ میرا بندہ (عبدی) یا میری بندی (امتی) تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری عورتیں بھی سب اللہ کی بندی ہیں۔" (مشکوٰۃ۔ باب الاسامی)۔

مگر ہم "عاشقانِ رسولؐ" نے آپ کے اس حکم کی "تعمیل" (؟) اس مخالفت کے ذریعہ کی ہے کہ اپنے نام "عبد المصطفٰے" اور "عبد الرسولؐ" رکھ لیتے ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا کہ "میری قبر کو عید" (میلہ) نہ بنانا' دشمن (بُت) نہ بنانا۔"

حضورؐ نے "قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے۔"

مگر ہم "عاشقانِ رسولؐ" ایک ایک پیر' فقیر اور ولی کی قبر سے سارے وہ سلوک کرتے ہیں' جس سے آپؐ کے ایک ایک قول کی نفی ہوتی ہے۔ قبروں پر میلے ہم لگاتے ہیں' چراغاں ہم کرتے ہیں' کھانے کی دیگیں پکا پکا کر ہم لٹاتے ہیں' چادریں ہم چڑھاتے ہیں' مُرادیں ہم مانگتے ہیں' مزاروں کا طواف ہم کرتے ہیں۔ صاحب قبر کے نام کی دُہائی ہم دیتے ہیں' قبریں ہماری تجارت اور آمدنی کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ یہ قبریں ہمارے مشائخ کی جائیدادیں اور دفینے ہیں ــــ اور:۔

"حضورؐ نے قبروں کو "گچ" کرنے (پختہ بنانے) سے منع فرمایا۔"

اور ہم آپؐ کے عاشقوں (؟) اور جاں نثاروں (؟) نے چونہ اور اینٹوں پر ہی بس نہیں کیا' بلکہ سنگِ مرمر اور سنگِ رخام تک قبروں پر لگا دیا ہے اور کسی کسی قبر پر تو چاندی اور سونے کے پتر منڈھ دیتے ہیں اور اطلس و مخمل کے پردے لٹکا دیتے ہیں۔

اور "حضورؐ نے ہر "بدعت" کو "ضلالت" فرمایا اور ہر ضلالت کو "جہنم" سے نسبت دی۔"

مگر ہم آپؐ کے حلقہ بگوشوں اور جاں نثاروں نے "نعمۃ البدعۃ" کی آڑ بنا کر "بدعات" کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ہمیں جیسی دلچسپی "بدعت" کے ساتھ ہے اُتنی دلچسپی اور کسی چیز سے نہیں ہے۔ عرس' تیجا' دسواں' بیسواں' چالیسواں' مدار کی چھڑیاں' سدو کا بکرا' کسی کا توشہ' کسی کی نیاز' کسی کی صحنک' کسی کے کونڈے' کسی کے نام کی گاگر' کسی کا پنکھا' کسی کی نیاز حلوے مانڈے پر' کسی کی فاتحہ شربت اور کھیر پر اور کسی کی بالائی حلیم پر' قبروں کو غسل و پھر اُن کا

پانی ہم تبرک کے طور پر پیتے ہیں۔ قبروں پر جلنے والے چراغوں کی۔ یعنی جس فعل پر آپؐ نے لعنت بھیجی ہے اُن چراغوں کی راکھ ہم چاٹتے ہیں۔

اور وہ جو حضورؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا تھا:۔

"اللہ تعالیٰ کا کسی کو شریک نہ ٹھہرانا چاہے۔ تجھے قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔" (مشکوٰۃ باب الکبائر)۔

تو حضور آپؐ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر اپنے مزاج اور طبیعت کو کیا کریں کہ "شرک" کے معاملہ میں ہم کچھ بے پرواہ واقع ہوئے ہیں اور اس پر جتنی بھی "ڈھیل" ہو جائے ہمیں نہیں کھلتی۔ آپؐ کو "احمد بلا میم" کی اصطلاح اور ترکیب ہمارے ہی ذہنِ نادرہ کی تخلیق ہے۔ ہم آپؐ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ جہاں کہیں سے بھی ہم آپ کو پکاریں آپؐ ہماری پکار کو سن لیتے ہیں اور آپ ہی نہیں ایک ایک وفات پائے ہوئے پیر اور ولی کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مخلوقات کی دستگیری کرتے ہیں اور اپنے ماننے والوں اور عقیدت کیشوں کے احوال کی اُن کو خبر رہتی ہے۔ (ان عقائد و اعمال سے اللہ تعالیٰ کی کروڑ بار پناہ)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد، حکم اور فرمان کی اس بے دردی کے ساتھ مخالفت اور خلاف ورزی کرنے کے بعد "عشقِ رسولؐ" کا دعویٰ، ایک ایسا تضاد ہے کہ جس کی مثال دنیا کے پردے پر شاید ہی کہیں مل سکے۔ کتنا بڑا دھوکا ہے جو "عشق و محبت" کے نام پر شیطان نے اُن لوگوں کو دے رکھا ہے جو "مشرکانہ اعمال و رسوم اور بدعات" سے انتہائی شغف رکھتے ہیں اور جن کا مشن ہی یہ ہے کہ یہ خرافات فروغ پائیں اور ان خرافات کے فروغ کو وہ اپنے "مسلک" کی بہت بڑی فتح

سمجھتے ہیں۔

وہابیت اور دیوبندیت

مکہ میں جب اسلام پھیلنا شروع ہوا تو کفارِ قریش نے مسلمانوں کیلئے ایک طنز آمیز لقب "صابی" تراشا تھا جس کے معنے "بے دین" کے تھے۔ یعنی جس کافر کو اللہ ہدایت دیتا اور وہ اسلام قبول کر لیتا تو کفارِ قریش طنزاً غیظ و غضب کے لہجہ میں کہتے کہ "فلاں شخص "صابی" ہو گیا"۔

اہلِ بدعت نے بھی خدا کے اُن غیرت مند بندوں کے لئے "جو شرک و بدعت" کو کسی عنوان برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ "وہابی اور دیوبندی" کے لقب تراش لئے ہیں اور جب کوئی اُن کی خرافات پر ٹوکتا ہے تو اُسے "وہابی اور دیوبندی" کہہ کر مطعون کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے بیچارے عوام کے دلوں میں اپنے پروپیگنڈے کے زور سے یہ بات اُتار دی ہے کہ "وہابی اور دیوبندی" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کیا کرتے ہیں، اور اولیاء اللہ کے دشمن ہیں"۔

اہلِ بدعت نے ان "وہابیوں اور دیوبندیوں" کی کتابوں کے بعض غیر محتاط جملوں اور غیر معتدل عبارتوں کا اس زور شور سے پروپیگنڈا کیا ہے کہ اس تصویر کے تمام روشن اور تابناک پہلو عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور یہ چند "چھائیاں" پوری تصویر پر چھا گئی ہیں۔ حالانکہ "اہلحدیث (وہابیوں) اور دیوبندیوں" کا مشن اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کو "کتاب و سنت" کی دعوت دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوۂ حسنہ" کی طرف انسانیت کو بلائیں وہ خود اپنی ذات سے بھی اتباعِ سنت کی امکانی کوشش کرتے ہیں اور "وہابیوں" کا تو اس معاملہ میں یہ

حال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کی ذات سے "اطاعت" و "اتباع" ہی نہیں۔ بلکہ "تقلید" تک کی نسبت انھیں گوارا نہیں — مقام حیرت ہے کہ جو ہر بات کے لئے کتاب وسنّت سے سند طلب کرتے ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی بناء پر۔

مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ۔ — جس نے کوئی کام کیا اور اس کام کرنیکا میرا حکم نہیں ہے وہ مردود ہے۔

ہر اُس "بدعت"۔ "احداث" اور "جدّت" کو ٹھکرا دیں جس کے لئے سنتِ رسولؐ میں دلیل نہ ملتی ہو۔ اُن کو تو "رسولؐ اللہ کے مرتبہ کو گھٹانے والا" کہا جائے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل کے مقابلہ میں دوسروں کی نکالی ہوئی بدعتوں، جدتوں اور نئی نئی باتوں ہی کو دین سمجھتے ہوں وہ دعویٰ کریں "عشقِ رسول" کا۔ ؎

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

اگر "دیوبندیت اور وہابیت" شرک وبدعت کے ردّ ومخالفت اور سنّتِ رسولؐ کے بقاء واحیاء اور تمسک کا نام ہے تو پھر یہ بڑی اچھی چیز ہے، اور اسلام میں شروع ہی سے یہی "فکر" کارفرما اور فعال رہی ہے۔

حجرِ اسود جس کی پاکیزگی سب کے نزدیک مُسلّم ہے۔ جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لب ہائے مبارک سے چوما ہے اور کروڑوں صالحین اور اولیاء اللہ نے اُس کو چُھوا اور بوسہ دیا ہے۔ اُسے مخاطب کر کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

رایت عمر یقبل الحجر ویقول لاعلم انک حجر ما تنفع ولا تضر — (عابس ربیعہ نے کہا) میں نے عمرؓ کو حجر اسود چومتے دیکھا کہ وہ کہتے جاتے تھے کہ میں جانتا

ولولا انی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبلک ماقبلتک۔	ہوں تو پتھر ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے نہ دیکھتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس درخت کے نیچے صحابہ کرامؓ سے بیعت لی تھی اور جس کا ذکر خود قرآن کریم میں آیا ہے:۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ۔

یہ درخت برکت کا کتنا بڑا اثر اور نشان بن سکتا تھا۔ مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر کہ لوگ اس درخت کے پاس کثرت سے آنے جانے لگے تھے اور خطرہ ہو گیا تھا کہ عقیدت کا غلو کہیں مسلمانوں کو کسی بے اعتدالی میں مبتلا نہ کر دے اور آنے والی نسلیں اس درخت کو "نشانِ تعظیم" نہ بنا لیں حضرت عمرؓ نے اس درخت ہی کو سرے سے کٹوا دیا۔

کیا حضرت عمرؓ "وہابی اور دیوبندی" تھے؟ کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبہ کو گھٹانا چاہتے تھے؟ کیا فاروقِ اعظمؓ انبیاء کے آثار و نشان کی برکت سے واقف نہ تھے؟ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس قسم کے رکیک تصورات کا ذہن میں لانا جہالت ہی نہیں معصیت ہے۔ سنت رسول کی اتباع اور حفاظت میں عمر فاروقؓ کا قدم کسی سے پیچھے تو کیا ہوتا۔ بلکہ کچھ آگے ہی تھا۔ عشقِ رسولؐ کے تقاضوں کو ان کی برابر پہچاننے والے صحابہ کرام میں بس دو ایک ہی ہوں گے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا "شجر بیعت الرضوان" کو کٹوا دینا، اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ بزرگوں کے آثار و نشانات اور ان سے جو مادی چیزیں نسبت رکھتی ہیں، وہ "توحید" کے مقابلہ میں اضافی ہیں۔ کسی بزرگ اور ولی کے "اثر و نشان" سے اگر فتنہ اور غلو پیدا ہونے کا اندیشہ

ہو اور "توحیدِ خالص" کے تقاضوں پر اس کی زد پڑ رہی ہو تو پھر اُس "اثر و نشان" کا چُھپا دینا ہی اولیٰ اور مناسب ہے۔

شرک و بدعت اور مبالغہ آمیز عقیدت کے ردّ اور توحید کی حمایت میں یہی فاروقِ اعظمؓ کی فکر ہے، جو ہر دَور کے صالحین اور علماء حق کے قول و عمل میں کار فرما رہی ہے۔ خاص طور سے امام ابنِ تیمیہؒ اور ابن قیمؒ جیسے علماء اور صاحبِ عزیمت اسلامی مفکرین کے افکار حمایتِ توحید اور ردِّ شرک و بدعت کے معاملہ میں "فکرِ فاروقیؓ" ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔ (والتفصیل کتاب المتالجسر)۔

"دیوبند" کے مدرسہ کو قائم ہوئے بہت سے بہت نوّے سال ہوئے ہوں گے اور ان کے مشہور اکابر جن سے "دیوبندیت" منسوب کیجاتی ہے اُن کو ڈیڑھ سو سال سے زائد نہیں ہوا۔ اسی طرح جسے "وہابیت" کہا جاتا ہے اُس کی عمر دو سو، سوا دو سو سال کی ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے نہ دیوبند کے مدرسہ میں تعلیم پائی ہے اور نہ اکابرِ دیوبند سے بیعت ہیں اور نہ "اہلِ حدیث" (جن کو اہلِ بدعت "وہابی" کہتے ہیں) کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جب بھی بدعت و شرک کا رد اور توحید کی حمایت کرتے ہیں تو اُن کی باتوں کو بے وزن اور ہلکا کرنے کے لئے مبتدعین کی طرف سے "وہابی" اور "گلابی وہابی" اور "دیوبندی" کی پھبتیاں چُست کیجاتی ہیں۔ حالانکہ توحید و سنت کی حمایت اور شرک و بدعت کا رد ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اس مضمون میں قرآن کریم کی کتنی آیتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں پیش کی جا چکی ہیں جو شرک و بدعت کے ردّ میں روشن براہین

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسے علماء اور ارباب فکر ملیں گے جنہوں نے "شرک وبدعت" کے ان فتنوں پر گرفت کی ہے۔ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھ سو سال پہلے کھل کر فرمایا:۔

انھم وضعوا ھذہ الاصنام والاوثان علی صور انبیائھم واکابرھم وزعموا انھم متی اشتغلوا بعبادۃ ھذہ التماثیل فان اولئك الاکابر تکون شفعاء ھم عند اللہ تعالیٰ ونظیرہ فی ھذا الزمان اشتغال کثیر من الخلق بتعظیم قبور الاکابر علی اعتقاد انھم اذا عظموا قبورھم فانھم یکونون شفعاء ھم عند اللہ۔

یعنی جن بت پرستوں نے اصنام واوثان اپنے انبیاء واکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ جب ہم اُن کی عبادت میں مشغول ہونگے تو یہ اکابر اللہ تعالیٰ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے۔ اسکی نظیر اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں سے مشغولیت ہے۔ اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع ہوں گے۔

+ + + + +

+ + + + +

عرس، فاتحہ، نذر ونیاز، دسواں، بیسواں، چالیسواں، مولود شریف کا قیام اور قبروں کے ساتھ جو معاملات کئے جاتے ہیں دین میں ان کا کوئی درجہ ہوتا تو فقہ کی کتابوں میں ان کا ذکر ضرور آنا چاہئے تھا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ کی کتابیں ان تمام باتوں کے ذکر سے خالی ہیں اور اگر کہیں ذکر آیا ہے تو ان باتوں کی مخالفت ہی میں آیا ہے۔ چند مثالیں:۔

(۱) جو نذریں اموات کے واسطے ہوں از روئے تقریب کے وہ باطل اور حرام ہیں۔ (فتاویٰ عالمگیری، درمختار)۔

(۲) نذر عبادت ہے اور مخلوق عبادت کے لائق نہیں۔ اگر نذر ماننے والے کا یہ خیال ہے کہ میّت کو اختیارات حاصل ہیں تو یہ عقیدہ صریحاً کفر ہے (بحر الرائق)
(۳) غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا یا غیر اللہ کی نذر ماننا شرک ہے (")

ان معاملات میں صحیح دینی پوزیشن یہ ہے کہ کسی شہر میں رہ کر کسی بزرگ کی قبر پر کوئی ساری عمر میں ایک بار بھی (زیارت کے لئے) نہ جائے تو اس سے اللہ تعالیٰ ذرّہ برابر بھی باز پرس نہ کرے گا اور قبر پر نہ جانے سے اُس کے دین و ایمان میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اُلٹے ہاتھ سے پانی پئے گا تو "مخالفتِ سنّت" کا وبال اس کے سر آئے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مستحب نہیں۔ فرض اور منصوص ہے اور کسی فرض کی تعمیل اور تکمیل سُنتِ رسولؐ کی اتباع کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام و فرائض کی تعمیل کرانے کے لئے انسانوں کے سامنے نہیں آتا۔ اس فرض کو رسولؐ انجام دیتا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ اللہ کے اس حکم کی اس طریقہ اور اس ہیئت و انداز سے تعمیل ہوگی۔ سُنتِ رسولؐ کوئی اضافی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اصل دین ہے۔ دین و دُنیا کی تمام سعادتیں کتاب و سُنّت ہی سے وابستہ ہیں اگر کوئی شخص رات میں سوتے ہوئے اُس انداز اور ہیئت سے سوتا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استراحت فرمایا کرتے تھے تو اُس کی یہ شب خوابی نیکی میں گزرے گی

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست + اگر بہ او نہ رسیدی تمام بُولہبی است

"صراطِ مستقیم" نام ہی اُس شاہراہ کا ہے جہاں حضورؐ کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں۔

جب کوئی عُرس، نذر و نیاز اہلِ قبور سے استغاثہ پر گرفت کرتا ہے تو اہلِ بدعت کی طرف سے طنز کی جاتی ہے کہ ایسا کہنے والے اولیاء اللہ

کو نہیں مانتے"۔

یہ "اولیاء اللہ کو ماننا" بھی عجیب مبالغہ آمیز کلیہ ہے۔
"اولیاء اللہ کا ماننا" کیا خدا اور رسول کے ماننے کی طرح
"کلمۂ شہادت" کا کوئی جزو ہے کہ جس کے بغیر ایمان ہی مستند نہیں ہوتا ــــــ
اولیاء اللہ کا ماننا اس کے سوا اور کیا ہے کہ اُن کے اعمالِ صالحہ کی سبب
ہم اُن سے محبت رکھیں اور اُن کی صالح زندگی سے اثر قبول کر کے اپنے کو
بھی صالح، اللہ کا فرماں بردار بندہ اور رضائے الٰہی کا جویا بنائیں۔

"ماننے" اور "نہ ماننے" میں جو ایمان و کفر ثابت ہوتا ہے اُس کا انسانوں
میں تعلق صرف انبیاءِ کرام کی ذات سے ہے اُن میں ہم کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے
اور خود انبیاءِ کرامؑ میں نہ ایک دوسرے پر تنقید ہے نہ مناقشت اور مسابقت
ہے نہ اُن میں کوئی جدال و نزاع ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے "نبوت و
رسالت" کا امتیاز، علم و تزکیہ کی ہر بلندی کے مقابلہ میں نمایاں نظر آتا ہے۔
انبیاءِ کرام جیسی طہارت و عصمت کسی کو حاصل نہیں ہے۔ یہی سبب ہے
کہ صحابہ کرامؓ جو عادل تھے۔ اُن میں خونریز جنگیں ہوئی ہیں۔ حضرت امام
ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ولی تھے اور امام بخاری قدس سرہٗ بھی ولی
تھے۔ مگر امام بخاریؒ نے امام ابو حنیفہؒ پر خوب کس کر تنقید کی ہے۔ ایک
گروہ امام ابو حنیفہؒ پر "قلتِ فہم حدیث" کی طنز کرتا ہے اور دوسری جماعت
امام بخاریؒ کی "قلتِ تفقہ" کو موضوع گفتگو بناتی ہے۔ ایک گروہ کے
"قطب العالم" دوسرے گروہ کے نزدیک اور دوسرے گروہ کے "اعلیٰ
حضرت مجدد مأتہ" پہلے گروہ کے نزدیک انتہائی مبغوض ہیں۔

اولیاء، صلحاء، اور علماء حق پر گرفت کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ

یہ بڑی محرومی کی دلیل ہے مگر یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنے سے ایمان جاتا رہتا ہے اور اولیاء کرام اور صلحاء سے خوش گمانی اور محبت و عقیدت ہی رکھنی چاہیئے کہ انھوں نے اپنی زندگیاں کتاب و سنّت کے اتباع اور دین کی خیر خواہی میں گذاری ہیں۔ مگر ظاہر ہے وہ انبیاء کرام کی طرح نہ معصوم تھے اور نہ مطاع تھے۔ اس لئے اگر اُن کا کوئی قول و فعل کتاب و سنت سے مطابقت نہ کرتا ہو تو دین کی خیر خواہی اور کتاب و سُنت کے اتباع ہی کا یہ تقاضا ہے کہ اُسے چھوڑ دینا چاہیئے ـــ یہ ہے "اولیاء اُمت کو ماننے" کی صحیح دینی پوزیشن۔

عیسائیوں نے اپنی ہوائے نفس سے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو "ابن اللہ" بنادیا۔ یہ عقیدہ اُن کے ایمان کا نہ صرف یہ کہ جزو ہے بلکہ ایمان کی اساس ہے تو اس "خیالِ ابن اللہ" کو جو کوئی "[illegible]" سمجھے اُسے وہ حضرتِ عیسیٰؑ کا "[illegible]" اور "توہین کرنے والا" سمجھتے ہیں اور اُن کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور قابلِ اعتراض [illegible] قرآنِ پاک ہے کہ جس نے کھل کر مسیح کے "ابن اللہ" ہونے کی تردید کی ہے۔ اُن کے اس عقیدہ کو نہ ماننے کے سبب عیسائی تمام مسلمانوں کو حضرت عیسیٰؑ کا دشمن، مخالف اور توہین کرنے والا سمجھتے ہیں۔

اسی پر قیاس کر لیجئے کہ اہلِ بدعت نے بھی اپنے تصورات کے زور سے رسول اللہ اور اولیاء کرام کے لئے "مناصب و مقامات" وضع کر لئے ہیں یعنی یہ کہ وہ "مشکل کشا اور حاجت روا ہیں"۔ "حاضر و ناظر ہیں۔ اللہ کے حکم سے رزق دیتے ہیں۔ کوئی کہیں سے اُن کو پکارے تو وہ ہر پکارنے والے کی

پُکار سن لیتے ہیں۔ ! دھلم جرا۔

جب کوئی اہلِ بدعت کے ان "مزعومہ تصورات" اور "خود تراشیدہ عقائد" کی تردید کرتا ہے تو وہ شور مچانے لگتے ہیں کہ دیکھو! رسول اللہ کی شان گھٹائی جارہی ہے۔ اولیاء اللہ کے ساتھ یہ دشمنی ہورہی ہے۔" حالاں کہ یہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کی تخفیف ہے اور نہ اولیاء کرام کے ساتھ عداوت ہے۔ بلکہ یہ اہلِ بدعت کے تراشے ہوئے عقاید کی تردید ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شہادت کے بعد حضرت حسنین رضی اللہ عنہما نے اُن کی کوئی ضریح نہیں بنائی اور نہ واقعۂ کربلا کے بعد حضرت امام زین العابدینؒ نے اور اُن کے بعد اُن کی اولادِ اطہار نے اس واقعہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے کوئی تعزیہ نکالا، نہ سڑکوں پر ماتم کیا، نہ مہندی، جھولے اور دُلدُل کا گشت کرایا۔ یہ سب بعد کے لوگوں کی نکالی ہوئی بدعات ہیں۔ مگر جو کوئی اس فرقہ کا ان بدعات میں اُن کا ساتھ نہیں دیتا تو وہ اُسے اہلِ بیت کا نہ ماننے والا اور اُن کے درجہ کو نہ پہچاننے والا سمجھتے ہیں حالانکہ ان "بدعات" اور عجمی اختراعات اور کھیل تماشوں سے اہلِ بیت کرامؓ کی محبت اور عقیدت کا کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اہلِ بدعت عرس نذر و نیاز اور قبور پر ہونے والی بدعات پر نکیر کرنے والوں کو "اولیاء اللہ کے نہ ماننے والوں" اور "اُن کا رتبہ گھٹانے والوں" میں شمار کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کی خام خیالیاں اور غلط اندیشیاں ہیں۔ انھوں نے عقاید و تصورات کے جو بُت تراش رکھے ہیں اُن پر کوئی ضرب لگتا ہے تو اس "بت شکنی" پر وہ واویلا مچانے لگتے ہیں کہ یہ تو کعبہ کی بنیادیں ڈھائی جارہی ہیں۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند!

"بدعت" سنّت کی ضد ہے اور کوئی "اہلِ سنّت" بدعات سے شغف نہیں رکھ سکتا۔ فاسق و فاجر کو تو یہ نصیب ہو سکتی ہے کہ وہ فسق و فجور کو اچھا نہیں سمجھتا اور اپنے کئے پر پشیمان سا ہی رہتا ہے یا کم سے کم فخر نہیں کرتا۔ مگر بدعتی کو توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ وہ "بدعت" کو دین کی بھلائی اور خیر خواہی سمجھتا ہے، اُسے "بدعات" میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی اور ان خرافات پر وہ اُلٹا فخر کرتا ہے۔

اس باب کو ختم کر دینے سے پہلے اس بات کا اظہار کر دینا ضروری سمجھا گیا کہ ہم نے جا بجا ایک گروہ کو "اہلِ بدعت" جو کہا ہے بعض حضرات کو غالباً گراں گذرے کہ یہ "جدال احسن" کی راہ نہیں ہے۔ اس کے جواب میں گذارش یہ ہے کہ جن لوگوں کا اوڑھنا بچھونا "بدعات" ہوں اُن کو "بدعتی" اور "اہلِ بدعت" نہ کہیں تو آخر کیا کہیں؟ جس کو جس چیز سے شغف ہوگا اور جس کے لئے وہ جد و جہد کرے گا اُس کو اُسی سے منسوب بھی کیا جائے گا۔ پھر خود یہ حضرات اپنی مخصوص محفلوں ہی میں نہیں، پبلک جلسوں میں اپنے کو "قبریت" اور "اہلِ بدعت" کہتے ہیں پس جس نام اور لقب کو انھوں نے خود قبول کر لیا ہے۔ ہم نے اُسی لقب سے انھیں یاد کیا ہے۔

مغالطے

اہلِ بدعت کا خاصہ ہے کہ جب شرک آمیز عقائد اور بدعات پر انھیں ٹوکئے تو وہ چراغ پا ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے "محبوبوں" کو تم اس قدر بے اختیار سمجھتے ہو؟ ان لوگوں نے غالباً "مجازی محبّوں اور محبوبوں" (LOVERS & BELOVED) کے انداز پر اللہ اور رسولؐ اور اولیاء اللہ کے روابط کو قیاس کیا ہے۔ اس کا اظہار اپنے شعروں میں وہ اس طرح کر بھی چکے ہیں ؎

میں تو مالک ہی کہو نگا کہ ہو مالک کے حبیب　　　یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا

یہ تو مجازی طرزِ بیان ہے کہ "ہم تم دوست دوست۔ جو تمہارا مال، سو ہمارا مال محبوب و محب میں غیریت اور اپنا پرایا نہیں ہوا کرتا"۔ مگر اللہ اور رسولؐ کے بارے میں اس قسم کے مجازی تعلقات اور دوستانہ روابط کا تصور بھی ایمان کو لرزا دینے کے لئے کافی ہے۔ مجازی محبت میں "محب" "محبوب" کی نہ صرف یہ کہ نازبرداری کرتا ہے، بلکہ اس سے ڈرتا اور اس کا دباؤ مانتا ہے اور ہر وقت اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح کوئی بات "محبوب" کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔ کیا اللہ تعالیٰ (رسولؐ کا محب) بھی رسول اللہ (اللہ کے محبوب) سے معاذ اللہ خوف کھاتا ہے اور آپؐ کی محبوبیت کا دباؤ مانتا ہے؟ حالانکہ قرآن واحادیث بتاتی ہیں کہ حضورؐ اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے اور مغفرت چاہنے والے تھے اور دن رات اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں لگے رہتے تھے اور ایک "بندۂ قانت" اور "عبدِ شکور" کی طرح زندگی گذارتے تھے۔

" وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى " سے یہ نکتہ نکالنا کہ اللہ تعالیٰ دُنیوی محبوں کی طرح اپنے محبوب (رسولؐ) کی رضا کا پابند ہے یا آپ کی رضا جوئی میں لگا رہتا تھا، اللہ تعالیٰ کے حضور میں شدید ترین گستاخی اور بے ادبی ہے یہ آیت تو صاف بتاتی ہے کہ " فترضٰی " (تو راضی ہو جائے گا) یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ یہ کوئی نازبرداری یا دباؤ نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے اُن لوگوں پر جو "توحید" کے معاملہ میں اس قدر بے پرواہ واقع ہوتے ہیں اور اُن کو اسی میں لُطف آتا ہے کہ کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا کر کے اللہ اور رسولؐ کو ایک ہی سطح پر لے آئیں اور عبد و معبود کا یہ فرق و امتیاز کسی نہ کسی حیلہ سے مٹے نہیں تو کم سے کم مشتبہ ہو جائے۔

"اہلِ بدعت" نے "وسیلہ" کا جو ایک تصور قائم کر رکھا ہے اس کے ثبوت میں وہ قرآن کریم کی یہ آیت۔ یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ (مائدہ) بے تکلف پڑھ دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی مختصر ترین تفسیر "جلالین" سے لے کر تفسیر کبیر امام رازی تک میں "الوسیلہ" کے معنی "خدا کی اطاعت اور اس کی مرضی کے اعمال سے اس کا تقرب حاصل کرنے کے" بیان کئے گئے ہیں۔ مفسرین کے ذہن میں "الوسیلہ" کے یہ معنی نہیں آتے کہ اس لفظ سے اللہ کے حضور میں انسانی شخصیتوں کا وسیلہ، ذریعہ اور وساطت مراد ہے۔ یہ آیت اعمالِ صالحہ پر مسلمانوں کو اُبھارتی ہے اور یہی اس آیت کا مقصود، مفہوم اور شرح و تفسیر ہے۔

اَغْنَاھُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ۔ جو قرآن پاک میں آیا ہے۔ اس سے "اہلِ بدعت" استناد کرتے ہیں کہ "دیکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو غنی بنا دیا کرتے تھے۔ خود قرآن اس پر شاہد ہے۔" جہاں تک حضورؐ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے اس کا صاف، سیدھا اور واقعات کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے مدینہ میں غلہ کی فراوانی ہوئی، وہاں کے باشندوں کے عام مالی حالات درست ہو گئے۔ اس سے مومنین صادقین کیساتھ منافقین بھی بہرہ اندوز ہوتے تھے اور عام مسلمانوں میں ملے جُلے رہنے کے سبب غنائم سے بھی منافقین فائدہ اُٹھاتے تھے، یہ ہے "اغناھم اللہ ورسولہ" کی صحیح تفسیر اور واقعہ کے مطابق ترجمانی۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں یا دنیا کے پردے پر جس کسی کو بھی آسودگی، فراغت اور مال و دولت ملتا تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرماتے تھے یا قیامت تک کے لئے تمام انسانوں کو غنی و آسودگی دینے کا منصب اللہ تعالیٰ نے اپنے

رسولؐ کو سپرد فرمادیا ہے۔ یہ مفہوم نہ اس آیت سے نکلتا ہے نہ مفسرین نے ایسا سمجھا ہے۔
حضورؐ کی بعثت سے قبل دنیا کو غنی اور آسودہ بنانے کی خدمت کس نبی
کے سپرد تھی ؟ کیا قرآن میں اس کا کوئی اشارہ ملتا ہے ؟
تاریخ و سیر کے واقعات سے ثابت ہے کہ حضورؐ کے پاس مال ہوتا تھا تو
عطا فرماتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور نہیں ہوتا تھا تو نہیں دیتے
تھے۔ ایک بار ایک سائل آیا، حضورؐ سے سوال کیا۔ آپؐ نے امہات المومنین کے
گھروں میں معلوم کرایا کہ کچھ دینے کے لئے ہو تو سائل کو دے دیا جائے۔ پتہ لگا کہ پانی
کے سوا حریمِ نبوت میں کچھ نہیں ہے اس لئے آپؐ نے اس سائل کو دوسرے صحابہؓ
کے پاس بھیج دیا۔
پھر۔۔۔۔ "اغناھم اللہ ورسولہ" کی تفسیر میں کیا یہ بھی کہیں ملتا ہے کہ
صحابہ کرامؓ نے فقر و احتیاج کے عالم میں اپنے گھروں میں بیٹھ کر یا دور بستیوں
میں رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا ہو کہ "یارسول اللہ! ہماری
محتاجی دور فرماکر ہمیں غنی بنا دیجئے"۔ جب صحابہ کرام کو ہم فقر و فاقہ اور دنیوی مشکلات
میں مبتلا پاتے ہیں تو اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ ہم کس طرح قائم کرلیں
کہ فلاں بزرگ کے پاس اللہ کے دیئے ہوئے خزانے ہیں اور وہ ان میں تصرف
فرماکر جس کو جب چاہیں مالا مال کردیں۔
اہلِ بدعت نہ صرف یہ کہ "توحید" کے معاملہ میں بے پروا واقع ہوتے
ہیں، بلکہ آیتوں اور حدیثوں سے ایسے نکتے نکالنا جن سے "عبد و معبود" کے مابین
امتیاز اور فرقِ مراتب زیادہ سے زیادہ مشتبہ ہو، ان کا سب سے زیادہ محبوب
مشغلہ (HOBBY) ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔ (الانفال)

کی تفسیر میں یہ لوگ کیا کیا نکتے نکالتے اور کیسے کیسے حاشیے چڑھاتے ہیں۔
واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں جب مسلمانوں کا کافروں سے مقابلہ ہوا تو حضورؐ نے اپنی مٹھی میں ریت لیکر "شاھت الوجوہ" پڑھا اور ریت کفار کی طرف پھینک دیا اور کنکریاں اور ذرّے کافروں کی آنکھوں میں جا پڑے۔

تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے فوق العادۃ فعل کے بارے میں فرما رہا ہے کہ ہم نے تم میں یہ قوت پیدا کر دی تھی، ورنہ تم اپنے کسب و اختیار سے یہ کام نہ کر سکتے تھے۔ یہ آیت تو "توحیدِ خالص" پر ایک نہایت روشن دلیل ہے۔ اللہ نے بدر میں چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ریت کے ذرّے پھنکوا دیئے، جس نے کافروں کو بدحواس اور پریشان کرنے میں مؤثر کام سرانجام دیا۔

دوسری طرف احد میں اللہ نے نہ چاہا تو آپؐ سے کسی معجزہ اور فوق العادۃ فعل کا صدور نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ آپؐ زخمی ہو گئے۔ یہ آیت تو اس لئے نازل کی گئی تھی کہ "شاھت الوجوہ" پڑھ کر ریت پھینکنے کے اس معجزہ کے سبب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی الوہی اور خدائی تصرف کہیں منسوب نہ کر دیں۔ اسی آیت کا پہلا جزو یہ ہے:۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ۔ — پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے اُنھیں قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے اُنھیں قتل کیا۔

بدر میں صحابۂ کرامؓ کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ سازو سامان اور اسلحہ کی قلت تھی۔ مگر پھر بھی مسلمان اللہ کے فضل سے کفار پر غالب آئے۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مجاہدین صحابہ کو مخاطب کر کے اپنا احسان جتایا کہ:۔

"تم نے اُنھیں (یعنی کافروں کو) قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے اُنھیں قتل کیا۔"

یہاں بھی صحابہ کے اختیارات وقدرت کی نفی کی جارہی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی حکمت، مشیت اور قدرت کا اظہار فرمارہا ہے۔
اہلِ عرب کے درمیان جو شدید مخالفتیں صدیوں سے چلی آرہی تھیں وہ بعثتِ نبویؐ کے بعد دُور ہوگئیں، خاص طور سے اوس وخزرج کی دیرینہ عداوتوں کا خاتمہ ہوگیا اور وہ ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ اس "تالیفِ قلوب" اور "دلوں کے جوڑ دینے" کو اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں ظاہر فرماتا ہے:۔

وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَھُمْ ؕ (الانفال)

اور الفت ڈال دی اُن کے دلوں میں اگر تُو خرچ کردیتا جو کچھ زمین میں ہے سارے کا سارا، تو نہ اُلفت ڈال سکتا اُنکے دلوں میں لیکن اللہ نے اُلفت ڈالی اُن میں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ دو ٹوک لفظوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمارہا ہے کہ دلوں کا جوڑ دینا ہمارا کام ہے۔ اہلِ عرب کے دل آپؐ نے نہیں جوڑے۔ آپؐ زمین کے تمام خزانے بھی خرچ کردیتے تو بھی عرب کے دلوں میں اُلفت نہ ڈال سکتے تھے۔ اُن کے دلوں کو تو ہم نے جوڑا ہے اور اُن کے درمیان ہم نے اخوت اور مودت پیدا کی ہے۔
حیرت ہے کہ لوگ قرآنِ کریم میں اس قسم کی محکم آیتوں کو پڑھتے ہیں۔ اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ نبیوں، ولیوں، پیروں اور شہیدوں کو کائنات میں متصرف سمجھتے ہیں۔ اس قسم کی بیسیوں قرآنی آیات صاف طور پر

بتاتی ہیں کہ قدرت و اختیار کا سررشتہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کے حکم کے بغیر کسی نبی اور رسول نے ایک سانس بھی اپنے اختیار سے نہیں لی۔ اُس کو جب منظور ہوتا تھا۔ انبیاء کرامؑ سے معجزے صادر کرا دیتا تھا اور جب منظور نہ ہوتا تھا تو انبیاء کرامؑ کی تمناؤں اور دعاؤں کے باوجود کچھ نہ ہوسکتا تھا۔

غیر اللہ سے استعانت کے جواز میں" اہل بدعت" جب قرآنِ کریم کی آیت۔" استعینوا بالصبر والصلوٰۃ" سے استدلال کرتے ہیں تو اُن کے ذہن و فکر کی اس کجی پر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ آپ نے کبھی سُنا اور دیکھا ہے کہ کوئی شخص" صبر اور نماز" سے اعانت طلب کرتا ہو کہ یاایتھا الصبر (اے صبر) اور یاایتھا الصلوٰۃ (اے نماز) تم میری مدد اور دستگیری فرماؤ۔ اگر کوئی ایسا فعل کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی احمق نہیں اور ایسا کرنے کو اُس نے اس آیت کے مفہوم کے حکم کی تعمیل سمجھ رکھا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے فعلِ عبث کی تعلیم دے کس طرح سکتا ہے۔

اس آیت کا سیدھا اور صاف مفہوم یہ ہے کہ صبر اختیار کروگے اور نماز پڑھوگے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نازل فرمائے گا۔ اس سے حلِ مقصد اور کشائشِ مشکلات ہوگی۔

ظاہری لفظوں کے" تشابہ" سے اس قسم کے لطیفے اور نُکتے پیدا کرنا۔ فراستِ مومن کو رسوا کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟" من انصاری الی اللہ" میں" انصاری" کا لفظ آجانے سے کیا یہ معنی لئے جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی واقعی اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے انصار و اعوان اور مددگاروں کی ضرورت

لاحق ہوا کرتی ہے اور" انصار اللہ" اللہ کی مدد کیا کرتے ہیں ـــ! (معاذ اللہ)

یہ تو قرآن کی آیتوں کے ساتھ اہلِ بدعت کا رویّہ اور سلوک ہے۔ اسی طرح احادیث نبوی سے اپنے مزعومہ اور خود تراشیدہ عقائد کی تائید کرنا چاہتے ہیں

وَ اِنَّمَآ اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِی

پڑھ کر کس زور شور سے اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے تمام خزانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دیتے ہیں۔ حقیقی معطی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ رسول اللہؐ امین عطا کے قاسم (بانٹنے والے) ہیں۔

اصل حدیث کی ابتدائی عبارت نہ جانے کیوں حذف کر دی جاتی ہے'

پوری حدیث یہ ہے:۔

من یرد اللہ بہ خیراً یفقہ فی الدین و انما انا قاسمٌ واللہ معطی۔	جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اُسکو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور میں تو بانٹنے والا ہوں اور اللہ دینے والا۔

حدیث کے الفاظ خود بول رہے ہیں اور عبارت کا سیاق وسباق بتا رہا ہے یہاں "عطا" سے مال اور رزق و دولت کی تقسیم ہرگز مراد نہیں ہے۔ حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

"قولہٗ اِنَّمَآ انا قاسمٌ۔ قال تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ۔ اشار النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقولہ وَاِنّما انا قاسمٌ الی ما یلقی الیھم من العلم والحکمۃ وبقولہ واللہ یعطی ای انہ یھتدی بہ الی خفیات العلوم فی کلمات الکتاب والسنۃ وذلک ھو التفقہ فی الدین وما فیہ من الخیر۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم و حکمت عطا فرماتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکمت صحابہؓ کو بتاتے (تقسیم فرماتے) تھے۔ اسی کو حدیث میں "تفقہ فی الدین" کہا گیا ہے اور یہی وہ "فہم" ہے جو کتاب وسنت کے نکات ومعانی کی طرف ہدایت ورہنمائی کرتی ہے۔ رسول اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو حکمت عطا فرمائی تھی وہ احادیث کی کتابوں میں محفوظ اور مرقوم ومسطور ہے اور کوئی شخص نبوی تعلیم وحکمت سے بے نیاز ہو کر دین میں فلاح وسعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس حدیث سے یہ مفہوم ہرگز ہرگز نہیں نکلتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کے خزانے بخش دیئے ہیں اور آپ اُن کو تقسیم فرمایا کرتے ہیں۔

اہلِ بدعت "اوتیت بمفاتیح خزائن الارض" سے جو دلیل لاتے ہیں، یہ پوری حدیث یہ ہے:۔

وعن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال بُعثتُ بجوامع الکلم ونُصِرتُ بالرعب وبینما انا نائم رأیتنی اوتیت بمفاتیح خزائن الارض فوضعت یدای۔ (متفق علیہ)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں اور رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے اور جب میں سو رہا تھا مجھے دکھایا گیا کہ مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے اور میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے۔

ایک طرف یہ حدیث، دوسری طرف قرآن کی یہ آیت:۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ — اے نبیؐ! تم کہہ دو کہ میرے پاس اللہ کے (دیے ہوئے) خزانے نہیں ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ جو حدیث قرآن کی مخالف ہو گی اُسے قبول نہیں کیا جا سکتا

اور وہ بھی کسی فقہی مسئلہ میں نہیں بلکہ بنیادی اعتقاد میں۔ اس آیت میں "خزائن اللہ" آیا ہے صرف "خزائن" نہیں کہا گیا۔ یعنی اس آیت میں "اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے خزانوں" کی بھی نفی کی گئی ہے۔ "ذاتی" اور "عطائی" کی تاویل کے لئے بھی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مگر حدیث قرآن کی مخالف نہیں ہے۔ ہاں قرآن کی مخالف اُس وقت ہو گی جب اس کے وہ معنی لئے جائیں جو "اہل بدعت" لیتے ہیں اور عام طور پر اہلِ بدعت اسی حدیث سے استدلال کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے خزانوں کی کُنجیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دی ہیں۔ حالانکہ قرآن جس کی نفی کرتا ہو حدیث اُس کا اثبات کرے ناممکن ہے۔

اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمین پر اپنے اُمتیوں کے قبضہ و تسلط اور حکومت کی طرف اشارہ اور پیشین گوئی ہے جو عالمِ مثال میں آپؐ کو دکھایا گیا تھا۔ خود حضورؐ کے دَورِ مبارک میں بھی عرب پر آپؐ کا قبضہ ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی تاریخ میں ایسا بھی دَور گذرا ہے کہ اُس وقت کی دنیائے معلوم کا بہت بڑا رقبہ اُمتیانِ نبیِؐ آخر کے زیرِ نگوں تھا اور تاریخ کے ہر دَور میں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے اور اس دَورِ انحطاط میں بھی آج لاکھوں میل کے رقبہ پر مسلمانوں کا تسلط، قبضہ اور حکومت ہے۔ جن میں کم و بیش "تین" کروڑ انسان بستے ہیں۔

مشکوٰۃ کی حدیث کے اس ٹکڑے سے۔

وَ اُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ وَ جُعِلَتْ	اور میرے لئے غنیمتیں حلال کی گئیں اور زمین میرے
لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا	لئے مسجد اور پاک کرنے والی بنائی گئی۔

▪ "اُحِلَّتْ لِیْ" (میرے لئے حلال کئے گئے) میں وہ تمام غنائم شامل ہیں

جو آپؐ کے اُمتی جہاد کے ذریعہ حاصل کریں گے اور" زمین میرے لئے مسجد بنائی گئی" میں وہ تمام رقبۂ زمین شامل ہے جو حضورؐ کے اُمتی قیامت تک اپنے سجدوں سے معمور کریں گے۔ اسی طرح " اُوتیت بمفاتیح خزائن الارض" میں عرب کے علاوہ وہ تمام رقبۂ زمین شامل ہے جو آپؐ کے اُمتیوں کے قبضہ میں آیا اور قیامت تک آتا رہے گا۔

اگر یہ حدیث خواب کا واقعہ نہ ہوتی تو بھی اس کے یہی معنی لئے جاتے کہ کتاب اللہ سے ٹکراؤ نہ ہو۔ مگر حضورؐ کا یہ فرمانا۔" وبینما انا نائم رأیتنی" (جب میں سو رہا تھا تو مجھے یہ دکھایا گیا) اس نے معاملہ کو آسان تر بنا دیا۔ اس پر شاید یہ اعتراض وارد کیا جائے کہ انبیاء کرامؑ کے خواب سچے (رویائے صادق) ہوتے ہیں۔ یقیناً ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ انبیاء کرامؑ کو آنے والے واقعات عالم مثال میں دکھائے جاتے ہیں۔ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو خواب میں دیکھا کہ وہ اُنھیں سجدہ کر رہے ہیں، اور یہ مثالی واقعہ اس طرح سچا ہو کر رہا:۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا۔

شاید کہا جائے کہ یوسف علیہ السلام نے جب خواب دیکھا تھا تو وہ اُس وقت کس تھے، نبوّت جب تک کہاں ملی تھی۔ اسی کے جواب میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ خواب میں جو شے حضورؐ کو نظر آئی اس کی خود حضورؐ نے تاویل فرمائی ہے:۔

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رایت ذات لیلۃ بینما یری النائم کانا	میں نے ایک رات اُس حالت میں جس حالت میں سونے والا دیکھا کرتا ہے، دیکھا کہ گویا میں عقبہ بن رافع کے گھر میں ہوں اور ہمارے

فی دار عقبۃ بن رافع فاُتینا برطب من رطب ابن طاب فاولت ان الرفعۃ فی الدنیا والعاقبۃ فی الآخرۃ وان دیننا قد طاب۔

سامنے رطب (تازہ کھجور) لائے گئے تو میں نے اُس کی یہ تاویل کی کہ ہمارے لئے دنیا میں رفعت ہے اور آخرت میں انجام (اچھا ہے) اور ہمارا دین مکمل اور احسن ہو گیا۔

حدیث میں آیا تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے اور غلہ پر ہاتھ اُٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن اشیاء کی مقدار کو کثیر و وافر کر دیا۔ مگر اہلِ بدعت اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ بزرگوں کے نام کی جو فاتحہ دی جاتی ہے اور اُس میں کھانا اور شربت و شیرینی سامنے رکھ کر جو ہاتھ اُٹھا کر دعا پڑھتے اور ایصال ثواب کرتے ہیں۔ اس کا جواز اس حدیث سے نکلتا ہے۔ مگر خدا کے بندو! اس حدیث سے یہ کہاں ثابت ہے کہ حضورؐ نے غلہ، طعام اور پھلوں پر ہاتھ اُٹھا کر کسی کی روح کو ثواب پہنچایا تھا۔ واقعہ کیا ہے اور اس سے مفہوم کیا پیدا کیا جا رہا ہے۔

اسی طرح یہ حدیث کہ حضورؐ کہیں سے گذر رہے تھے، دو قبروں پر آپؐ نے ہری شاخیں گاڑ دیں اور فرمایا کہ ان قبروں پر عذاب ہو رہا تھا۔ یہ شاخیں جب تک ہری رہیں گی اہلِ قبر کے لئے دعائے مغفرت کریں گی۔ مگر اس حدیث سے یہ کس طرح ثابت ہوتا ہے کہ قبروں پر پھول چڑھانا جائز ہے حضورؐ نے ان قبروں پر پھول کب چڑھائے تھے اور یہ جو بزرگانِ دین کی قبروں پر عقیدت مند پھول چڑھاتے ہیں تو اُن کی کیا یہ نیت ہوتی ہے کہ اُن کے ایسا کرنے سے اُن بزرگوں کے عذابِ قبر میں تخفیف ہو جائے گی اس قسم کا واہمہ بھی کسی زائر کے ذہن و قلب میں نہیں گذرتا اور نہ گذرنا چاہیے

پھول تو عقیدت و تکریم کی نیت سے چڑھائے جاتے ہیں۔ جس کی کوئی سند کتاب و سنت، آثارِ صحابہ بلکہ ائمہ فقہ کے کسی قول تک سے نہیں ملتی۔ لہٰذا یہ فعل "بدعت" ہے اور گمراہی ہے۔

یہ ہے ان "عاشقانِ رسولؐ" (؟) اور "حامیانِ سُنّت" (؟) کا سلوک جو احادیث کے ساتھ کرتے ہیں اور یہ ہیں اُن کے استدلال، تفکر و تعمق اور تفقہ فی الدین کے چند نمونے۔

اہلِ بدعت "غیر اللہ" سے استمداد کے جواز میں حصن حصین کی یہ روایت استدلال میں پیش کرتے ہیں کہ حضورؐ سے مروی ہے کہ جو کوئی راستہ بھول جائے وہ یوں پکارے:۔

اعینونی یا عباد اللہ۔

طبرانی کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان اراد عونًا فلیقل یا عباد اللہ اعینونی، یا عباد اللہ اعینونی

جو کوئی عون (مدد) چاہے تو اُسے یوں کہنا چاہیے کہ اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔ اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔

+ + + +

یہ حدیث اس لئے حجت نہیں بن سکتی کہ اس میں انقطاع و نکارت کی علتیں پائی جاتی ہیں اور اس حدیث کا ایک راوی عتبہ بن غزوان مجہول الحال ہے۔ قرآن شریف میں کتنی محکم آیتیں ایسی ہیں جن میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کو مصیبت کے وقت پکارنے سے منع کیا گیا ہے۔ احادیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ حضورؐ سے جو دعائیں مروی ہیں اُن میں بھی اللہ تعالیٰ ہی سے براہ راست عرض معروض کیا گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی کسی پریشانی، اضطراب اور مصیبت میں اللہ کے سوا کسی دوسرے سے مدد نہیں

چاہی۔ اُن کا یہ معمول نہیں رہا۔

کتاب و سنت کے بے شمار واضح احکام و شواہد کے مقابلہ میں:-

"یا عباد اللہ! اعینونی"

والی تنہا روایت "حجت" کس طرح بن سکتی ہے۔ جب کہ یہ روایت صحت کے درجے کو بھی نہیں پہنچتی اور اس میں علتیں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ پایہ صحت سے گری ہوئی ایک روایت جس سے قرآن کی متعدد آیتوں اور سینکڑوں حدیثوں کی مخالفت ہوتی ہو، کس طرح قبول کی جا سکتی ہے؟

"اہلِ بدعت" کی طرف سے کبھی کبھار یہ لطیفہ بھی سننے میں آتا ہے کہ قبروں پر جو کچھ ہوتا ہے، اگر بزرگانِ دین کو یہ پسند نہ ہوتا تو وہ ایسا کاہے کو ہونے دیتے؟ یہ ایسی بات ہے کہ اس پر ہنسئے بھی اور روئیے بھی۔ اس دلیل کی بنیاد پر سب سے بڑا اعتراض تو حضرت مسیح علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے کہ آپ کی اُمت نے آپ کو "ابن اللہ" بنا ڈالا۔ اسے آپ نے نہیں روکا، اس لئے یہ اس کی دلیل ہوئی کہ نصاریٰ کے اس مشرکانہ فعل سے آپ ناخوش نہ تھے۔ بلکہ رضامند تھے۔ (استغفر اللہ)

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دار الامتحان بنایا ہے اور خیر و شر کا ایک معرکہ اُس کے حکم سے گرم ہے۔ اس میں بڑی نازک حکمتیں اور باریکیاں چھپی ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے، عادل ہے جو کچھ وہ کر رہا ہے ٹھیک عدل کے مطابق کر رہا ہے۔ یہ بات تو خود نبیوں اور ولیوں کی عدم قدرت اور مجبور و بے اختیار ہونے کی دلیل ہے کہ اُن کی تمام جد و جہد، کوششوں اور دُعاؤں کے باوجود بعض اوقات انسانوں کے حالات نہ سنبھل سکے۔ یہاں تک کہ عذابِ الٰہی نے نافرمان قوموں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا۔

تاریخی تجزیہ اس عنوان پر گفتگو کرنے سے قبل ہم اس بات کو واضح کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں کہ وہ "تصوف" جو کتاب وسنت کے مطابق ہے اور "تزکیہ نفس" جس کا موضوع ہے اُس سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے اور صوفیاء کرام نے جو کتاب وسنت کے مطابق زندگیاں گذاری ہیں دین کی تبلیغ کی ہے اور لوگوں کی اصلاح فرمائی ہے اور اُن کے دلوں کے آئینوں کو اُجالا ہے۔ اُن کی عقیدت سے ہمارا دل معمور ہے (اللہ کی اُن پر رحمتیں ہوں) اب رہے صوفیاء کرام کے بعض احوال واقوال، رسم اور طریقے تو اُن کے جانچنے کے لئے اللہ نے جو "کتاب وسنت" کی کسوٹی بنادی ہے، اُسی پر اُن کو پرکھ کر دیکھا جائے گا اور یہ کسوٹی جو بتائے گی وہی حق ہوگا۔

مسلمانوں میں کوئی فرقہ کسی صحابی کے نام سے منسوب نہیں ہے حالانکہ صحابہؓ کی تعداد لاکھوں کے لگ بھگ تھی۔ اُن میں بڑے بڑے رتبہ اور شان و جلالت کے بھی صحابی تھے؛ جن کے علم و تفقہ اور تقویٰ کا بھی مقام ممتاز اور بلند تھا۔ جب کسی صحابی اور اہل بیت کے کسی فرد نے کوئی فرقہ نہیں بنایا تو ہم اس الزام سے حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو قطعاً بری اور پاک سمجھتے ہیں کہ آپ نے مسلمانوں میں کسی فرقہ کی بنیاد ڈالی ہو۔ علیؓ کی ذات دین کی جامع تھی، دین کو معاذ اللہ متفرق کرنے والی نہ تھی۔

تین خلافتوں کا زمانہ حضرت علیؓ اور اہل بیت کرامؓ نے دیکھا ہے۔ اس عرصہ میں اُن کی طرف سے کسی اعتقادی اور دینی اختلاف کا اظہار نہیں ہوا۔ اور ہم فاتح خیبر جیسے شجیع، حق شناس، حق گو اور بلند کردار انسان سے یہ کمزوری ہرگز ہرگز منسوب نہیں کر سکتے کہ آپ اتنی طویل مدت تک مخصوص دینی عقائد منفرد اسلامی فکر اور کوئی خاص فلسفہ اخلاق و روحانیت چھپائے بیٹھے رہیں

"شیعانِ علیؓ" کسی ایسی جماعت کا نام ہرگز ہرگز نہ تھا جن کے دینی عقائد عام مسلمانوں سے مختلف تھے۔ جمل و صفین کی جنگوں میں جو لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جھنڈے کے تلے مخالف گروہوں سے لڑے اُن کو "شیعانِ علیؓ" کہتے تھے، ہم اگر اُس زمانے میں ہوتے تو ہم بھی علی مرتضیٰؓ کے پرچم تلے آپ کی مدافعت اور حمایت میں جنگ کرتے۔ اس لئے ہم بھی اپنے کو "شیعانِ علیؓ" میں سمجھتے ہیں۔

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے جنگ کسی ایسے مسئلہ پر نہیں کی کہ جو توحید، نبوت، معاد و آخرت اور اسلام کے بنیادی عقائد کا کوئی اختلافی مسئلہ ہو۔ حضرت علیؓ نے اپنے مخالف گروہوں اور اُن کے قائدین پر یہ الزام نہیں لگایا کہ تمہارے عقائد فاسد ہیں اور میں صحیح عقائد پیش کرتا ہوں۔ یا تمہاری نمازیں اور روزے کتاب و سنّت کے مطابق نہیں رہے۔ میں نے ان غلطیوں کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا ہے۔

حضرت علیؓ نے دین و شریعت اور اخلاق و روحانیت کا کوئی ایسا فلسفہ یا طرزِ فکر پیش نہیں کیا جو جمہور صحابہ سے مختلف اور منفرد تھا۔ حضرت علیؓ نے کوئی فرقہ نہیں بنایا اور نہ کوئی ایسا جداگانہ فلسفۂ روحانیت و اخلاق پیش فرمایا، جس سے دوسرے صحابہ ناواقف تھے۔ صحابۂ کرامؓ، اہلِ بیت اور خود حضرت علیؓ سب کے سب ایک ہی معلمِ اخلاق (روحی فداہ) کے شاگرد تھے حضورؐ کی تعلیم سب کے لئے عام تھی اور کھلی ہوئی تھی۔ تعلیم کے اخذ کرنے میں تو ذہنوں کی استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے کم اور زیادہ اور فوق و تحت کا فرق ہو سکتا ہے۔ مگر زبانِ وحی ترجمان نے علم و حکمت کے سلسلہ میں کوئی امتیاز نہیں

برتا۔ یہ بات تو کیمیا گروں کو زیب دیتی ہے کہ وہ کچھ چٹکلے سینہ بہ سینہ رہنے دیں۔ نبی کی نہ تو زندگی راز ہوتی ہے اور نہ اُس کی تعلیم "پُر اسرار" ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کتابِ مبین" کو "بلاغِ مبین" کے ساتھ پیش فرمایا۔

اسلام میں سب سے پہلا فتنہ جو ظاہر ہوا وہ "سبائی فتنہ" تھا۔ عبداللہ بن سبا ایک یہودی شہر صنعا کا رہنے والا، اس فتنہ کا بانی مبانی تھا۔ اسلام کے عروج کو دیکھ دیکھ کر اُس کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے۔ یہ شخص مسلمانوں میں شامل ہو کر اُن کا شیرازہ بکھیرنے اور جمی ہوئی بساط کو اُلٹنے کی خفیہ تدبیریں کرنے لگا، اُس نے اپنے آپ کو آلِ رسولؐ کا حامی، خیر خواہ اور اُن کا عقیدت مند ظاہر کیا اور اس قسم کے عقیدے کہ "حضرت محمد رسول اللہؐ بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرح دنیا میں ضرور آئیں گے" مسلمانوں میں پھیلانے شروع کئے۔

"سبائی فتنہ" کے بعد جو پہلا گمراہ فرقہ مسلمانوں میں ظاہر ہوا وہ خوارج کا فرقہ تھا۔ جن کے بعض عقائد مسلمانوں کے جمہور سے یکسر مختلف تھے۔ یہ بخت حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کو دین سے خارج سمجھتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی اور کئی بار اُن کی جمعیت کو تتر بتر کر دیا۔ یہ فرقہ اور اس کے عقائد مسلمانوں میں مقبول نہ ہو سکے۔ مسلمانوں کے جمہور نے اس گمراہ فرقہ سے اپنی برأت ظاہر کی اور آج دنیا میں اُن کی تعداد بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ خوارج میں بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں جو بدنصیب متشدد ہیں وہ تو "صرف ایک رکعت نماز صبح اور ایک رکعت شام کے قائل ہیں" اور ان میں سے بعض پوتیوں، نواسیوں اور بھتیجے اور بھانجے کی بیٹیوں سے نکاح کو حلال سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سورۂ یوسف قرآن کا جزو نہیں ہے۔

(ان گمراہ عقائد سے کروڑ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ)۔

"سبائی فتنہ" کو ذہن میں رکھئے اور آگے بڑھیئے: علوی خلافت کے دور میں بعض لوگوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی اُلوہیت کا اعلان کیا اور آپ نے ایسا کہنے والوں کو دردناک سزائیں دیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے:-

یہلک فِیَّ رجلان مُحبٌّ	میرے بارے میں دو شخص ہلاک ہوں گے۔
مُفرطٌ یفرطنی بمالیس فی	ایک غلبۂ محبت سے۔ ایسی تعریف میری کریگا
ویبغض یحملہ شنآنی علیٰ	جو بات مجھ میں نہیں ہے اور دوسرا عداوت
ان یبھتنی۔	رکھنے والا کہ اسکو میری عداوت نے آمادہ
	کیا اس بات پر کہ مجھ پر بہتان باندھے۔

+ + + +

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد کسی صحابی اور خلیفہ کے بارے میں کوئی غلو نہیں کیا گیا۔ اسلام میں عقائد کے سبب سے پہلی فتنہ کا ظہور "عقیدت" کے غلو سے ہوا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات و صفات میں کیا گیا۔ حضرت علی کا دامن اس سے بالکل پاک ہے۔ یہی وہ طرزِ فکر ہے جو باطنیہ، اسماعیلیہ اور قرامطہ کے قالبوں میں ڈھلتی چلی گئی اور مشرکانہ تصورات، بدعات اور عجمی فلسفہ کے انبار پر انبار لگتے چلے گئے۔

چند جھلکیاں:-

(۱) عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں اور معتقدوں نے کہا کہ حضرت علیؓ "معبود حقیقی" ہیں اور وہ شہید تھوڑی ہوئے ہیں۔ ابن ملجم نے تو ایک شیطان کو قتل کیا تھا۔ جس نے آپ کی شکل میں روپ دھار لیا تھا۔ حضرت علیؓ بادلوں میں پوشیدہ ہیں، بادل کی گرج آپ کی آواز ہے اور بجلی کی کڑک

آپ کا کوڑا ہے۔

(۲) اسی مکتبۂ فکر کے ایک فرقہ مفضلیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت علی کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے وہی نسبت ہے جو مسیح علیہ السلام کو حق تعالیٰ سے ہے۔ اور جس کسی کا اتحاد ذاتِ لاہوت سے ہو وہ نبی ہے۔

(۳) فرقہ سرغیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ لاہوت کا حلول صرف پانچ ہستیوں میں ہوا ہے وہ یہ ہیں:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عباس، حضرت علی، حضرت جعفر اور حضرت عقیل (رضی اللہ عنہم)

(۴) فرقہ بزیغیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت جعفرؓ "الٰہ" تھے اور وہ اپنی اصلی صورت میں نظر نہ آتے تھے۔

(۵) فرقہ جناحیہ اس کا قائل ہے کہ روحِ الٰہی حضرت آدم و شیث علیہما السلام اور تمام نبیوں کے اجسام سے درجہ بدرجہ منتقل ہوتی ہوئی حضرت پیغمبر آخر الزماں تک آئی اور پھر حضورؐ سے حضرت علیؓ، حضرت حسنینؓ، اور محمد بن الحنفیہؓ تک پہنچی۔

(۶) فرقہ باقریہ۔ امام باقرؒ کو "حیٌّ لا یموت" مانتے ہیں اور ان کے "امام منتظر" ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

یہ ہے وہ "مشرکانہ طرزِ فکر" اور "عجمی عقائد" جو مسلمانوں میں عقیدت و محبت کے نام پر داخل ہوئے ہیں اور یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے کہ ان عقائد کا مرکز حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کی ذات کو بنایا گیا ہے۔ حالانکہ علی مرتضیٰؓ اور ائمہ اہلِ بیت کا دامن بے غبار ہے اور ان پر کسی مشرکانہ عقیدہ اور بدعت کی ذرہ برابر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جس طرح

نصاریٰ نے "ابن اللہ" کے مرکزی تصوّر کے ارد گرد پورا فلسفہ اور مکمل علمِ کلام کھڑا کر دیا ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور ائمہ اہلِ بیتِ اطہار کو مرکزِ عقیدت قرار دے کر پورا علمِ کلام تصنیف کیا گیا، جس کی چند جھلکیاں اوپر گذر چکی ہیں۔

یہ بات بھی ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ تصوّف کے تمام سلسلے نقشبندیہ سلسلہ کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی سے منتسب ہیں اور آپ پر ہی منتہی ہوتے ہیں۔ ان سلسلوں میں اکابرِ صوفیاء گذرے ہیں جنھوں نے کوئی شک نہیں دین کی اور خاص طور سے تزکیۂ نفس کی بہت بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ (رحمہم اللہ تعالیٰ)

اس اعتراف کے بعد ہمیں یہ بھی کہنا ہے کہ طریقت کے سلسلوں کے اس انتساب نے اس تصور کو بھی مسلمانوں میں اُبھارا کہ ولایت، طریقت، روحانیت اور تصوف کی مرکزیت، رہنمائی اور قیادت کا منصب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تفویض ہوا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد عہدِ خلافت میں یہ تصوّر اور یہ امتیاز نہ پایا جاتا تھا اور جس طرح دوسرے اکابر صحابہؓ سے لوگ دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ اسی طرح حضرت علیؓ کے پاس بھی دین حاصل کرنے کی غرض سے آتے تھے یہ تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ عمرؓ اور عبد اللہؓ ابن مسعود تو دین کی ظاہری احکام کی تعلیم دیتے ہیں اور علیؓ دین کے اسرار اور باطن کی تعلیم دینے پر مامور ہیں اور ولایت کے لئے حضرت علیؓ کی ذات سے روحانی انتساب ضروری ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور اس دور کے دوسرے ائمہ حدیث و فقہ جن کا زمانہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

سے بہت قریب تھا۔ وہ طریقت کے کسی سلسلہ میں منسلک نہیں ہیں۔ اگر ولایت روحانیت اور تزکیۂ نفس کے لئے یہ انتساب اور انسلاک ضروری ہوتا تو ائمہ فقہ و حدیث بھلا اس برکت وسعادت سے محرومی گوارا کر سکتے تھے۔ غرض کہنا یہ مقصد یہ ہے کہ ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت کی تفریق قرنِ اوّل میں نہ پائی جاتی تھی۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ اس تفریق کے آثار بعد میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ عارفان باللہ اور اولیائے کرام کے جن کتابوں اور تذکروں میں نام و احوال درج ہوتے ہیں۔ اُن میں امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ جیسے اکابر صلحاء اُمت کے نام نظر نہیں آتے۔ امام ابوحنیفہؒ کے تقویٰ وطہارت کی کوئی حد و نہایت ہے۔ پھر آپ کا کتاب و سنت سے شغف بلکہ اُس میں مہارت اور تعمق نورٌ علی نور، اور "تفقہ فی الدین" کی استعداد اور صلاحیت میں تو امام موصوف اپنی آپ نظیر تھے۔ ان تمام دینی اوصاف کے باوجود اگر ابوحنیفہؒ ولی باللہ اور صاحبِ روحانیت نہ تھے تو پھر پوری اُمت میں نہ کوئی ولی اللہ اور نہ کوئی صاحبِ عرفان و روحانیت پیدا ہوا۔

حضرتِ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے احادیثِ نبوی کے صحیح ترین مجموعہ کو مدوّن کر کے تمام اُمتِ اسلامیہ پر احسان کیا ہے جو خدمات کرنے والے تھے، سنتِ رسولؐ کے سب سے بڑے جامع، ناشر، مبلغ اور متبع تھے، جن کے اندر کمال درجہ کا تقویٰ اور صالحیت پائی جاتی تھی ان تک کا نام "ولایت و عرفان" کی فہرستوں میں نظر نہیں آتا۔ ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت کی اس "تفریق" اور امتیاز نے عقائد و اعمال کو اچھوتا نہیں رہنے دیا۔ غضب خدا کا منصور حلاج اور سرمد جیسے مجہول لوگوں کو تو اسرارِ باطن کا ماہر اور عرفان و شہود کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر امام ابوحنیفہؒ اور امام بخاریؒ جیسے صلحاء اور اتقیاء

اور دین و شریعت کے محافظین کو علماء ظاہر میں شمار کیا جائے اور معرفت و روحانیت کے باب میں انھیں کورا سمجھا جائے۔

تاریخ کے ان حقائق کو بھی ذہن میں رکھیئے کہ فرقہ باطنیہ نے انتہائی عیاری اور چالاکی کے ساتھ ظاہر و باطن کی تقسیم کو ابھارا، قرآنی احکام کے بارے میں یہ کہا کہ اصل عمل ان احکام کے باطن پر ہونا چاہیئے اور باطن کی تربیت کے لئے امامِ معصوم کی ضرورت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کئے جاتے ہیں۔ پھر اس عقیدہ کو پھیلایا کہ کچھ نفوسِ قدسیہ اور معصوم ائمہ دُنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو کر عالمِ غیبوبت میں رہتے ہیں اور عارفوں اور سردابوں سے احکام نافذ کرتے اور روحانی تربیت فرماتے ہیں اور "نماز" سے مراد تو امام کو پکارنا ہے اور "زکوٰۃ" وہ ہے جو امام کو دی جائے اور "حج" امام کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔

آپ اُوپر پڑھ چکے ہیں کہ "حضرت علیؓ کو الہٰ" اور "معبود" کہا گیا۔ پھر "امام" سے جو اوصاف منسوب کئے گئے اُس نے "نبوت" کے مقابل "امامت" کا ایک تصور پیدا کر دیا۔ پھر "باطن و روحانیت" کے مقابلہ میں دین و شریعت کو کمتر اور گھٹیا ٹھیرایا گیا، اس مشن نے، تعلیم نے اور تحریک نے توحید، نبوت اور شریعت پر ضرب لگائی اور ذہن و فکر کو بہت بڑے غلجان اور فتنہ میں مبتلا کر دیا۔

> "لاہوت اور ناسوت کا اتحاد، روح اور نور کا انسانی قالبوں میں منتقل ہونا اُلوہیت کا باطن پر ظہور تجلی کے لباس ہیں۔۔۔۔"

یہ طرزِ بیان، یہ اندازِ فکر، کشف و وجدان کا یہ اظہار، یہ اصطلاحیں، اور یہ زبان رفتہ رفتہ پھیلتی چلی گئی اور معاملہ چند اقوال اور ملفوظات تک ہی محدود نہیں رہا، مبسوط کتابیں اس نہج پر تصنیف ہوئیں اور لوگوں نے انھیں

اسرار کا گنجینہ، معارف کا خزینہ، باطن کا دفتر بے پایاں، کشف و شہود کے نگینے اور عرفان و تجلی کے آئینے سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔

حدیث و فقہ میں جس طرح جرح و تعدیل سے کام لیا گیا اور نقد و احتساب کیا گیا جس کے سبب ہر چیز نکھر نکھر کر سامنے آگئی۔ فقہ میں شاگردوں نے اپنے اُستادوں اور اماموں سے اختلاف کیا صرف حق کی بناء پر کہ اُنکو اپنے استادوں کی رائے یا اجتہاد یا تاویل و استنباط قریب صواب نظر نہ آیا۔ تصوّف میں افسوس ہے کہ فقہ و حدیث کی طرح نقد و احتساب کو روا نہیں رکھا گیا۔ اگر اہلِ تصوّف میں امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی جیسے جری نقاد پیدا ہوتے رہتے تو یہ آئینہ بے غبار ہوتا اور اس گل کدہ کے خار و خس اور جھاڑ جھنکار چھنٹے رہتے۔

"وحدت الوجود" اگر اسلام و ایمان کا کوئی بنیادی عقیدہ ہوتا تو کتاب و سُنّت میں اس کا ذکر آتا اور اس سے تزکیۂ نفس کی ضرورت پُوری ہو سکتی تو بھی سُنّت و آثارِ صحابہ اُس کے ذکر و بیان سے خالی نہ ہوتے۔ یہ مسئلہ در اصل دین کا نہیں بلکہ طبیعات کا مسئلہ ہے۔ جس طرح یوں کہتے ہیں کہ "کائنات میں ایک توانائی کام کر رہی ہے۔" تو "وحدتِ توانائی" دین کا مسئلہ نہیں ہے۔ مگر اس کو کیا کہئے کہ "وحدت الوجود" کو اس قدر متنوع اور رنگا رنگ انداز میں پیش کیا گیا کہ "وحدت الوجود" تصوّف کا ایک اہم مسئلہ بن کر رہ گیا۔

بعض صوفی علماء نے کوئی شک نہیں کہ "وحدت الوجود" کی قابلِ قبول شرحیں کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سورج نکلتے ہی ستارے نظر نہیں آتے۔ اگرچہ ستارے غائب نہیں ہوتے۔ مگر سورج کے سامنے وہ ماند پڑ جاتے ہیں۔

اور لاشئی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے وجود کے مقابلہ میں کائنات اسی طرح ہیچ اور لاشئی ہے، جیسے سورج کے آگے ستارے۔ اگر "تصوف" کے مسائل میں تشریح و افہام کا یہی سادہ انداز رہتا تو پھر کوئی اُلجھن پیش نہ آتی۔ مگر دوسرے نازک مسائل اور خاص طور سے "وحدت الوجود" کی شرح میں جو پیچیدہ اور دقیق و نازک زبان اور انداز اختیار کیا گیا۔ اُس نے خاصے اُلجھاوے پیدا کر دیئے اللہ تعالیٰ نے "متشابہات" کی چھان مین اور اُن کے پیچھے پڑنے سے روکا تھا۔ مگر بعض صاحبانِ وجد و حال نے چھانٹ چھانٹ کر اُن نازک ترین اور پیچیدہ و ادق مسائل پر گفتگو کی جو "متشابہات" کا مزاج رکھتے ہیں۔ اسلامی ادب میں یہ اندازِ بیان حوصلہ افزائی کا مستحق نہ تھا۔ مگر آنے والوں نے اس اندازِ بیان کے موجدوں کو معارف و حقائق کے بحرِ بے پایاں کا شناور بتایا اور کہا کہ یہ وہ اہلِ کشف و شہود تھے جن پر باطنی علوم کے تمام پردے چاک ہو گئے تھے۔

زبان و اصطلاح کے بعد بعض اشغال و اوراد اور رسوم میں بھی اس کی جھلک آئی۔ اگرچہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے محتاط صوفیوں نے جرأت کے ساتھ یہ فرمایا:-

"مشائخ کا فعل حجت نہیں"

مگر عقیدت نے اس پر عمل کس قدر ہونے دیا؟

جو لوگ "بدعت" اور "عجمی فلسفہ الٰہیات" سے شغف اور دلچسپی رکھتے تھے۔ اُن کے لئے تصوف کے طرزِ بیان اور بعض مشائخ کی اختیار کی ہوئی رسوم و طریق سے رخصتوں، اباحتوں اور بے اعتدالیوں کیلئے سندِ جواز ہاتھ آ گئی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کو جو "الٰہ ومعبود" کہا گیا تھا، کیا اُسکی جھلک اُن کے لقب "مشکل کشا" میں نہیں ملتی؟ یہ لقب عجمیوں کی اختراع ہے۔ اسی لقب اور ترکیب کی پیروی میں "داتا" اور "غریب نواز" جیسے القاب تراشے گئے، انبیاءِ عظام اور صحابہ کرامؓ میں سے کسی کے نام کے ساتھ اس قسم کے القاب وخطابات آپ کو نہیں ملیں گے۔

باطنیوں کا وہ عقیدہ کہ بعض نفوسِ قدسیہ دُنیا والوں کی نگاہوں سے غائب ہو کر چھپ جاتے ہیں اور اپنے مقاماتِ غیبوبت سے دنیا کی باطنی تربیت اور دستگیری فرماتے ہیں —— اس عقیدہ نے اہلِ سنت میں اس طرح رواج پایا کہ جگہ جگہ شہروں میں "شاہ ولایت" صاحبان کے مزار بنے ہوئے ہیں۔ جن کے بارے میں یہ عقیدہ تراش لیا گیا ہے کہ اس شہر کا انتظام اور نظم ونسق ان "شاہ ولایت" صاحب سے متعلق ہے۔

وہاں ائمہ کی عصمت کا عقیدہ، یہاں مشائخ اور پیروں کے احترام و عقیدت کے آداب اس طرح سکھائے گئے:۔

"کسی پیر کو خلافِ شریعت اور بُری بات میں مبتلا دیکھو تو بھی اس سے حسنِ ظن رکھو اُس سے بدعقیدہ نہ ہو"

اور

بمے سجّادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید + کہ عارف بیخبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

پھر قبروں کے ساتھ وہ مشرکانہ آداب ورسوم اور بدعات وابستہ ہوتی چلی گئیں جو انسانوں کو "الٰہ ومعبود" بنانے والے "ذہن وفکر" کا مقصود تھا۔

اس فکر وعقیدہ نے کیسے کیسے روپ دھائے ہیں: بعض لوگ اپنے خطوں کے شروع میں "ھو العلی"۔ "ھو القادر" اور "ھو المعین" لکھتے ہیں کوئی پوچھے یہ کیا ہے؟ تو اُسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے ہیں کہ "علی"۔ "قادر" اور

"معین" تو اللہ کے نام ہیں۔ مگر کیا وہ اللہ سے بھی اپنے دلوں کی چوری چھپا سکتے ہیں کہ لفظوں میں انھوں نے "صنعتِ ایہام" سے کام لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ساتھ حضرت علی، الشیخ عبد القادر جیلانی اور خواجہ معین الدین اجمیری کے ناموں کی بھی رعایت رکھی گئی ہے۔

شاعری میں یہ فتنہ اس طرح رونما ہوا کہ کفر کو اسلام پر، صومعہ اور بتکدہ کو کعبہ پر، شراب کو آبِ زمزم پر، برہمن کو شیخ پر، رند کو زاہد پر، زنار کو تسبیح پر ترجیح دی گئی اور ڈنکے کی چوٹ کہا گیا ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست   ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

اور ؎   نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

بعض ایسے شعراء جن کی شاعری میں رندی و ہوسناکی رچی ہوئی ہے اور جسے پڑھ کر ذہن میں نیکی کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ طبیعت مستی و ہوس کی طرف مائل ہوتی ہے، انھیں "لسان الغیب" اور "عارف باللہ" کا خطاب دیا گیا۔ غرض:۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

تک معاملہ پہنچ گیا۔

دعوتِ فکر "توحید نمبر" اتمامِ حجت بن کر منظرِ عام پر آیا ہے اگر کچھ جبینیں اسے پڑھ کر شکن آلود اور کچھ چہرے خشم آلود ہو جائیں تو ہم معذور ہیں۔ کسی کی ناخوشی اور سرکہ جبینی کے خوف سے ہم حق بات کو چھپا نہیں سکتے۔

قبولِ حق کا معاملہ تو قلوب کی استعداد اور اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔ کیا عجب ہے کہ "توحید نمبر" کے مضامین کچھ لوگوں کی اصلاح کا سبب

بن جائیں۔

جو حضرات تحقیق کا ذوق اور انکشافِ حق کی تڑپ رکھتے ہیں اُن کی خدمت میں ہماری مخلصانہ اور ہمدردانہ گذارش ہے کہ جن مسائل کا "نقشِ اوّل" میں ذکر آیا ہے اور جو اس شمارۂ خاص میں پھیلے ہوئے ہیں اُن میں سے کسی ایک مسئلہ کو وہ تحقیق کے لئے منتخب فرمالیں۔ مثلاً "مزاروں کے عُرس" کا مسئلہ ہے، اس کی وہ تحقیق کریں اور مخالف و موافق جماعتوں میں سے کسی ایک کی بھی کوئی کتاب نہ پڑھیں۔ بلکہ براہِ راست کتاب اللہ میں احادیث میں، سیرت النبی میں، اُسوۂ صحابہ اور ائمہ فقہ و حدیث کے حالات میں، اس مسئلہ کا پتہ لگائیں کہ کہیں اس کا وجود ملتا ہے؟ کوئی آیت، کوئی حدیث، کوئی اثر اور کسی کا قول، اس کے جواز میں پایا جاتا ہے؟ اس تحقیق میں اگر سال دو سال بھی صرف ہو جائیں تو اہلِ تحقیق کو صبر سے کام لینا چاہئے۔ یہ مسئلہ واضح ہوتے ہی پھر اُن کے ہاتھ میں ایسی کنجی آجائے گی جس سے اس قسم کے تمام مسائل کے قفل کھٹ کھٹ کُھلتے چلے جائیں گے اور حق واضح ہو جائیگا۔

"شرک و بدعت" کا معاملہ کوئی "فرقہ وارانہ" معاملہ نہیں ہے۔ شرک و بدعت کو ہر دور میں اہلِ حق نے قابلِ رد و ملامت ہی سمجھا ہے۔ "شرک" جسے قرآن "ظلم عظیم" کہتا ہے اور جس گناہ کی خوفناکی کا یہ عالم ہے کہ اس کو اللہ کی شانِ غفاری نے معاف نہ کرنے کا اعلان کیا ہے اور "بدعت" جسے اللہ کے آخری نبیؐ نے "ضلالت" کہا ہے اُن کا رد کرنا دین کی سب سے بڑی خدمت اور مسلمانوں کے ساتھ انتہائی خیر خواہی ہے۔ اگر اس کوشش کو کوئی فتنہ سمجھتا ہے تو وہ انبیاء کرام پر معاذ اللہ "فتنہ ساز" ہونے کی تہمت لگاتا ہے جن کا مشن ہی شرک و بدعت کا استیصال، اللہ کی توحید کی تبلیغ اور دینِ خالص

کے قیام کی دعوت تھی۔

جس طرح نجاست اور طہارت کے درمیان اعتدال کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح "شرک و بدعت" اور "توحید و سنت" میں کوئی درمیانی راہ نہیں نکالی جا سکتی۔ "توحید" پر ایمان کا دارومدار ہے۔ یہی اسلام کی اوّلین اساس ہے۔ اس بنیاد پر بال برابر بھی آنچ آئے تو ایمانی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ مدافعت کے لئے تیار ہو جائے۔

"توحید نمبر" میں جو مسائل آئے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ ایک مفروضہ اور قیاس کے طور پر اُن کا وجود تسلیم کر لیا گیا ہو، یہ مسائل مسلمانوں میں موجود ہیں ان پر نکیر کرنی ہی چاہیے۔ مشرکانہ رسوم و بدعات میں رواداری یا سکوت شیطان کا بہت بڑا فریب ہے۔

یا اللہ! ہم سچے دل سے اقرار کرتے ہیں کہ تو "ایک" (واحد و احد) ہے تجھ جیسا کوئی نہیں۔ تیری ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں۔ تیری ذات حلول و تجسم سے پاک ہے۔ حلاّلِ مشکلات، کارساز، بگڑی کا بنانے والا، فریاد کا سننے والا، روزی دینے والا، ہر کسی کی مصیبت میں کام آنے والا تُو اور صرف تُو ہے۔ عام و خاص، غریب و امیر، بادشاہ و گدا، جاہل و عالم، اولیاء اور انبیاء سب تیرے محتاج ہیں۔ جس کو جو کچھ ملتا ہے تیرے در سے ملتا ہے، تیرے حکم کے بغیر ایک ذرّہ بھی نہیں ہل سکتا۔ یہ تیری اور صرف تیری قدرت ہے کہ تُو مخلوقات اور کائنات کے رتّی رتّی بھر حال کی ہر لحظہ خبر رکھتا ہے۔ عالم الغیب والشہادہ تُو ہے۔ سمیع و بصیر اور علیم و خبیر تُو ہے۔

ربّ العالمین! ایسی توفیق عطا فرما کہ ہمارا جینا اور مرنا خالص تیرے

لئے ہو۔ ہماری ساری تمنائیں، آرزوئیں اور ارادے تیری ہی مرضی کے تابع ہو جائیں۔ ہمیں غیرت مند بنا۔ غیرت اس کی کہ شرک کے ادنٰے سے شائبہ کو بھی ہم گوارا نہ کر سکیں۔ تیرے نبیؐ کی سنت اور اسوۂ حسنہ ہماری زندگیوں کا موضوعِ فکر ہی نہیں، معیارِ عمل بھی بن جائے۔ سنت کے مقابلہ میں "بدعت" کو دیکھ کر ہمارے اندر اسے مٹا دینے کا جذبہ پیدا ہو اور ہم سخت کرب و اضطراب محسوس کریں۔

یا اللہ! ہم میں اخلاص پیدا فرما کہ ہم کسی نیک کام پر تیرے سوا کسی سے نہ تو قدرشناسی اور اجر و ستائش کی تمنا رکھیں اور نہ کسی سے خوف کریں۔ تیرے ذکر سے قلوب حلاوت و اطمینان محسوس کریں۔

یا اللہ! جب ہم قیامت میں تیرے حضور حاضر ہوں تو اس پیشانی پر تیری غلامی اور بندگی کے سوا اور کسی آستانہ کے غبار کا ایک ذرہ بھی لگا ہوا نہ ہو۔

بارِ الٰہا! اسلام کو اور مسلمانوں کو عزت و سربلندی عطا فرما۔ سازشیوں اور غداروں سے ملتِ اسلامیہ کو نجات دے۔ اور ملت کا سربراہ کار اُن کو بنا جو تیرے دین کو سربلند کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔

یا اللہ! تیری بندگی کو ہم صرف تیرے ہی لئے خالص رہنے دیں اس میں کسی اور کی غلامی اور محکومیت شریک نہ ہونے پائے۔ جو تجھ سے بندگی اور ربوبیت کا معاملہ ہے۔ وہ دُنیا میں اور کسی سے نہ ہو۔ ہم صرف تیری چشمِ کرم کے اُمیدوار، تیرے در کے سوالی، تیرے

آستانہ کے فقیر اور تیرے کوچہ کے بھکاری ہیں۔ ہم تیرے سوا ہر کسی کی بندگی اور معبودیت سے بغاوت کا اعلان کرتے ہیں۔ پرستش اور بندگی کے لائق صرف تیری ذات ہے۔ تیری خدائی میں، ربوبیت میں، معبودیت اور قدرت واختیار میں کوئی شریک وسہیم نہیں، تیرے حکم کے آگے کسی کو مجالِ دم زدن نہیں۔ ذلت اور عزت کا دینے والا تو ہے اور دنیا کا کارخانہ صرف تیرے حکم سے چل رہا ہے۔

اے وہ کہ تیرے جلال وخشیت سے نبیؐ اور رسولؐ لرزاں اور ترساں رہتے تھے۔ ہم تجھ سے تیرے عفو وکرم اور رحمت کے طالب ہیں دنیا میں بھی اور دین میں بھی۔

برما منگر، بر کرم خویش نگر

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

ماہر القادری

محترمہ عطیہ خلیل عرب

"الوسیلہ" کا حقیقی مفہوم

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ

یہ انتہائی غمناک والمناک وافسوسناک حقیقت ہے کہ وہ مسلمان جو توحید ورسالت پر یقین رکھتے ہیں، انہی میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو مشرکانہ رسوم اور بدعات کے اتنے خوگر ہو گئے ہیں کہ اپنی اس جہالت وضلالت ہی کو "دین" سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے نہ تو وہ حق کی جستجو کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور نہ اُنھیں توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔

عوام کی اس جہالت اور گمراہی کے بہت کچھ ذمہ دار وہ مدعیانِ علم بے خبر ہیں جو "کتاب اللہ" کی آیات میں [illegible] تاویلیں کرنے اور من بھاتا مطلب نکالنے تک سے نہیں چوکتے۔

عوام کو سب سے زیادہ فریب :-

...... "وابتغوا الیہ الوسیلہ"

کے نام پر دیا جاتا ہے کہ یہ دیکھو اللہ تعالیٰ قرآن میں حکم دیتا ہے کہ "وسیلہ تلاش کرو" پس انبیاء، شہداء اور اولیاء کے "وسیلہ" کے بغیر خدا تک رسائی ہی نہیں ہو سکتی اور یہی "وسیلہ" کا عقیدہ پھیل کر "قبروں پر جا کر مرادیں مانگنے، اُن پر چادر چڑھانے، طواف کرنے، اولیاء اللہ کو حاضر وناظر جاننے، اُن کے ناموں کی دہائی دینے اور اُنھیں مصیبت کے وقت استمداد کے لئے پکارنے"

کی مشرکانہ صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔

اس مضمون میں اسی آیت کی شرح و تفسیر مقصود ہے، تاکہ اہلِ بدعت نے جس آیت کو سب سے زیادہ اپنی ہوائے نفس کی کمین گاہ بنا رکھا ہے اس کی معنوی تحریف اور غلط استدلال کا تار پود بکھر جائے اور لوگ سمجھ لیں کہ اس آیتِ کریمہ کا اصل منشاء اور مقصود و مدلول کیا ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ ــــ (المائدہ)

خط کشید جزوِ آیت سے اہلِ بدعت و بدعقیدہ لوگ پیر پرستی اور غیر اللہ کو خدا تک رسائی کا ذریعہ بنانے کے لئے بزعمِ خود وجہ جواز پیش کرتے ہیں حالانکہ قرآن کریم میں یہاں اور جہاں بھی "الوسیلہ" استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے جو یہ لوگ لیتے ہیں۔

پہلے یہ دیکھنا ہے کہ "الوسیلہ" کے لغوی معنی کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب امام راغب اصفہانی کی لغت ہے۔ "مفردات راغب اصفہانی" میں اس لفظ "الوسیلہ" کی لغوی تشریح ملاحظہ ہو:۔

(وسل) الوسیلة التوصل الی الشئی برغبة وھی اخص من الوصیلة لتضمنھا لمعنی الرغبة قال تعالیٰ ابتغوا الیہ الوسیلہ وحقیقة الوسیلة الی اللّٰہ تعالیٰ، مراعاة سبیلہ بالعلم والعبادة وتحری مکارم الشریعة وھی کالقربة

یعنی کسی شے تک رغبت سے پہنچنا اور یہ وسیلہ وصیلہ (بالصاد) سے صرف بمعنے رغبت کے خصوصیت رکھتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ وابتغوا الیہ الوسیلہ سے مراد صراطِ مستقیم پر علم، عبادت اور مکارمِ شریعت (اعمالِ صالحہ) کے باوصف گامزن رہنا ہے اسلئے قربت کے معنی صحیح ہیں اور یہ

(والواسل الی اللہ الراغب الیہ) "الواسل" کے معنی اللہ سے رغبت و قرب رکھنے والا ہے۔

\+ \+ \+ \+

مفسر گرامی علامہ محمد بن جریر الطبری فرماتے ہیں:۔

(وابتغوا الیہ الوسیلۃ) اطلبوا القربۃ الیہ بالعمل بما یرضیہ والوسیلۃ الفعیلۃ عن قول قائل توسلتُ الیہ بکذا بمعنی تقربتُ الیہ۔

یعنی اللہ سے ایسے اعمال کے ساتھ تقرب چاہو جو اس کی خوشنودی کا باعث ہوں "الوسیلہ" علیٰ وزن "فعیلہ" ہے۔ مثلاً کوئی کہے میں اس سے قریب ہوا تو وہ توسل تقرب ہی کے معنی میں استعمال ہوگا۔

اس کی دلیل میں عنترہ کا شعر ہے ؎

ان الرجال لھم الیک وسیلۃٌ — ان یاخذوک تکحلی و تخضبی

لوگ تیرا قرب حاصل کرنے کے لئے تجھے لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے تو سرمہ اور مہندی سے بناؤ سنگھار کر لے

اس کی تائید میں دوسرا شعر ہے:۔

اذا غفل الواشون عُدنا لوصلنا — فعاد التصافی بیننا والوسائل

چغلخوروں کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر ہم ملنے کا سامان کر لیں گے اور پھر ہمارے درمیان تقرب و اخلاص لوٹ آئے گا

آگے لکھتے ہیں:۔

وبمعنی الذی قلنا قال بعض اہل التاویل ذکر من قال ذالک۔ حدثنا بشار عن سفیان عن ابی وائل ابتغوا الیہ الوسیلہ

یعنی ہماری طرح بعض اہل تاویل نے یہی معنی مراد لئے ہیں۔ چنانچہ بشار، سفیان سے اور سفیان ابو وائل سے راوی ہیں کہ۔ "الوسیلہ" سے مراد قربت ہے اعمالِ صالحہ

القربة فی الاعمال، وحدثنی سفیان ابی الجحہ عن ابی الآیۃ۔ فی المسئلۃ القربۃ وعن قتادۃ ای تقربوا الیہ بطاعۃ والعمل بما یرضیہ عن ابی حذیفۃ قال حدثنا مشبل عن ابن ابی نجیح عن مجاھد وابتغوا الیہ الوسیلۃ قال القربۃ۔

سے۔ اور اسی طرح سفیان ابوطلحہ سے اور وہ عطا سے راوی ہیں کہ اس آیت میں "وسیلہ" کے معنی قربت کے ہیں اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اُس کی خوشنودی کے کام کرکے اس سے تقرب حاصل کرو اور ابو حذیفہ، مشبل سے اور وہ ابن ابی نجیح سے اور حضرت مجاہد سے "الوسیلہ" کے معنی "القربت" ہی روایت کئے ہیں (تفسیر ابن جریر الطبری ص۵۵)

تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ:۔

(یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ) ای خافوا اللہ بترک المنھیات (وابتغوا الیہ) ای لا الی غیرہ (الوسیلۃ) الوسیلۃ الفضیلۃ من توسلت الیہ اذا تقربت الیہ والوسیلۃ القربۃ التی ینبغی ان تطلب وبہ قال ابو وائل، الحسن مجاھد قتادۃ والسدی وابن زید روی عن ابن عباسؓ وعطاء وعبد اللہ بن کثیر قال فی تفسیرہ ھذا الذی قالہٗ ھؤلاء الائمۃ لاخلاف بین المفسرین فیہ۔ والوسیلۃ ایضاً درجۃ فی الجنۃ مختصۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (البخاری)

یعنی ممنوعات ومکروہات کو چھوڑ کر خدا سے ڈرو۔ خدا کے سوا اور کسی سے نہیں۔ الوسیلہ علی وزن فعیلہ ہے۔ گویا توسلتُ الیہ

میں اس سے قریب ہوا بمعنی تقریب۔ اس لئے کہ "الوسیلہ" کے معنے "القربة" ہیں اور اللہ سے قربت ایسی نعمت ہے جسے ضرور مانگنا چاہیئے اور اسی طرح حضرت ابو وائل، حضرت حسن، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ سے مروی ہے اور السدی اور ابن زید، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عطاء روایت کرتے ہیں کہ الوسیلہ سے مراد اعمال صالحہ سے قرب خداوندی حاصل کرنا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ الوسیلہ کے اس معنی میں ان ائمہ مفسرین کو اتفاق ہے کسی ایک کو بھی اس تفسیر میں اختلاف نہیں رحمہم اللہ تعالیٰ و رضی عنہم (اس کے ساتھ ساتھ الوسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ منزل بھی ہے جو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے۔ اذان کے بعد جو دعا پڑھنے کا حکم ہے۔ اس میں ہے آت محمدن الوسیلة سے مراد جنت کا ایک درجہ ہے)۔

تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازی میں ہے۔ وابتغوا الیہ الوسیلة ای القربة بالعمل — یعنی الوسیلہ سے مراد عمل سے قربت حاصل کرنا ہے

علامہ ابن جریر الطبریؒ اور علامہ ابن کثیرؒ و علامہ رازی کی طرح سلف وخلف کے تمام مفسرینؒ "الوسیلہ" کے اس معنی پر اتفاق رکھتے ہیں کہ "الوسیلہ" سے اعمال صالحہ کے ذریعہ تقرب خداوندی حاصل کرنا ہے۔

ائمہ سلف میں امام ابن تیمیہؒ نے خاص طور پر مقالہ (الواسطة بین الخلق والحق) اپنے دیگر رسائل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالہ کے تحریر کرنے کا سبب یہی تھا کہ دو شخص آپس میں بحث کر رہے تھے، ایک کہتا تھا خدا اور بندہ کے درمیان کوئی وسیلہ یا واسطہ ضروری ہے اور دوسرا اسکے خلاف تھا۔ چنانچہ یہ مسئلہ امام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ امام ابن تیمیہؒ کے جواب کا

ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"اگر اس شخص کی مراد یہ ہے کہ خدا اور بندہ کے درمیان کوئی واسطہ ضرور ہونا چاہئے۔ جس سے بندوں کو یہ معلوم ہو کہ خدا کن اعمال سے ناخوش ہوتا ہے اور کن اعمال کو پسند فرما کر اپنے فرمانبردار بندوں پر انعام و رحمت کی بارش کرتا ہے اور کن نافرمانیوں اور بداعمالیوں سے بندے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ نیز اللہ کی ذات والاصفات کو کیا کیا نام زیبا اور شایانِ شان ہیں۔ ان تمام اُمور کی معرفت و ادراک سے عقلِ انسانی عاجز و درماندہ ہے۔ اس لئے کسی ذریعہ یا واسطہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چنانچہ اس قادرِ مطلق نے ہر دَور میں اپنے رسول یعنی فرستادہ بندے دُنیا میں بھیجے اور اس کے رسولوں پر ایمان لاکر عمل کرنے والے بلا شبہ راہِ ہدایت پر ہیں۔

واما سوال السائل عن القطب او الغوث والفرد فھذا قد یقولہ طوائف من الناس ویفسّرونہٗ باموں باطلة فی دین الاسلام مثل تفسیر بعضھم ان الغوث ھو الذی یکون من الخلائق بواسطة فی سفرھم وتھم فھذا جنس قول النصاریٰ فی المسیح بن مریم علیھما السلام والغالیة فی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فھذا کفر صریح ۔۔۔۔

دوسرے سائل کا یہ سوال کہ آیا کسی غوث، قطب اور فرد کے بغیر بھی خدا تک رسائی ممکن ہے تو یہ چیز اب عام ہو گئی ہے۔ بعض لوگ اس طرح بے بنیاد اور باطل اُمور کو اسلام کا جزو بنا رہے ہیں۔ بعض لوگ غوث کو ایسی طاقت مانتے ہیں جس کی وساطت سے امدادِ خلائق ہوتی ہے اور

یہ وہی غلو ہے جس نے ابن مریم کو ابن اللہ بنا دیا اور اس غلو سے حضرت علیؓ کو بھی نصیریوں نے یزدانی طاقتیں دے رکھی ہیں۔ نعوذ باللہ۔ یہ سراسر کفر ہے۔

ومن انکر ہٰذین فھو مرتد کافرٌ۔ اور جس نے توسل کے ان دو معانی سے انکار کیا وہ کافر ہے[1]۔ (ترجمہ میں تفصیل کم دی گئی ہے)

من جعل بینہٗ وبین اللہ الوسائط یتوکل علیھم ویدعوھم ویسئلھم کفر اجماعاً۔

یعنی جس نے اپنے اور خدا کے درمیان کسی کو ذریعہ بنا کر اس پر بھروسہ کیا اس کو پکارا اور اس سے حاجت طلب کی تو اس نے بالاجماع کفر کیا۔ (الجواب الکافی)

حضرت قتادہ نے فرمایا کہ خدا کی اطاعت اور اس کی مرضی کے مطابق اعمال سے اس کا قرب حاصل کرو۔ ابن زیدؓ نے یہی آیت تلاوت فرمائی تھی۔ (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

فیطلبون القرب من اللہ بالاخلاص و طاعتہ فیما یرضیہ وترک ما نھاھم عنہ واعظم القرب التوحید الذی بعث اللہ بہ انبیائہ ورسلہ واوجب علیھم العمل بہ والدعوۃ الیہ۔ وھو الذی یقربھم الی اللہ۔ ومن التوسل الیہ باسمائہ وصفاتہ کما قال تعالیٰ وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا وکما ورد فی الاذکار المأثورۃ۔ من التوسل بھا فی الدعوات اللھم انی اسئلک بان لک الحمد وغیر ذالک من الاعمال الصالحۃ الخالصۃ التی لا نسبۃ

[1] اعمال الخ اور حضورؐ اقدس کا روز محشر میں بسیلۂ شفاعت ۱۱

الشرك فالتوسل الی اللہ بما یحبہ ویرضاہ لا بما یکرھہ ویاباہ من الشرك الذی نزہ بہ نفسہ عنہ بقولہ (سبحٰن اللہ عما یشرکون)

قرب خداوندی اخلاص، طاعت اور ایسے اعمال سے مانگتے ہیں جن سے وہ راضی اور خوش ہو، نہ کہ ایسے اعمال جن سے اُس نے منع فرمایا ہے اور خدا سے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی وحدانیت کا اقرار ہے کہ اُس نے اس پیغام کے ساتھ اپنے انبیاء اور رسولوں کو بھیجا اس کا اُن کو حکم دیا اور یہی وہ ذریعہ ہے جو اُن کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ توسل کی ایک شکل یہ ہے کہ اس کو اس کے ناموں اور صفات کے وسیلہ سے پکارو۔ یہی اس نے حکم دیا ہے اور جیسا کہ بعض ادعیۂ ماثورہ میں ہے کہ اللھم انی اسئلك بان لك الحمد (اس دعا میں خدا کے سامنے اس کی تعریف کا وسیلہ لیا گیا ہے) اس کے علاوہ خدا سے قرب کا ذریعہ وہ نیک اعمال ہیں جو خالص اللہ کے لئے کئے گئے ہوں اور جن میں شرک کا شائبہ نہ ہو۔

خدا کا قرب ان ہی اعمال سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جس سے وہ راضی اور خوش ہو نہ کہ جن سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا ہو۔ خاص طور پر شرک جس سے اُس نے اپنی ذات کو پاک رکھا ہے (سبحان اللہ عما یشرکون)

نہ صرف مفسرین و ائمہ کرام بلکہ مزاج شناس رسولؐ حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی قرآن کریم کے معانی میں انتہائی احتیاط اور باریک بینی سے کام لیتے تھے۔ اس کے باوجود فرماتے ہیں: ای سماء تظلنی وای ارض تقلنی اذا قلت فی کتاب اللہ ما لا اعلم۔ "کونسا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کون سی زمین مجھے پناہ دے گی اگر میں کتاب اللہ سے وہ معنی بیان کروں

جو میں نہیں جانتا۔" اور ان اہلِ بدعت کی یہ جرأت کہ کتاب اللہ کو اپنی خواہشات کا تابع بنانا چاہتے ہیں۔

تفاسیر اور اقوال ائمہ سے یہ بات آفتاب کی طرح روشن اور ثابت ہے کہ الوسیلہ کا جو لفظ قرآن پاک میں آیا ہے اُس سے مراد "اعمال صالحہ" کے ذریعہ قربِ خداوندی حاصل کر کے اُس کی رحمتوں کا سزاوار بننا ہے۔ اہلِ بدعت الوسیلہ سے جو یہ مراد لیتے ہیں کہ کسی ولی، قطب اور پیر کو قربِ خداوندی کا ذریعہ بنایا جائے یا مشکل کشا اور حاجت روا مانا جائے تو یہ اُن کی اختراعِ نفس اور بدترین قسم کی "تفسیر بالرائے" ہے۔ جس سے ایک طرف تو اس آیت کی معنوی تحریف ہوتی ہے اور دوسری طرف شرک و بدعت کے لئے میدان ہموار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان فتنوں سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے (آمین)

"الوسیلہ" قرآن کی روشنی میں

اہلِ بدعت ایک طرف اگر صرف اس ایک آیت وابتغوا الیہ الوسیلہ کا بزعمِ خود سہارا لے کر اور قرآنِ کریم میں معنوی تحریف کر کے بعد کسی ولی، قطب یا شہید کی ذات مراد لیتے ہیں۔ جس سے الٰہی الشرک فی الذات والصفات (باری تعالیٰ)، قبر پرستی و پیر پرستی کی راہیں کھلتی ہیں اور غیر اللہ کی نذر و نیاز، عرس، مزامیر اور مشرکانہ اشعار سے تخیل [illegible] کا موقع ملتا ہے تو دوسری طرف ہمارے کا سارا قرآن کریم ہے۔ جس کی شانِ نزول ہی شرک و بدعات کا قلع قمع کرنا اور بندوں کا صرف خدا سے عابد و معبود کی حیثیت سے رشتہ قائم کرنا ہے کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حضورؐ کی ساری زندگی شرک و بدعات کے خلاف دعوت و تبلیغ سے اقوال و اعمال سے سیرت و کردار سے، جہاد میں گذری۔ ولقد [illegible] رسول [illegible]

اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔ اس "طاغوت" سے مراد صرف پتھر کے صنم ہی نہیں بلکہ ہر وہ شے یا ذات ہے جس کو رب العالمین کی سوا معبود مان لیا گیا ہو۔

کیا "الوسیلہ" سے اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ توحید کے پرستار ایک بار پھر ہزار ہا "پرستیوں" میں مبتلا ہو گئے۔ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں سے خراج وصول کرنے والے بزرگوں کی قبروں کی آمدنی پر جی رہے ہیں، لات منات کی جگہ مقبروں اور تعزیوں نے لے لی ہے اور ان عقائد کے حاملوں کے اعمال و کردار میں، اقوال و گفتار میں زمانۂ جاہلیت کے مشرکین سے کس درجہ شرمناک مشابہت پائی جاتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت کے مشرکین بھی ذات باری تعالیٰ کے منکر نہ تھے۔ لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ اور وہ بتوں کو قربِ خداوندی کا وسیلہ بنا کر اُن کی پرستش کرتے تھے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ موجودہ دور میں قبر پرستی اور پیر پرستی کے لئے اہلِ بدعت بھی یہی غرض بتاتے ہیں۔

اہلِ بدعت کی اس غلط فہمی کا ازالہ تو خود قرآنِ کریم ہی کی آیات سے ہوتا ہے:۔

(الف) وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو پکارے اللہ کے سوا کسی ایسے کو کہ نہ پہنچے اُس کی پکار کو روزِ قیامت تک اور اُنکو خبر نہیں اُن کے پکارنے کی اور جب لوگ جمع ہوں گے تو اُن کے پوچھنے کے سبب اُنکے

وَّكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ۔ (الاحقاف) — وہ دشمن ہوں گے۔

(ب) قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا (الرعد) — کہو، پھر کیا تم نے بنا رکھے ہیں اس (یعنی اللہ تعالیٰ) کے سوا ایسے حمایتی جو مالک نہیں اپنے بھلے برے کے۔

(ج) لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ۔ (الرعد) — اُسی کو پکارنا سچ ہے اور جن لوگوں کو پکارتے ہیں اُس کے سوا وہ کام نہیں آتے اُن کے کچھ بھی۔ مگر جیسے کسی نے اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے کہ اُس کے مُنہ تک آپہنچے اور وہ کبھی نہ پہنچے گا اُس تک۔ جتنا پکارنا ہے کافروں کو وہ سب گمراہی ہے۔

(د) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (ص) فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا۔

الوسیلہ کے اس غلط مفہوم کے خلاف سارا قرآن کریم موجود ہے۔

بفرضِ محال اگر "الوسیلہ" کا یہی مفہوم جائز ہوتا اور حقیقی ہوتا تو کوئی معمولی سُوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کسی ولی، قطب، غوث کی ذات کو افضل و ارفع قرار نہیں دے گا اور نہ کوئی انسان خدا کے نزدیک آپؐ سے بڑھ کر معزز و مقرب اور محبوب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا دنیا میں یہ مرتبۂ بلند اگر کسی کو ملتا تو وہ صرف محمد بن عبد اللہ علیہ السلام ہی کی ذاتِ گرامی ہوتی۔ لیکن ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

(۱) قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ۝ قُلْ إِنِّي لَن يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَدًا

تو کہہ میرے اختیار میں نہیں تمہارا بُرا اور نہ راہ پر لانا۔ تو کہہ مجھ کو نہ بچائیگا اللہ کے ہاتھ سے کوئی اور نہ پاؤنگا اسکے سوا کہیں سرک رہنے کو جگہ

(۲) قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۝ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۝

کہہ دے۔ میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

(۳) لو كنت اعلم الغيب لاستكثرت من الخير وما مسني السوء۔

اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی برائی نہ پہنچتی۔

(۴) قل انما انا بشر مثلكم يوحى الي انما الهكم اله واحد فمن كان يرجوا لقاء ربه فليعمل عملا صالحا ولا يشرك بعبادة ربه احدا۔

کہہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم۔ حکم آتا ہے مجھ کو کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے تو پھر جس کو امید ہو اپنے رب سے ملنے کی، سو وہ کرے نیک کام اور شریک نہ کرے اپنے رب کی بندگی میں کسی کو۔ (کہف۔ آخری رکوع)

ان آیات کی روشنی میں سرورِ کائنات و فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات و محبوب رب العالمین کو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں۔ (آخری آیت میں آپؐ کی بشریت، توحید باری تعالیٰ کی دعوت اور اعمال صالحہ کی تلقین و شرک فی العبادت سے پرہیز کا اظہار ہے) تو پھر کسی پیر، قطب اور ولی کی کیا ہستی ہے جو کسی کی مشکل کشائی یا حاجت روائی کر سکیں۔

تقرب و محبوبیت، افضلیت و اکملیت کے باوصف آپؐ کے عمل و خوف کا یہ عالم احتیاط و فروتنی کی یہ حالت کہ اگر کہیں کسی مقام پر بھی بوبیت

سے رسالت کی حدود کا ٹکراؤ دیکھ پائیں تو خشیتِ الٰہی سے لرز کر فرمائیں:۔

اتجعلنی للّٰہ ندًا؟ لا تقولوا ما شاء اللّٰہ وشاء محمد بل قولوا ما شاء اللّٰہ وحدہٗ۔

یعنی ایک شخص کے یہ کہنے پر کہ "اللہ چاہیں اور آپ چاہیں" حضورؐ نے عتاب کا اظہار فرمایا اور کہا کہ کیا تم نے مجھے خدا کا شریک بنا دیا؟ یوں مت کہو کہ "جو اللہ اور محمدؐ چاہے" بلکہ یوں کہو کہ "جو اللہ تعالیٰ تنہا چاہے"۔

ایک متوازن سے متوازن انسان بھی اپنی تعریف سُنکر خوش ضرور ہوتا ہے۔ خواہ زبان سے اظہار نہ کرے۔ لیکن رحمۃ اللعالمین کا یہ تقویٰ کہ اگر آپؐ کو جان نثاران توحید انت سیدنا؟ کہیں تو فرمائیں بل السید ھو اللّٰہ گویا رسالت کی حد تک تو اپنی عظمت و تعریف برداشت ہے ورنہ شرک فی الصفات کے خوف سے اتنا غلو بھی گوارا نہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا تطروني كما اطرت النصارىٰ المسيح بن مريم عليهما السلام انما انا عبدہٗ ورسولہٗ۔

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا سألت فاسئل من اللّٰہ واذا استعنت فاستعن باللّٰہ (مشکوٰۃ)

تم کو کچھ بھی مانگنا ہو خدا سے مانگو اور جب بھی مدد چاہتا ہو تو خدا ہی سے مدد چاہو۔

اس لئے کہ خدا کے سوا کسی کو بھی مشکل کشا یا حاجت روا سمجھنا اُلٰی خدائی میں اس کو شریک کرنا ہے اور اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ کے ساتھ اِنَّ اللّٰہَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ ایک

اٹل فیصلۂ ربانی ہے۔ اس "ذنب لا یغفر" سے بچنے کے لئے شرک کی بعید تر مشابہت سے بھی اجتناب کرنا چاہئے کہ یہی ایمان اور توحید کا تقاضا ہے۔

اس طرح اگر کسی کے مزار پر عرس منانے، چراغاں کرنے اور نذر و نیاز کی اجازت ہوتی تو اس کے لئے بھی صرف حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا روضۂ اقدس ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ فتنۂ قبور کی خطرناکی اور غلو فی الانبیاء والصالحین کے نتائج حضور کے پیش نظر تھے اس لئے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آپؐ نے تاکید فرمائی کہ لا تجعلوا قبری عیداً "میری قبر کو عید (میلہ) نہ بنا لینا۔"

انہی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے آپؐ نے یہ دعا فرمائی "اللّٰھم لا تجعل قبری وثناً یعبد" الٰہی میری قبر کو بُت نہ بنانا کہ اس کی پرستش کی جائے "وثن" کا معنوی اطلاق ہر اس شے پر ہو سکتا ہے جسے خدا کے سوا معبود بنا لیا جائے۔ حضورؐ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا:۔

ایاکم والغلو فانما اھلک من کان قبلکم الغلو۔ (الحدیث)	خبردار! غلو سے ہمیشہ بچنا اس لئے کہ تم سے قبل جو لوگ تھے وہ اس غلو سے تباہ کئے گئے۔

آج نافرمانی کا یہ عالم ہے کہ ہماری نظروں سے ایسے اشعار بھی گذرتے ہیں جن کی نقل سے بھی ہاتھ لرزتے ہیں۔ ؎

ہمارے سرورِ عالم کا رتبہ کوئی کیا جانے	خدا سے ملنا جو چاہے محمدؐ کو خدا جانے
وہی جو مستویِ عرش تھا خدا ہو کر	اُتر پڑا ہے مدینے میں مصطفےٰ ہو کر

نعوذ باللہ من ذالک۔ اس مشرکانہ ذہنیت کے لوگوں کی اس مبالغہ آمیزی سے خود سرورِ کائناتؐ کی روحِ پاک کو کس قدر اذیت ہو گی — "ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبینا؟" — لا تطرونی

کما اطرت النصاریٰ ابن مریم المسیح" کی نافرمانی کے لئے اس سے بڑی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس غلو فی الانبیاء نے عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ اور عزیر علیہ السلام کو بھی خدا کا بیٹا بنا کر نصاریٰ اور یہود کو قہرِ الٰہی کی نذر کیا اور یہی غلو مسلمانوں کو بھی تباہی کے گڑھے کی طرف لے جا رہا ہے۔

"الوسیلہ" کا یہی مفہوم اگر صحابہ کرامؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی لیا کرتے تو وہ بھی تقویٰ، صالحیت، عبادات، سب چھوڑ کر حضور اقدسؐ ہی کی ذاتِ گرامی کو قربِ خداوندی کا ذریعہ بنا لیتے اور روضۂ اقدس کی مجاوری اُن کا پیشہ ہوتا۔ لیکن آثارِ صحابہؓ میں بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ ان مقدس ہستیوں کے اتقاء اور اتباعِ سنت پر سختی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمرؓ نے وہ درخت ہی کٹوا دیا جس کے سایہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت صلح حدیبیہ لی تھی۔ اس میں محض شرک کا خوف کارفرما تھا۔ اس لئے کہ بعض لوگ قصداً اس درخت کے سایہ میں نماز پڑھنے جانے لگے تھے۔

معرور بن سویدؓ فرماتے ہیں۔ "میں نے ایک بار حضرت عمرؓ کے ساتھ مکہ کے راستہ میں صبح کی نماز پڑھی۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک طرف جا رہے ہیں۔ دریافت فرمایا۔ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ عرض کیا گیا۔ یا امیر المومنین! یہاں ایک مسجد ہے جہاں رسول اللہؐ نے نماز پڑھی تھی۔ یہ لوگ وہاں نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔

انما ھلک من کان قبلکم بمثل ھذا یتبعون آثار انبیائھم ویتخذونھا کنائس وبیعاً۔

تم سے پہلے لوگ اس لئے ہلاک ہوئے کہ اپنے انبیاء کے آثار کی بھی اتباع کرتے تھے حتیٰ کہ ان کو عبادت گاہ (کلیسا اور معبدِ یہود) بنا کر چھوڑا۔

ایک بار حضرت عمرؓ ہی نے بھرے مجمع میں دعا فرمائی :-

اللّٰھم انا کنا اذا اجدبنا توسلنا بنبینا فتسقینا وانا نتوسل بعم نبینا فاسقنا فیسقوا (بخاری)

الٰہی پہلے جب قحط پڑتا تھا تو ہم اپنے نبی کے توسل سے پانی مانگتے تھے اور تو ہمیں سیراب کر دیا کرتا تھا۔ اب ہم اپنے نبی کے عمِ محترم (عباس بن عبد المطلبؓ) کے توسل سے پانی مانگتے ہیں تو انھیں سیراب کر۔ چنانچہ بارش ہوگئی۔ (بخاری)

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نبیؐ کریم کی حیات طیبہ میں تو صحابہؓ کرام نے آپ کا وسیلہ لیا۔ مگر بعد وفات نہیں لیا۔ اس کی تائید میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

"اللہ سے کسی کا وسیلہ لینا جائز نہیں۔ اس کو اس کے نام و صفات سے پکارو۔ بلکہ یہ بھی درست نہیں کہ الٰہی بحقِ فلاں نبی یا فلاں فرشتہ میری حاجت روائی کر۔" (درمختار)

خانوادۂ نبوی کے چشم و چراغ سیدنا زین العابدین (حسن بن حسینؓ) نے ایک شخص کو دعا و سلام کی غرض سے قبرِ اقدس کے پاس جانے سے منع فرمایا اور کہا :-

الا احدثکم حدیثا سمعتہ عن ابی عن جدی قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا تجعلوا قبری عیداً۔ ولا تجعلوا بیوتکم قبوراً فصلوا تکم تبلغنی حیث کنتم

کہ مجھ سے میرے پدر بزرگوار نے جدِ محترم سے روایت کی ہوئی حدیث بیان کی ہے۔ کیا میں تمہیں نہ بتادوں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا میری قبر کو میلہ نہ بناؤ اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنالو۔ تمہارا درود و سلام تم جہاں بھی رہو، مجھے پہنچتا رہے گا۔

دراصل زمانۂ جاہلیت میں غلو فی الانبیاء والصالحین نے بت پرستی اور قبر پرستی عام کی تھی اور یہی غلو فی الاولیاء والصالحین آج بھی بعض مسلمانوں کو گمراہی کی طرف لے جا رہا ہے۔

"الوسیلہ" کا مفہوم اور اولیاء اللہ

ہم نے جن اولیاء کرام کے نام سُنے اور تصانیف دیکھی ہیں اُن میں سے کسی ایک نے بھی "الوسیلہ" کا یہ مفہوم لے کر شرک و بدعت کا دروازہ نہیں کھولا اور نہ وہ مقدس بزرگ ان اہلِ بدعت کے ذمہ دار ہیں۔

فتوح الغیب میں شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں:۔

"اپنی تمام حاجتیں اللہ کے حضور پیش کرو اور تمام خلقت سے منہ موڑ کر اُس کے آگے جھک جاؤ۔ اپنے دلوں کو غیر اللہ سے پاک رکھو اور اس کے سوا کسی سے نفع نقصان کی امید نہ رکھو" (الفتح الربانی)

اس کے علاوہ غنیۃ الطالبین شیخ جیلانی کی مشہور کتاب ہے جس میں بھی بدعتوں سے احتراز کی سخت تاکید پائی جاتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کے یہاں بھی ولایت و بیعت کا سلسلہ جاری تھا۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"مشرکین نے بتوں کو روحوں کی توجہ کا مرکز قرار دے رکھا تھا اور آج مسلمان قبروں کو سمجھتے ہیں" (فوز الکبیر)

"انبیاء و اولیاء ہمہ بندگان خدا اند و خلے و تصرفے در کار خانہ جات الٰہی نہ دارند نہ در حیات نہ بعد ممات" (البلاغ المبین)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:۔

"دفع شر یا نفع لانے کے لئے غیر اللہ کو پکارنا اور اُن کو صاحبِ اختیار

سمجھنا شرک ہے۔" (تفسیر عزیزی)

"استغاثة المخلوق بالمخلوق کاستغاثة المسجون بالمسجون" [illegible]

"استمداد و استعانت از اہل قبور بہر نہج کہ باشد جائز نیست۔" (فتاوی)

"انبیاء اولیاء کی قبروں کو سجدہ کرنا، طواف کرنا، اُن سے مراد مانگنا،

نذر و نیاز کرنا یہ سب ناجائز حرام و ناجائز ہے۔" (مالا بدمنہ)

منهم الذين يدعون الانبياء والاولياء عند الحوائج

والمصائب باعتقاد أن ارواحهم حاضرة تسمع النداء و

تعلم الحوائج وذالك شرك قبيح وجهل صريح قال الله

تعالى ومن اضل ممن يدعوا من دون الله (توشیح بحوالہ فاران)

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد سلطان العارفین

قاضی حمید الدینؒ ناگوری فرماتے ہیں:۔

"وہ لوگ جو انبیاء اور اولیاء کو حاجتوں اور مصائب میں اس اعتقاد

کے ساتھ پکارتے ہیں کہ اُن کی روحیں حاضر ہوتی ہیں اور پکارنیوالوں

کی ندا سُنتی ہیں اُن کی حاجتیں جانتی ہیں تو یہ شرکِ قبیح اور جہلِ صریح

ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں اُنسے بڑھ کر

گمراہ کون ہوگا"؟

اسی طرح دیگر اولیاء اللہ نے شرک فی الذات والصفات باری

تعالیٰ کو حرام قرار دیا ہے اور اُن کے اقوال و اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان

بزرگوں نے ہمیشہ قرآن و سنّت کو اپنا لائحۂ عمل بنایا اور ردِ شرک و بدعت

کے ساتھ توحید کی علمبرداری کرتے ہوئے اُن کی ساری کی ساری زندگیاں

عبادت، تقویٰ اور ریاضت سے تزکیۂ نفس میں گذر گئیں۔ (رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین)

معلوم یہ ہوا کہ "الوسیلہ" کا غلط مفہوم لے کر اُن مشرکانہ رسوم کو اولیاء اللہ کی خوشنودی کے لئے ادا کرنا ان مقدس ہستیوں پر سراسر تہمت جوڑنا ہے۔ بلا شبہ ان صالحین کی ارواح کو بھی اس لغو سرائی سے اذیت ہوتی ہوگی کہ:- ؎

بہ گرداب بلا افتاد کشتی
مدد کن یا معین الدین چشتی

حقیقت میں دیکھو تو خواجہ خدا ہے ✣ ہمیں در پہ خواجہ کے سجدہ روا ہے

شیئاً للہ چوں گدائے مستمند
المدد خواہم ز خواجہ نقشبند

نعوذ باللہ من ہذہ الهفوات ونستغفرہٗ۔

قرآنِ پاک کی یہ آیت کس طرح دو ٹوک فیصلہ کرتی ہے:-

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔

یعنی اے پیغمبر! جب میرا کوئی بندہ تم سے میرے متعلق دریافت کرے کہ (وہ کیونکر مجھ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے) تو تم اس کو بتا دو کہ میں تو اُسکے پاس ہی ہوں (دُور نہیں کہ رسائی کے لئے کسی ذریعہ اور سفارش کی ضرورت ہو) اور میں اُس کی پکار سنکر قبول کرتا ہوں۔

اس آیت کے بعد غیر اللہ سے استمداد، استعانت اور استغاثہ کے لئے کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ یہ وہ اقرار ہے جو خدا اور بندے کے درمیان خالق و مخلوق اور حاکم و محکوم کا رشتہ قائم کر دیتا ہے۔ یہ وہ تعلق ہے جو "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" کہتے ہی صرف ایک ذات کو استعانت و استعباد کا مستحقِ اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے غیر اللہ کے خوف اور بندگی کا طوق انسانیت کی گردن سے اُتار دیتا ہے اور اس حقیقت کے ادراک

کے بعد ہی إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کا صحیح لطف آتا ہے۔

اس سے بڑھ کر ناشکری اور ظلم کیا ہوگا کہ اس قادرِ مطلق کیساتھ اُس کے بندوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھیرایا جائے۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ؟ قرآنِ کریم موجود ہے اور انسان عقل سے بھی محروم نہیں ہوا ہے اگر متاعِ ہوش و خرد بھی غیر اللہ کی نذر نہ کی گئی ہو تو "أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ" کی تمثیل قرآنِ کریم میں نظر آتی ہے :-

وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ۔ الخ وَذَا النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا الخ

ان انبیاء کی مثالوں سے اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کو پکارنے والوں پر حجت تمام کردی ہے۔

أَلَا إِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ شُرَكَاءَ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ۔

یاد رکھنا چاہئے کہ وہ تمام ہستیاں جو زمین و آسمان میں ہیں، سب اللہ ہی کی تابعدار اور فرمانبردار ہیں اور جو لوگ اللہ کے سوا (اپنے بنائے ہوئے) معبودوں کو پکارتے ہیں تم جانتے ہو وہ کس کی پیروی کرتے ہیں (یقین و بصیرت کی نہیں) وہ تو محض وہم و گمان کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ کہہ دو (ہر بات میں) اپنی اٹکلیں دوڑاتے پھرتے ہیں۔

وما بعد الحق الا الضلال ۔ حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے ۔

عالم اسلامی میں آج کتنے مسلمان ایسے ہیں جو کلمۂ حق لا الہ الا اللہ کے عملی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہوں، کوئی پیر پرستی میں مبتلا ہے تو کوئی نجومیوں اور اشتہاری پامسٹوں کے ہاتھوں توہم پرستی سے ایمان فروشی کر رہا ہے، کسی کو مفاد پرستی سے فرصت نہیں تو کوئی اقتدار کے نشے میں نفس پرستی کر رہا ہے اور موجودہ دور کا سب سے بڑا فتنہ یہی ہے ۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا ۔

مولانا شیخ احمد

قبر پرستی

"قبر" ـــ سب جانتے ہیں کہ یہ لفظ عام طور پر اُس دو گز زمین کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں مُردہ دفن کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی بدیہی و یقینی بات ہے کہ دُنیا میں ہمیشہ توحید و رسالت اور آخرت ہی کا نہیں، بلکہ وجودِ باری تک کا انکار کیا گیا ہے اور آج بھی بہت سے لوگ اس کے منکر ہیں۔ مگر موت کا انکار نہ پہلے کسی نے کیا اور نہ قیامت تک اس کا انکار کرنے والا کوئی پیدا ہو گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ جہاں چار گھر بھی زندہ انسانوں کے بنے ہوتے ہوں وہاں مُردوں کے مکانات بھی بنیں۔ چنانچہ ہر خورد و کلاں، ہر امیر و غریب، ہر عالم و عامی اور ہر ولی و نبی کی قبریں زندہ انسانوں کے مسکونہ مکانات کے پہلو بہ پہلو بنتی چلی گئی ہیں اور کوئی بستی ان دونوں قسم کے مکانات سے خالی نہیں پائی جاتی۔ مگر ہر طبقہ اور ہر مرتبہ و مقام کے مُردہ انسانوں میں سے خصوصیت کے ساتھ صوفیاء و اولیاء کی قبریں زیادہ اعتنا کے لائق قرار پاتی رہی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ تمام انسانوں کی طرح صوفیا و اولیاء بھی موت کا مزہ چکھتے ہیں اور زمین میں دفن ہوتے ہیں اور اُن پر بھی دوسروں کی طرح منوں مٹی ڈال دی جاتی ہے اور دوسروں ہی کی طرح قبر بھی بنا دی جاتی ہے۔ مگر اس جماعت کے بھی چند خاص خاص افراد

کی قبروں پر عامۃ الناس کی توجہ زیادہ سے زیادہ مرکوز ہونی شروع ہوتی ہے اور چند ہی دنوں میں کہیں محض اینٹ پتھر اور چونہ گچ اور کہیں نہایت قیمتی پتھروں سے قبر پختہ کر دی جاتی ہے اور دوسری قبروں کے مقابلہ میں دیکھتے دیکھتے یہ قبریں نمایاں اور ممتاز ہو جاتی ہیں۔

پھر قبر کے اطراف ایک کٹہرا تیار ہوتا ہے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ کہیں معمولی عمارت اور کہیں نہایت مضبوط قبے تعمیر ہو جاتے ہیں۔ یہ قبے کہیں کہیں تو اتنے بلند و بالا اور ایسے عظیم الشان ہوتے ہیں کہ باقاعدہ آثارِ قدیمہ میں داخل کر لئے جاتے ہیں۔ پھر اُن میں فنِ تعمیر کی ایسی ایسی نادرہ کاری پائی جاتی ہے کہ محض آثارِ قدیمہ و فنِ تعمیرات سے دلچسپی لینے والوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ہر آیند و روند کی توجہات کا مرکز بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس طرح ایک ایک قبر نے کئی ایکڑ زمین کو مستقل طور پر گھیر لیتی ہے اور رفتہ رفتہ گنبد کے آس پاس دوسری عمارتیں بننے لگتی ہیں اور چھوٹی موٹی سی نوآبادی بس جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ قبریں عوام کی توجہات کا ایسا بڑا مرکز و مرجع بنتی ہیں کہ جوق در جوق لوگ وہاں کھنچے چلے جاتے ہیں۔ توجہات کی اس درجہ مرکزیت و مرجعیت کے بعد ناممکن ہے کوئی طبقہ ایسا پیدا نہ ہو جو ان توجہات کو کنٹرول کرے اور اس مرجعیت و مرکزیت سے فائدہ اُٹھائے۔ چنانچہ بہت سے لوگ قبروں کی خدمت کا منصب سنبھال بیٹھتے ہیں اور "خادم"۔ "جاروب کش" "مجاور" اور "سجادہ نشین" وغیرہ مختلف القاب سے پکارے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو ایسے ایسے اعزازات حاصل ہوتے ہیں کہ کسی کو ان کی عملی زندگی اور ان کے عام مشاغل پر نظر کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ محض قبر کی نسبت یا اس کی خدمت ہی انھیں سب کچھ بنا دیتی ہے۔ انھیں ہر زائر و سیاح سے

بھی کچھ نہ کچھ نذرانہ لینے کا حق ہوتا ہے اور قبر کی نسبت یا خدمت کا نام لیکر لوگوں سے چندہ مانگنا بھی جائز ہوتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات اُنکی مالی حالت پوری بستی کے لوگوں سے بہتر ہوتی ہے اور نہایت عیش و آرام سے گذرنے لگتی ہے۔ مگر ان لوگوں کے لئے اتنے ہی پر اکتفا کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے وہ قبر کی نسبت کے ساتھ ساتھ صاحبِ قبر سے بھی کوئی نہ کوئی نسبت پیدا کر لیتے ہیں یا کسی نہ کسی سلسلۂ تصوف سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ تاکہ دُنیوی اعزاز و اکرام کے ساتھ ساتھ روحانی و دینی پیشوائی کا مقام بھی حاصل ہو جائے اور "روحانیت" کے پردہ میں اتنا کچھ مل جائے جتنا عام دنیا داروں کو بھی بمشکل ملا کرتا ہے۔

چنانچہ عوام الناس ہی کے ذریعہ یہ معزز و مکرم نہیں ہیں۔ بلکہ مسلم حکومتیں بھی اُن پر اتنی نظرِ عنایت فرماتی رہی ہیں کہ انھیں بڑی بڑی جاگیریں اور جائدادیں ملی ہیں اور انہیں سے کتنے ایسے ہیں کہ مذہبی و روحانی مشیخت تو خیر اُن کی دُنیوی ریاست اور مادّی منفعت ہی کو پکّے دنیا دار بھی حرص و طمع کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بڑے بڑے سرمایہ دار اور کارخانہ دار بھی اُن سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے۔

اچھا اب قبر کے پاس تشریف لے چلیں۔ مگر کتنی ہی قبریں ایسی ہیں کہ اصل قبر سے فرلانگ دو فرلانگ اُدھر ہی آپ کو اپنی جوتیاں چھوڑنی پڑیں گی۔ آپ چاہے عام قبروں پر سے جوتیوں سمیت ہی کیوں نہ گذر جائیں۔ مگر یہاں آپ اپنی جوتیاں قبر کے پاس بھی نہیں لیجا سکتے اجی یہاں تو چاروں طرف جھنڈے ہی جھنڈے اور نشان ہی نشان نظر آتے ہیں۔ جی ہاں! چاہے سیکڑوں غریب غرباء کے بدن جاڑے سے کے دوتیں

لباس کی کمی کے باعث ٹھٹھر رہے ہوں اور ان میں کوئی اکڑ کر اپنی جان دے دے۔ بہر حال سیکڑوں گز کپڑا یہاں نشانوں میں صرف ہوتا رہتا ہے۔

آپ احاطۂ گنبد کے صدر دروازے سے لیکر مزار شریف تک " نہ جائے گا اس در سے کوئی بھی خالی " اور " نیست کعبہ در دکن جز درگہ بندہ نواز " وغیرہ کی قسم کے سیکڑوں فقرے اور اشعار بھی پڑھتے جائیے ۔۔ اندر چلئے ۔۔ سبحان اللہ، یہاں کی پوری فضا عود، لوبان اور دوسری خوشبوؤں سے کس درجہ معطر ہے اور مزار شریف پر کتنے قیمتی غلاف چڑھے ہوتے ہیں۔ افوہ ۔۔ اس درجہ قیمتی کپڑے تو صرف شاہانِ سلف نے پہنے ہونگے یا پھر موجودہ دور میں امیر امراء کے گھرانوں میں پہنے جاتے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ غرباء و مساکین نے تو انھیں خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ خیر۔ وہ خواب میں دیکھیں یا نہ دیکھیں، وہ یہاں بیداری میں تو دیکھ سکتے ہیں۔

اور مزار پر پھول بھی کس کثرت سے چڑھائے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گلستانوں اور پھلواریوں کو لاکر یہاں اُلٹ دیا گیا ہے۔ ارے ۔۔ یہ زائر صاحب تو چوکھٹ ہی کو بوسہ دے رہے ہیں اور یہ کیا؟ یہ صاحب تو قبر کے گرد بھی گھوم رہے ہیں۔ ارے۔ یہ تو قبر کو بھی چوم رہے ہیں۔ کبھی سر رکھے دیتے ہیں اور کبھی آنکھیں۔ ارے۔ یہ تو عجیب عجیب بے معنی حرکات بھی کر رہے ہیں۔ خدا نخواستہ انھیں کچھ جنون تو لاحق نہیں ہوگیا ہے؟ خیر۔ یہ حرکات بے معنی ہیں یا با معنی اور یہ صاحب مجنون ہیں یا عقلمند اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوتا رہے گا۔ آپ نے قبر کے اُوپر کاغذوں کے لٹکتے ہوئے پُلندے نہیں دیکھے؟ ۔۔ ارے یہ تو باقاعدہ درخواستیں اور التجائیں ہیں۔ کسی میں لکھا ہے کہ روزگار دلوائیے۔ کسی میں تحریر ہے

کر اولاد دیجئے۔ کسی میں مقدمہ جتوا دینے اور مرض کو دُور کر دینے کی فرمائش ہے۔ کسی میں آفات وبلیات کو ٹال دینے اور بدقسمتی کو خوش قسمتی سے بدل دینے کا مطالبہ ہے ۔۔ یہ صاحب تو اُلٹے پاؤں دروازہ کی طرف جا رہے ہیں ۔۔ جی ہاں ۔ جاتے ہوئے مزار کی طرف پشت ہوتی ہے نا ۔۔ اور اِدھر دیکھئے یہ بیچاری اللہ کی بندی قبر کی طرف رُخ کئے سجدہ ہی میں پڑی ہوئی ہے ۔ اب چلئے یہاں عورتوں کی گذر بھی ہے۔

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان مزاروں پر کہیں کہیں ہفتہ واری اور ماہانہ اور بالعموم سالانہ ایک میلہ لگتا ہے ۔ ان میلوں کی شان صاحبِ قبر کے شایانِ شان مذہبی جلسوں اور سیاسی تقریبات سے بھی کچھ اُونچی ہوتی ہے ۔ آرائش وزیبائش اور اہتمام وانتظام شان و شوکت اور وسعت وکثرت کے لحاظ سے یہ اپنی آپ نظیر ہیں ۔۔۔ ان موقعوں پر ہزاروں، لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے ۔ جو نہ معلوم کن کن جیبوں سے نکل کر کن کن طریقوں سے آتا اور چلا جاتا ہے ۔ عام بولی میں ان میلوں کو "عرس" کہا جاتا ہے ۔ جس کے معنی عربی زبان میں "شادی" کے ہیں ۔ ایک شخص اس خوشی کے موقع پر انفرادی طریقہ سے جتنا کچھ خرچ کر سکتا ہے اور کرتا ہے وہ ظاہر ہے ۔ پھر جب سیکڑوں ہزاروں لاکھوں افراد اجتماعی طور پر عرس کریں تو جو کچھ بھی خرچ ہو جائے وہ کم ہی ہے ۔ یہ اعراس کہیں کہیں ایک دن کے لئے اور کہیں کہیں آٹھ آٹھ دس دس دن کے لئے منعقد ہوتے ہیں اور ان کے لئے اشتہارات اور پوسٹروں سے لے کر دعوت ناموں تک تمام وسائلِ نشر واشاعت استعمال کئے جاتے ہیں اور یوں بھی ان کی تشہیر کی اتنی

ضروری نہیں ہے۔ لوگ خود ہی ان تاریخوں کو جانتے ہیں جن میں اُنھیں کسی مزار پر حاضر ہونا ہے۔

اس کے لئے وہ سال سال بھر سے پیسہ پیسہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ پیسہ نہ ہو تو قرض اُدھار کرتے ہیں اور بسا اوقات تن کے کپڑے اور برتنے کی چیزیں تک گروی رکھ دیتے ہیں۔ اپنے ضروری سے ضروری کاموں کا ہرج کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں سب سے زیادہ ضروری کام کے لئے جانا ہوتا ہے۔ اپنے مصارف سفر کا بندوبست کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر اس مصرف کا بندوبست نہ ہوا تو پھر آمدنی کے سارے راستے ہی بند ہو جائیں گے اور ٹھیک وقت پر مزار شریف کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

اس جمِ غفیر میں آپ ہر خورد و کلاں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں سمجھدار بھی ہیں اور بے سمجھ بھی۔ آوارہ اور بدمعاش بھی ہیں اور سیدھے سادے بھولے بھالے بھی۔ جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔ معذور بھی ہیں اور بیمار بھی۔ داڑھی والے بھی ہیں اور داڑھی منڈے بھی۔ نمازی بھی ہیں اور بے نمازی بھی۔ غریب بھی ہیں اور امیر بھی۔ خوش حال بھی ہیں اور بدحال بھی۔ کوئی تو چیتھڑے لگائے ہوئے آگیا ہے اور منہ سے پھونک پھونک کر آگ جلا رہا ہے تاکہ روٹی کی ٹکیہ پکائے اور پیٹ کی آگ بجھائے۔ یہاں کی رنگا رنگی تو بس دیکھنے ہی کے لائق ہے۔

ارے! اس جمِ غفیر میں عورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کتنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو اپنے ساتھ لائی ہیں اور نہ معلوم کہاں کہاں سے آئی ہیں۔ ارے یہ تو اچھی خاصی برقع پوش معلوم ہوتی ہیں، مگر انھیں یہاں برقع کا ہوش نہیں — جی! یہاں عقیدت کا جوش ہے برقع کا کسے ہوش ہے — لیجئے یہ بی بیاں تو خوب

بے پردہ ہو کر پھر رہی ہیں ----- جی - یہاں سارے زائرین قبروں ہی کے زائرین نہیں ہیں۔ زائرینِ حُسن بھی ہیں۔ عورتیں یہاں مَردوں کے دوش بدوش ہیں کندھے سے کندھا ہی نہیں ملتا۔ نظروں سے نظریں بھی ملتی ہیں دل سے دل بھی ملتے ہیں۔ آپ کو یہاں اگرچہ سب کچھ ملے گا مگر قبر اور صاحبِ قبر کی نسبت کے باعث آپ اس کا تصوّر آسانی سے ساتھ نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ سب کچھ قبر کے اندر نہیں ہو رہا ہے جسے آپ دیکھ نہ سکیں۔ یہ تو باہر ہی باہر ہے۔ اس لئے اگر واقعات و حقائق کی شہادت ایک مسلّمہ شہادت ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ کھلّم کھلا نظر بازی بلکہ عشق بازی بھی ہو رہی ہے۔ مگر چونکہ اس پر "روحانیت" اور "مذہبیت" کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے یہ باتیں "خلوتیانِ راز" ہی تک عام طور پر محدود رہتی ہیں۔

مگر چھوڑیئے مکروہ باتوں کا ذکر بھی مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے عُرس کا نظام نامہ ملاحظہ نہیں فرمایا۔ یہ دیکھئے ---- ارے - اس میں یہ صندل، مالیدہ چڑھاوا، نشان، فاتحہ، نیاز اور اسی قبیل کی بیسیوں عجیب باتیں موجود ہیں ---- جی! یہ عجیب ہوں تب بھی ان پر تعجب نہ کیجئے اور عجیب و غیر عجیب کا فیصلہ ابھی نہ کیوں کیجئے گا۔ کچھ نیچے دیکھئے ---- ہاں - اس میں مجلسِ سماع کا ذکر ہے ---- مشہور قوالوں کے نام ہیں ---- مگر اور بھی کچھ ہے ---- جی - کچھ گانے اور ناچنے والیوں کے نام بھی لکھے ہیں ---- یہاں ناچ گانا صاحبِ مزار کی روح کو خوش کرنے کے لئے ہو گا۔ یہ طریقت، جذب و سوز اور کیف و عرفان کی دُنیا ہے۔ یہاں "شریعت" کے قانون نہیں چل سکتے۔

اچھا! ادھر دیکھئے۔ ہزاروں جانور ذبح کئے جا رہے ہیں۔ ان جانوروں کا تقدّس بھی واقعی کیا چیز ہے۔ کتنے ہی جانور صاحبِ قبر کے نام پر پُن کر کے

چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جنھیں ہاتھ تک نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ جس کھیت میں جا پڑیں کھیت والے کے نصیب جاگ اُٹھیں گے۔ وہ جہاں سے پانی پی لیں وہاں برکت ہی برکت ہو گی۔ کتنے ہی جانور اس لئے ذبح کئے جا رہے ہیں کہ اُن کو ذبح کرنے کی منت مانی گئی تھی۔ اُن کو ذبح کرتے ہوئے چاہے جس کا نام لیا جائے مگر وہ ذبح ہو رہے ہیں ایک خاص طریقہ پر۔ خاص جگہ، خاص وقت میں، یہاں تک کہ اس طریقہ سے ہٹ کر، اس جگہ کو چھوڑ کر، اس وقت کو ٹال کر کوئی شخص انھیں ذبح کرنے پر آمادہ نہیں۔ پھر جانوروں کی خریداری سے لے کر اُن کے گوشت پوست کی تقسیم اور کھانا پکنے اور خرچ ہو جانے تک کے آداب اور بے ادبیوں کی اقسام حد و شمار سے باہر ہیں۔

مزار شریف پر چلئے۔ اوہ۔ وہاں تو بڑی بھیڑ لگی ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کی الگ الگ صفوں کا امتیاز مفقود ہے۔ خیر۔ جو کچھ اندر ہو رہا ہے اُسے آپ نہ دیکھ سکیں تو یہی بہتر ہے۔ دروازے سے الگ کھڑے ہو جائیے۔ کم از کم ہر آنے جانے والے کی حرکات و سکنات ہی دیکھ لیجئے اور اگر اس نظارے سے آپ تھک گئے ہیں تو عجیب و غیر عجیب اور جائز و ناجائز کی بحث کو چھوڑیئے اور چپ چاپ لوٹ آیئے، مگر ان قبروں کو ضرور دیکھ لیجئے جن میں کوئی جسم دفن نہیں ہے محض قبروں کی شکل دے کر انھیں کسی بزرگ کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔[۱]

زائرین بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ مصنوعی قبریں ہیں۔ مگر اُنھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان قبروں پر بزرگانِ دین کا نام لینے سے اُنھیں ذہن میں بزرگی کا مقام حاصل ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ ان کے بھی گرویدہ ہیں اور یہاں آپ وہ

[۱] دکن میں ان مصنوعی قبروں کو عامۃ الناس "جھنڈہ" کہتے ہیں ۱۲

سب چیزیں پائیں گے جنھیں آپ "عجیب" قرار دے رہے تھے تاہم اگر ان عجائبات سے آپ کے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہونے لگی ہے تو اب اپنے گھر آجائیے۔

سوال یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے' کیا یہ سب یونہی ہے؟ کیا اس کے کچھ وجوہ و اسباب نہیں؟ کیا دُنیا میں کوئی ایسا عمل بھی پایا جاتا ہے جو کسی نہ کسی عقیدہ و ایمان کا مظہر نہ ہو؟ کیا آپ کسی ایسی سرگرمی کا پتہ دے سکتے ہیں جس کا کوئی داعیہ' جس کا کوئی نظریہ' جس کا کوئی محرک سرے سے موجود ہی نہ ہو؟ کیا آپ کسی ایسی حرکت کے قائل ہیں جو مقصد و ارادہ اور نیت کے بغیر ہی ہو جایا کرتی ہے؟ ظاہر ہے کہ انسان کا ہر عمل اس کے قلبی عقیدہ و ایمان کا مظہر ہوتا ہے' انسان کی سرگرمیاں اپنے داعیات' نظریات اور محرکات کا آپ پتہ دیتی ہیں۔ انسان کی حرکات و سکنات اس کے قصد و ارادے اور نیت ہی پر محمول کی جاتی ہیں۔ بلا قصد و ارادہ سرزد ہونے والی حرکات و سکنات میں نہ تو اہتمام ہوتا ہے نہ اصرار نہ استقلال ہوتا ہے نہ دوام۔ بفحوائے حدیثِ نبویؐ انسان کے تمام اعمال کا دارومدار اس کی نیت ہی پر ہوتا ہے۔ پس چند مخصوص اولیاء و صوفیاء کی قبروں کے ساتھ یہ غیر معمولی برتاؤ جن اعتقادات و ایمانیات پر مبنی ہے اُنکا خلاصہ یہ ہے:۔

> "اللہ تعالیٰ پوری کائنات اور کائنات کی ہر جاندار و بے جان چیز کا خالق ضرور ہے۔ مگر اُس نے اتنی بڑی کائنات کے لئے تدبیرِ امر' تقسیم رزق' مالکیت' حکم و اقتدار اور انسانی ضروریات کی بہم رسانی کے انتظام میں دوسری بہت سی ہستیوں کو اپنا شریک بنا رکھا ہے۔ وہ عالم

ہے۔ لیکن اتنا بڑا حاکم کہ اُسے کبھی یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنی حکومت و سلطنت کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں خود دخل دے اور دوسروں کو بالکل بے دخل کر دے۔ اُس نے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں، لیکن وہ اُس کا پیغام پہنچا دینے اور اپنی تعلیم کے مطابق خود عمل کر کے دکھا دینے کے بعد دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُنھیں یہ اختیارات نہیں دیئے جاتے کہ وہ خدا کی سلطنت میں کسی درجہ میں بھی مداخلت کریں۔ یا از خود دخیل ہو جائیں۔ رہ گئے پیغمبروں کے ساتھی تو بہر حال وہ پیغمبروں کو دیکھنے والے اور اُن کی تعلیم کے مطابق عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اُنھیں بھی یہ منصب نہیں ملتا کہ خدائی سلطنت کا کوئی کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ البتہ بعض صوفیاء و اولیاء کو جو اللہ کے خاص چہیتے اور اس کے نظر کردہ ہوتے ہیں، یہ منصب سونپا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی سلطنت کا کام چلائیں اور اس کی صفات میں جزءً یا کلاً شریک ہو جائیں۔ بادشاہِ کائنات کی سلطنت میں اُن کا وہی مقام ہوتا ہے جو دنیا کی سلطنت میں وزیروں، گورنروں اور چھوٹے بڑے حاکموں کا ہوا کرتا ہے۔ اُنھیں بہت سے اختیارات دیئے جاتے ہیں اور تصرفات پر اُنھیں قدرت بخشی جاتی ہے۔ خدا کی سلطنت کا ایک ایک علاقہ اور ایک ایک صوبہ اُن کے سپرد کیا جاتا ہے۔ سارے معاملات انہی کے درباروں سے طے پاتے اور سارے قضیئے انہی کے یہاں فیصل ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ خدا کے اذن یافتہ ہیں اس لئے انھیں بہت ہی کم معاملات اُوپر پہنچانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ شاید کسی معاملہ کو اُوپر لے جانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں خود اللہ تعالیٰ اس سے راضی وخوش

رہتا ہے۔ اگر کبھی ناراض بھی ہو جاتا ہے تو محبوب و معشوق کی بات تو ہر طرح گوارا ہی کرنی پڑتی ہے۔ پھر اتنی عظیم الشان سلطنت کا تنہا انتظام از خود سنبھالنے کی زحمت سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبوں اور پیاروں کو بھی اختیارات سونپ دیئے ہیں ۔۔۔ یہ حضرات اللہ تعالیٰ سے اکثر بگڑ بھی جاتے ہیں۔ مگر عشق کے میدان میں اس قسم کی باتیں تو پیش آیا ہی کرتی ہیں۔ یہ انداز ہی معشوقانہ ہوتا ہے اس سے عاشق نہیں بگڑتا۔ بلکہ اُس کے دل میں عشق کی آگ اور بھڑک اُٹھتی ہے جب دُنیا میں اُن کے تعلقات اتنے مضبوط اور گہرے ہوتے ہیں تو آخرت تو دُنیا کی کھیتی کا حاصل ہی ہے۔ اس لئے وہاں ان کا ہر عقیدت مند بخشا جاتا ہے اور محض اُن کے دامن سے وابستہ ہو جانا ہی بخشش کے لئے کافی ہے۔ عاشق و معشوق کے اصلی تعلقات کی شان تو دنیا سے کہیں زیادہ آخرت ہی میں ظاہر ہو سکے گی ۔۔۔ یہ حضرات اگرچہ دوسروں کی طرح وقت مقررہ پر مر جاتے ہیں۔ مگر دراصل یہ مرتے نہیں ہیں بلکہ دنیا سے بیزار ہو کر صرف پردہ کر جاتے ہیں یا خدا سے مل کر بہت سی خدائی طاقتوں کا مظہر بن جاتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر اُن کا جسم دُوسروں کی طرح زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ مگر چونکہ وہ دنیا میں سخت سے سخت ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ اپنی روح کو خوب طاقتور بنا لیتے ہیں۔ اس لئے انتقال مکانی کے بعد اس کے تصرفات کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ جب دنیا میں ان لوگوں کی روح اتنی ہلکی اور لطیف ہوتی تھی کہ

اس پر جسم کا دباؤ باقی نہ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہوا پر اُڑنا، پانی پر چلنا اور چند ثانیوں میں فاصلۂ طویلہ طے کر جانا اس کے لئے ایک معمولی بات تھی تو پھر بعدِ وفات اس کے کرشموں کا کیا ٹھکانا ہے؟

روح تو امرِ رب ہے، پھر ایک ولی اللہ کی روح جس کی صفائی وطہارت اور قوت وشہامت ناقابلِ تصور ہے۔ جب جسم سے الگ ہو جاتی ہے تو پھر وہ وہ کرامات دکھاتی ہے کہ دنیا دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ خدا کا حکم بن کر جب اپنے زیر اثر علاقہ میں نافذ ہوتی ہے تو اس کے سارے معاملات اسی روح سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر دور و نزدیک کی بات سُنتی ہے۔ قریب و بعید ہر معاملہ دیکھتی ہے۔ حاجتیں پوری کرتی ہے مُرادیں بر لاتی ہے، تقسیمِ رزق، عطاءِ اولاد، شفاءِ امراض، دفعِ بلیات، دُنیوی امارتوں اور ریاستوں کی اُکھیڑ پچھاڑ۔ غرض کوئی معاملہ اُس کے دائرۂ تصرفات سے باہر نہیں رہ جاتا۔ وہ بگڑتی ہے تو بستیوں کو ویران کر دیتی ہے اور خوش ہوتی ہے تو خوش حالی کا دَور آجاتا ہے۔ اس کی رضا و نارضامندی ہی سب سے اہم اتمام اور فیصلہ کن مسئلہ ہے۔ اس لئے اس کی طرف رجوع ہر حال ضروری ہے۔

یوں تو سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے تیسوں دن اور دن کا ہر لمحہ، وہ اپنے کام سے غافل نہیں رہتی۔ مگر خاص طور پر اُس تاریخ سے دو چار دن پہلے اور بعد، جس میں وہ جسم اقدس سے نکل کر حقیقی معنی میں امرِ ربانی بن گئی تھی پوری جلالی و جمالی صفات کے ساتھ قبر پر

جلوہ فرما ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ انہی دنوں میں قبروں پر بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں اور لوگ اپنی اپنی حاجتیں پوری کرتے اور اپنی بدقسمتی خوش قسمتی کے فیصلے لے کر پلٹتے ہیں۔

ان خاص مواقع پر جو جو کچھ معتقدین سے ظہور میں آتا ہے وہ تو اس لئے ہے کہ آباؤ اجداد سے یہ طریقے اور رواج منقول ہیں۔ جو چیز اوپر سے آتی ہے اس کے تقدس میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ آخر قرآن و حدیث آج کچھ نئے نہیں ہو گئے ہیں۔ وہی قرآن کی باتیں اور وہی حدیث کی روایتیں پہلے زمانے کے لوگوں کے سامنے بھی تھیں جو آج ہمارے سامنے ہیں اور وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ ان چیزوں کو جاننے اور ماننے والے تھے۔ لہذا یہ سب کچھ تو بہر حال ہونا ہی چاہیئے۔ جو ہوتا آیا ہے اور آج ہو رہا ہے۔

اگر ان مزاروں کے سامنے آداب نہ بجالائے جائیں تو پھر دُنیا میں کونسی چیز لائق ادب رہجاتی ہے۔ اگر یہاں بھی زیادتیاں ہوں تو پھر دُنیا میں کس چیز کا ادب کیا جائے۔ اگر یہاں وہ چیزیں بھی ہوتی ہیں جو قبروں کی دُنیا سے باہر عام طور پر نامناسب اور معیوب سمجھی جاتی ہیں تو بہر حال یہ بھی انہی حضرات کا فیض ہے کہ ان تکلفاتِ ناروا سے چھٹکارا دلا دیا۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کو کبھی برے نام سے یاد نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ دراصل یہ ان درباروں کی توہین ہے۔ ان درباروں سے جو چیز وابستہ ہو جاتی ہے اُس کو بُرا کہنا صرف بُروں کا کام ہے' ورنہ جو چیز کان نمک

میں پہنچتی ہے نمک بن جایا کرتی ہے اس نمک کا ذائقہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ذوقِ ایں می نشناسی بخدا تانہ چشی۔ ان بزرگوں کی شان تو یہ ہے کہ جن قبروں میں وہ دفن ہیں وہ تو خیر رحمتِ الٰہی کا مہبط ہی ہوتی ہیں۔ مگر کسی پتھر کے ڈھیر پر بھی ان کا نام لے دیا جائے تو وہاں سے بھی فوائد و برکات کا بحرِ ذخار اُبل پڑتا ہے۔ خدا نے جو شریعت اپنے بندوں کے لئے اُتاری ہے، وہ ہے تو لائقِ اتباع مگر خصوصیت و عمومیت میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے۔ پیغمبروں کو اس کا اتباع اس لئے ضروری ہے کہ وہ پیغام پہنچانے والے ہیں۔ وہ خود اس کی خلاف ورزی کیسے کر سکتے ہیں۔ مگر اولیاء و صوفیاء کی ایک خاص جماعت کو وہ امتیاز خصوصی بخشا جاتا ہے کہ شریعت کا اتباع و غیر اتباع ان کے لئے بالکل یکساں ہے۔ ان میں سے اگر کچھ لوگ متبع شریعت ہوتے بھی ہیں تو وہ ابتدائے سلوک کے مرحلہ میں ہوا کرتے ہیں۔ مگر بعد میں وہ مرفوع القلم ہو جاتے ہیں اور بعض تو دم پیدائش ہی سے مرفوع القلم ہوتے ہیں۔

چنانچہ وہ اگر عورتوں کے ناچ گانے سے دلچسپی لیتے ہیں تو ایک پردہ ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کی آنکھوں پر پڑا ہوتا ہے۔ ورنہ حوروں کے تصور سے ان کا کوئی لمحہ خالی نہیں جاتا اور سازوں کی آوازوں میں وہ ہمیشہ مولا کی آواز سنا کرتے ہیں۔ وہ دنیا ہی میں جنت کے مزے لوٹنے لگتے ہیں۔ اس لئے دنیا و آخرت کی تقسیم کرنے والے ان کی کسی بات کو پا نہیں سکتے۔ اور یہی مطلب ہے کہ جو لوگ ان کے مزارات مقدسہ

پر حاضر ہوتے ہیں اُنھیں بھی اتباعِ شریعت کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ اگر نماز روزہ سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں تو محض اس لئے کہ خدا سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق باقی رہے ورنہ اہل اللہ سے تعلق قائم رکھنا خود اللہ سے تعلق قائم رکھنے کے مترادف ہے۔

اس تعلق کے بعد اگر کوئی شخص پوری شریعت سے بھی منحرف ہو جائے تب بھی ڈرنے کی بات نہیں۔ یہ حضرات نہ صرف اللہ کے ہاں سفارشی بن کر کھڑے ہونگے بلکہ ان کی بات رکھنا اللہ پر واجب ہوگا۔ کہیں دُنیا میں ایسے عاشق بھی پلے جاتے ہیں جو خاص اپنے ہی معشوقوں کی ناراضی مول لے لیں۔ اہل اللہ نے تو پہلے اللہ سے عشق کیا مگر بالآخر وہ خود معشوق بن کر رہ گئے۔

ایسے محبوبانِ ربانی کے مزارات کیا دوسروں کی طرح کچے اور کھلے ہونے چاہئیں؟ اُن کی عظیم المرتبت ہستیوں کے شایانِ شان تو یہی بات ہے کہ نہایت عالی شان قبّے اُن کے مزارات پر بنیں۔ تاکہ ان کی عظمتِ شان بھی باقی رہے اور زائرین و معتقدین کو بھی اُن کے سایہ میں آرام لینے اور راحت پانے کا موقع مل جائے۔ پھر جب یہ مزارات اس قدر مرجع خلائق بن جائیں تو اُن کے سجادہ نشینوں کا وجود بھی آپ سے آپ ضروری ہو جاتا ہے اور کسے خبر ہے کہ وہ بڑے ہیں یا نہیں۔ مگر بڑوں کی نسبت تو انھیں یقیناً بڑا بنا دیتی ہے اور مسلم حکومتوں کی یہ انتہائی قدرشناسی اور عقیدت مندی تھی کہ انھوں نے اِن مزاراتِ مقدسہ کے لئے بڑی بڑی جاگیریں اور جائدادیں وقف فرمائیں۔ اِن تمام چیزوں کو جو لوگ بُرا کہتے ہیں وہ "وہابی" ہیں۔ اس بات کی تحقیق کون کرے کہ ان کو وہاب سے نسبت ہے یا عبد الوہاب سے

یا عبدالوہاب کے بیٹے سے۔ بہر حال ہیں یہ بے ایمان۔ بھلا اہل اللہ سے کٹکر اللہ سے جڑنا بھی کوئی معنی رکھتا ہے؟" (ان تصورات اور معتقدات سے لاکھ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ)۔

یہ ہیں وہ خیالات و اعتقادات جو قبر پرستی کا اصل سبب ہیں یہ آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ اگر آپ اس کے کسی جز ئیہ کو بھی الگ کر دیں تو شاید اس عمارت کی پوری اینٹیں ہی کھوکھلی ہو کر رہ جائیں اور پھر یہ عمارت بھی ایک خاص بنیاد پر قائم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ بنیادی اصول شرعاً صحیح درست ہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے پہلے حق و باطل کا ایک معیار متعین کرنا چاہئے۔ جہاں تک غیر مسلم قوموں کا تعلق ہے اُن میں یہ معیار کبھی متفق علیہ نہیں رہا ہے۔ کیونکہ خدائی ہدایت پر ایمان نہ لانے کے سبب اُن کا ہر وادی میں بھٹکنا قدرتی بات ہے۔ بر خلاف اس کے مسلمان مسلمان ہونے کی حیثیت سے معیارِ حق و باطل کے تعین میں کبھی مختلف الخیال نہیں ہو سکتے۔ وہ چاہے دُنیا کے کتنے ہی گوشوں میں بکھرے ہوئے ہوں اور علم و ایمان کے کسی درجہ پر ہوں اُن کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف قرآن اور اس کے بعد رسولؐ کی سنت۔ ان دونوں جاری چیزوں کے بعد اگر کوئی چیز اُن کے نزدیک لائقِ توجہ یا لائقِ پذیرائی ہو سکتی ہے تو صلحاء و علماءِ اُمت کے صرف وہ اقوال افعال جو کتاب و سنت کے عین مطابق یا روحِ اسلامی سے قریب تر ہوں۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو چاہے کسی بات کو ساری دنیا کہتی ہو اور کوئی کام ساری دُنیا میں کیا جاتا ہو مسلمان کے نزدیک اس کی قدر و قیمت اتنی بھی نہیں ہے جتنی مٹی کے ایک ذرّہ یا گھانس کے ایک تنکے کی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ تو اپنے مشن کے لحاظ سے مامور ہی اس بات پر ہے کہ ہر خلاف کتاب و سنت چیز کی تردید کرے

لے اِنّی ترکتُ فیکم الثقلین (الحدیث)

اور عملاً ہر منکر کو مٹانے اور ہر معروف کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتا ہے یہانتک کہ اس راہ میں اپنی جان دے دے۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ جن اعتقادات و نظریات کی بناء پر مسلمان قبر پرستی میں مبتلا ہیں وہ سرے سے باطل ہیں اور انکی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کے خیالات و اعتقادات صرف اس شخص کے دل و دماغ میں راہ پا سکتے ہیں جس نے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ یا کی تو اپنے مزعومات و مفروضات کی تائید و سند کے لئے ورنہ قرآن نے اتنی وضاحت و صراحت کے ساتھ حق و باطل کو ممیز کر کے رکھ دیا ہے اور دنیا میں پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کو اتنی خوبی اور حکمت کے سلتھ صاف کر دیا ہے کہ اگر کوئی شخص پورا قرآن نہ سہی اس کا کوئی ایک حصہ بھی طلبِ ہدایت کے لئے پڑھ لے تو اس کے دل و دماغ میں اس قسم کے خیالات و اعتقادات کے در آنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اپنی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہم قرآن کی کون کونسی آیات اور کون کونسی سورتیں اپنے مدعا کی توضیح میں پیش کریں۔ قرآن کی تعلیم اتنی صاف اور آسان ہے کہ ہر مرتبۂ عقل کا انسان بخوبی اسے جذب کر سکتا ہے۔ پھر کیوں نہ پورا قرآن ہی سامنے رکھ دیں اور یہ مخلصانہ گذارش کر دیں کہ خالی الذہن ہو کر چشمۂ ہدایت سے سیرابی حاصل کرنے کی نیت سے قرآن پڑھئے ورنہ پیشگی قائم کئے ہوئے نظریات و اعتقادات لئے ہوئے (خصوصیت سے جب کہ ان کے ساتھ انتہائی تعصب موجود ہو) اگر قرآن پڑھا جائے گا تو در اصل قرآن کی آیتیں نہیں پڑھی جائیں گی۔ بلکہ اپنے ہی خیالات و نظریات کی تلاوت ہو گی۔ تاہم چند آیات بطور مثال ملاحظہ ہوں :۔

سورۃ فاطر رکوع ۲ میں ہے:-

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ	اس کے سوا تم جن کو پکارتے ہو وہ تو کھجور
مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ ۝ اِنْ	کی گٹھلی کے چھلکے کا بھی اختیار نہیں رکھتے
تَدْعُوْھُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَکُمْ	اگر تم اُن کو پکارو تو وہ تمہاری پکار نہ سنیں
وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَکُمْ	اور اگر سُن لیں تو تمہارا کہنا نہ کرسکیں۔ قیامت
وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکْفُرُوْنَ	کے دن وہ تمہارے شرک کا انکار کردینگے
بِشِرْکِکُمْ وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثْلُ	اور تجھ کو ایک باخبر شخص کی طرح کوئی نہیں
خَبِیْرٍ ۝	بتلائے گا۔

اس آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہاں بے جان معبودوں کا ذکر نہیں ہو رہا ہے، بلکہ جاندار اور ذی شعور ہستیوں کا ذکر ہے۔ کیونکہ پکار کا نہ سُننا، سن لیں تو جواب دینے یا کام بنا دینے کا اختیار نہ رکھنا اور شرک سے انکار کردینا لکڑی پتھر کی مورتیوں کے افعال نہیں ہیں۔ اُنھیں کی متعلق اللہ نے صاف خبر دی ہے کہ اُنھیں کسی قسم کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ [illegible] لوگ طلبِ حاجات کے لئے پکارتے ہیں اللہ نے ان کے اس فعل [illegible] قرار دیا ہے اور خبر دی ہے کہ قیامت میں وہ اس شرک کا انکار کریں [illegible] شرک کے انکار کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس فعل کے شرک [illegible] کریں گے۔ کیونکہ خدا خود جس فعل کو شرک ٹھیرائے اُس کا انکار [illegible] بس میں نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبردستی کے بنائے ہوئے [illegible] اس فعل سے اپنی برأت ظاہر کریں گے۔ وہ کہیں گے نہ ہم نے [illegible] کرنے کا حکم دیا تھا اور نہ ہمیں یہ اطلاع تھی کہ ہمارے پیچھے کس نے [illegible] بنا رکھا ہے۔ اللہ نے یہ خبر اس لئے دی ہے کہ جو لوگ غلط امید دل [illegible]

اپنی زندگی گذار رہے ہیں اُن کو پیشگی متنبہ کر دیا جائے۔ تاکہ قیامت کے دن وہ اپنی اُمیدوں کے طلسم کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر پچھتانے کی بجائے ابھی سے اپنی غلط فہمیوں کو دُور کر لیں اور صحیح رویہ پر قائم ہو جائیں۔ چنانچہ آیت کا آخری فقرہ خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ مقصود بیان یہ ہے کہ خدائے خبیر سے بڑھ کر صحیح خبریں تمھیں کون بتا سکتا ہے۔ پس جو کچھ اللہ نے بتا دیا ہے اس سے کم یا زیادہ پر ایمان لانا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ علم و خبر کا سرچشمہ تو وہی ہے۔ جب وہیں سے تم کو وہ خبریں نہیں مل سکتیں جنھیں تم مان رہے ہو تو بے خبری کے اندھیرے میں جو کچھ تم کرو گے اس کا نقصان تمھیں کو اُٹھانا پڑے گا۔

اسی سورۂ فاطر میں آگے ارشاد ہوتا ہے :-

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا (رکوع ۵)

کہدو کہ ذرا اپنے شریکوں کو تو دیکھو جنھیں اللہ کو چھوڑ کر تم پکارا کرتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کہ آخر انھوں نے زمین کا کونسا حصّہ پیدا کیا ہے یا آسمانوں میں اُن کا کوئی ساجھا ہے یا پھر ہم نے اُن کو کوئی کتاب دی ہے کہ یہ اس کی سند پر قائم ہیں۔ بات یہ ہے کہ ظالم ایک دوسرے سے جو کچھ وعدہ کر رہے ہیں وہ محض دھوکا ہے۔

+ + + +

یعنی یہ اپنے رویہ کے حق میں عقلی و نقلی کسی قسم کی دلیل نہیں رکھتے۔ اگر رکھتے ہیں تو بتاتے کیوں نہیں کہ زمین و آسمان کی تخلیق میں اُن کے اپنے معبودوں کا کیا حصّہ ہے یا پھر یہی بتا دیں کہ ہم نے آخر کہاں کس جگہ اور کب یہ

حکم دیا ہے کہ چونکہ ہماری سلطنت چند با اختیار ہستیوں کے درمیان بٹی ہوئی ہے جن میں سے ہر ایک تمہاری پکار کا مستحق ہے لہٰذا انھیں پکارا کرو۔ جو لوگ عقلی و نقلی دلائل سے بے نیاز ہو کر بے بنیاد عقیدے اور طریقے اختیار کرتے ہیں وہ ظالم ہیں اور آپس میں یہ جو وعدے وعید کرتے ہیں وہ صرف دھوکا ہے۔

یہی مضمون سورۂ احقاف کے پہلے رکوع میں ارشاد ہوا ہے۔ فرمایا:۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝

کہو ذرا دیکھو کہ تم اللہ کو چھوڑ کر جن ہستیوں کو پکارا کرتے ہو، مجھے بتاؤ کہ انھوں نے آخر زمین کا کونسا حصہ پیدا کیا ہے یا آسمانوں میں ان کی کوئی شرکت ہے؟ اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا کوئی علمی روایت پیش کرو۔ اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان ہستیوں کو پکارے جو قیامت تک اس کی پکار قبول نہیں کر سکتیں۔ بلکہ ان کی دعا سے بھی وہ بے خبر ہیں جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت کا انکار کریں گے۔

+ + + + +

ان آیات سے حسب ذیل حقائق بداہۃً ثابت ہیں:۔

(۱) "عبادت" محض نماز روزہ کا نام نہیں، بلکہ دعا بھی عین عبادت ہے۔ جو نماز روزہ خدا کے لئے کرے لیکن مشکل کشائی، فریاد رسی اور قضائے حاجات کے لئے اسے چھوڑ کر کسی اور کو پکارے وہ خدا کے ساتھ دوسروں کو عبادت میں

شریک کرنے کا مجرم ہے۔

(۲) یہ پرلے درجہ کی گمراہی ہے کہ خدا کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں کو پکارا جائے کیونکہ کوئی اور ہستی کسی کی پکار کا جواب دینے پر قادر نہیں ہے اور جواب دینا تو ایک طرف کسی کو کسی کی پکار کی خبر تک نہیں ہوتی۔ حد یہ ہے کہ یہاں جن جن ہستیوں کو لوگوں نے معبود بنا ڈالا اُنھیں جب قیامت کے دن اس کی اطلاع ہو گی تو اس پر اُن کا خوش ہونا تو درکنار اُلٹے وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال میں لوگوں کا یہ طرزِ عمل اتنی شدید ضلالت ہے جس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) عقائد و اعمال کی بنیاد ہمیشہ عقلی و نقلی دلائل پر قائم ہونی چاہئے ظنیات و توہمات یا خالی خولی جذباتی باتیں لائق توجہ تک نہیں ہیں، چہ جائیکہ انہی پر مستقلاً اپنے عقائد و اعمال کی عمارت کھڑی کر لی جائے۔ پس جب یہ معلوم و مسلم ہے کہ تخلیقِ کائنات میں اللہ نے کسی اور کو شریک نہیں کیا ہے اور نہ اُس نے قرآن میں یا اس سے پہلے کی کسی کتاب میں شرک فی الدعا یا شرک فی العبادت کا حکم دیا ہے تو پھر لوگوں کو خود سوچنا چاہئے کہ اُن کی ضلالت کا انجام کیا ہو گا۔

یہ اولیاء پرستی دراصل اس عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ انھیں نفع و نقصان پر قدرت حاصل ہے اور اُن کے یہ اختیارات ایسے عالمگیر و ہمہ گیر ہیں کہ وہ اپنی کارروائیوں میں خود خدا کے اذن کے بھی پابند نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ اگر خدا کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو یہ آڑے آتے اور بندوں کو اس سے بچا لیتے ہیں اور فائدہ پہنچانا چاہے تو ان کی رضامندی کے بغیر وہ بندوں کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ یہی عقیدہ ان کی رضامندی و ناراضی کو اصل معیار قرار دیتا ہے اور کچھ پرواہ نہیں کی جاتی کہ خدا کس عمل سے خوش اور کس سے ناخوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے

جگہ جگہ اس عقیدہ کی پُرزور تردید کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (زمر۔ رکوع ۴)

کہہ دو: ذرا دیکھو تو سہی کہ اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو تم اللہ کو چھوڑ کر جن جن کو پکارتے ہو کیا وہ اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں؟ یا اگر وہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ تم کہہ دو کہ میرے لئے تو اللہ کافی ہے بھروسہ کرنے والے اسی پہ بھروسہ کرتے ہیں۔

\+ + + + +

سورۂ جن میں فرمایا:۔

قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ (رکوع ۲)

کہہ دو کہ میں تمہارے کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ تمہاری کسی بھلائی کا۔ تم کہہ دو کہ مجھ کو خدا سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اسکے سوا کوئی پناہ کی جگہ پا سکتا ہوں۔

جو لوگ اولیاء کو اس طرح نفع و نقصان پر قادر نہیں مانتے کہ خدا کے اذن سکے وہ پابند ہی نہ ہوں، انہیں شفاعت کا عقیدہ ایک اور رُخ سے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان حضرات کو نفع و نقصان کے اختیارات دیئے گئے ہوں یا نہ دیئے گئے ہوں۔ بہر حال یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں اور جیسا کہ دُنیوی سلطنتوں میں ہوا کرتا ہے۔ بسا اوقات ان سفارشیوں کو اصل حاکم سے زیادہ قدر و منزلت اور تعظیم و محبوبیت کا مستحق ٹھیرالیا جاتا ہے۔ کیونکہ انہی کی اچھی بُری سفارشوں پر حاکمِ اعلیٰ کے سارے فیصلوں اور اس کی ساری کارروائیوں کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عقیدے کی بھی جگہ جگہ تردید کی ہے:۔

(۱) لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ (انعام رکوع ۶)

اُس کے سوا نہ اُن کا کوئی مددگار ہے نہ کوئی سفارشی۔

(۲) فَلَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ۔ (انعام رکوع ۸)

اللہ کے سوا نہ اُس کا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارشی۔

(۳) مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (سجدہ ع ۱)

اس کے سوا نہ تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارشی۔ کیا تم نہیں سمجھتے؟

(۴) مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ۔ (مومن رکوع ۲)

ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشی جس کا کہا مانا جائے۔

(۵) وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ

(زمر رکوع ۱)

جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز تجویز کر رکھے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ ہم اُن کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ مرتبہ میں ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔ اللہ اُنکے درمیان تمام مختلف فیہ معاملات کا فیصلہ کر دے گا۔ اللہ کسی ایسے شخص کو راہِ راست نہیں دکھاتا جو جھوٹا اور ناشکرا ہو۔

+ + + +

(۶) اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا۔ (زمر رکوع ۵)

کیا ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو سفارشی بنا رکھا ہے۔ کہو کہ اگرچہ یہ کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کچھ نہ سمجھتے ہوں؟ تم کہدو کہ سفارش کا اختیار تو تمامتر اللہ ہی کو حاصل ہے۔

+ + + +

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا

یہ اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کر رہے ہیں

يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللّٰهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

(یونس۔ رکوع ۲)

وہ نہ ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے محمدؐ! ان سے کہو کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں۔ اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں اللہ پاک و بالا و برتر ہے

"شفعاء" کا عقیدہ رکھنے والے احمقوں کا آخری حسرتناک انجام دیکھئے:۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِن قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ قَدْ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ

بیشک تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر [illegible] پیدا [illegible] دیا تھا وہ سب پیچھے چھوڑ آئے [illegible] سفارشیوں [illegible] دیکھتے [illegible] [illegible] اور وہ سب [illegible] جن کا تم زعم رکھتے تھے [illegible] [illegible] ہمارے رب [illegible] [illegible] سفارشی [illegible] [illegible] اسکے بجائے اب دوسرے طریقہ [illegible] کر کے دکھائیں

بیشک ان لوگوں نے اپنا نقصان خود کیا اور ان کی ساری افترا بندیاں آج گم گذری ہو گئیں۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُم مِّن شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ۔ (روم رکوع ۲)

جس روز قیامت برپا ہوگی تو مجرم سخت ناامید ہو جائینگے اُنکے شریکوں میں کوئی اُنکا سفارشی نہو گا اور یہ لوگ اپنے شریکوں سے منکر ہو جائیں گے۔

"شفاعت" کا یہ عقیدہ چونکہ دوسروں کے لئے علم غیب کے حاصل ہونے کے عقیدہ کو مستلزم ہے اس لئے قرآن نے اس کی بھی نفی کر دی ہے۔

وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ (انعام رکوع ۷)

اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اسکے سوا کوئی نہیں جانتا۔

قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ (نمل رکوع ۵)

کہدو کہ سوائے خدا کے زمین و آسمان کی کوئی ہستی غیب کا علم نہیں رکھتی۔

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۝

(اعراف رکوع ۲۳)

اے محمدؐ! تم کہدو کہ مشیتِ خدا کے بغیر میں اپنی ذات کے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔ اگر میں عالم الغیب ہوتا تو یقیناً بہتیرا نفع اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔

قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ

(احقاف رکوع ۱)

اے محمدؐ! تم کہدو کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟

+ + + +

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ آپؐ یہ کہدیں۔ چنانچہ حضورؐ نے بھی اپنی زبانِ مبارک سے یہی کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:۔

وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (مشکوٰۃ باب البکاء والخوف۔ بحوالہ بخاری بروایت) — خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ خود میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ درانحالیکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

یہ اولیاء پرستی بالعموم دو شکلوں میں ظہور کرتی رہی ہے۔ ایک یہ کہ خدا پرستی کو بالکل ترک کر کے اولیاء پرستی ہی کو عین خدا پرستی تصور کر لیا جاتا ہے اور دوسری یہ کہ خدا پرستی کے ساتھ ساتھ اولیاء پرستی بھی چلتی رہتی ہے۔ چنانچہ ان دونوں تصورات کو رد کرنے کے لئے کہیں اللہ تعالیٰ نے تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (تم پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر) فرمایا ہے اور کہیں مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کے بجائے مَعَ اللّٰہِ (اللہ کے ساتھ) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ مومنون کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ لَا بُرْھَانَ لَہٗ بِہٖ فَاِنَّمَا حِسَابُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْکٰفِرُوْنَ ۝

جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کیلئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اسکا حساب اسکے رب کے پاس ہے۔ بحقیقت یہ ہے کہ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔

سورۂ نمل کے پانچویں رکوع میں توحید کے دلائل دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بار بار اس سوال کو دُہرایا ہے کہ:۔

ءَاِلٰـہٌ مَّعَ اللّٰہِ۔ — کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور اِلٰہ ہے۔

چنانچہ اِن آیات کے منجملہ ایک آیت یہ ہے:۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰـہٌ مَّعَ اللّٰہِ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ ٥

وہ کون ہے جو مجبور اور بے قرار آدمی کی دعا قبول کرلیتا ہے جبکہ وہ اسے پکارنے لگتا ہے اور پھر اُسکی مصیبت دُور کردیتا ہے اور تمہیں زمین میں نیابت کا شرف بخشتا ہے، کیا اللہ کیساتھ کوئی اور اِلٰہ ہے؟ مگر تم لوگ بہت کم نصیحت مانتے اور اسے بہت کم یاد رکھتے ہو۔

+ + + +

یہی غلط ذہنیت ہے جو زندہ اور مُردہ بزرگوں کی تعظیم و تکریم میں غلو کرواتی اور بالآخر اُن کی پرستش و عبودیت تک لے جاکر چھوڑ دیتی ہے۔ یہاں تک کہ زندوں سے کہیں زیادہ مُردوں کی پرستش کی جاتی ہے اور یہ عقیدہ قائم کرلیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد تصرفات میں اور اُونچے ہوگئے ہیں۔ چنانچہ اسی عقیدہ سے اہلِ قبور کے ساتھ وہ وہ کچھ کیا جاتا ہے جو زندہ بزرگوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اہلِ قبور کی پرستش کی بھی تردید فرمائی ہے۔ چنانچہ سورۃ نحل کے دوسرے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ ٥ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ٥

اور وہ دوسری ہستیاں جنھیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں۔ وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مُردہ ہیں زندہ نہیں ہیں اور اُنکو کچھ معلوم نہیں کہ انھیں کب اُٹھایا جائیگا۔

ان دونوں آیتوں میں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی گئی ہے وہ نہ تو فرشتے اور شیاطین ہیں اور نہ لکڑی پتھر کی مورتیاں، بلکہ صرف اصحاب قبور ہیں۔ کیونکہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں ان پر اموات غیر احیاء کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ رہ گئیں لکڑی پتھر کی مورتیاں تو اُن کے لئے شعور و عدم شعور کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ بعث بعد الموت ہی اُن سے

تعلق ہے۔ لہٰذا الذین یدعون من دون اللہ سے صرف وہ غیر معمولی
انسان مُراد ہیں جن کی وفات کے بعد غالی معتقدین اُنھیں داتا، مشکل کشا،
فریادرس، بندہ نواز، غریب نواز، گنج بخش، دستگیر اور نہ معلوم کن کن القاب سے
ملقب کرکے اُن سے اپنی جملہ ضروریات وابستہ کردیتے ہیں اور پھر اُنھیں اپنی
ہر چھوٹی بڑی ضرورت یا مصیبت کے وقت پکارنے لگتے ہیں۔ نزولِ قرآن
کے زمانہ میں بھی مُردہ بزرگوں کی پرستش کا مرض بہت عام تھا۔ روایات میں آتا
ہے کہ اساف، نائلہ، لات، منات اور عزّیٰ وغیرہ اصل انسان تھے جنھیں
بعد کے جُہلاء نے بُت بنا ڈالا اور خدائی صفات سے متصف کردیا۔ آیتِ کریمہ۔
وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ
وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝ یعنی انھوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور
نہ وَدّ اور سُواع اور یغوث اور یعوق و نسر کو چھوڑنا۔ (سورۂ نوح رکوع ۲) کی
تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے جو الفاظ بخاری شریف میں مروی ہیں وہ یہ ہیں:

كلها اسماء رجال صالحين
من قوم نوح عليه السلام فلما
هلكوا اوحى الشيطان الى قومهم
ان انصبوا الى مجالسهم
التى كانوا يجلسون فيها
انصابا وسموها باسمائهم
ففعلوا فلم تعبد حتى اذا
هلك اولئك ونسخ العلم
عُبدت۔

یہ سب نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگوں کے نام
تھے۔ جب یہ مر گئے تو شیطان نے ان کی
قوم کو سمجھایا کہ جہاں یہ لوگ بیٹھتے تھے
وہاں ان کے مجسمے کھڑے کرلو اور ان کے نام ان
بزرگوں کے نام پر رکھ لو۔ چنانچہ انھوں نے
ایسا ہی کیا۔ اس وقت تک ان کی عبادت نہیں
ہوئی مگر جب یہ لوگ مرگئے اور علم جاتا رہا تو
اُن کی عبادت
ہونے لگی۔

اس روایت سے حسب ذیل اُمور بلا کسی تاویل وابہام کے خود بخود ثابت ہوتے ہیں:-

(۱) رجال صالحین ہمیشہ پوجے جاتے رہے ہیں۔

(۲) صالحین کو معبود بنانا قطعی طور پر "وحی شیطانی" کا نتیجہ ہے۔ اس کو وحی الٰہی یا مرضیاتِ الٰہی سے ذرہ برابر تعلق نہیں ہے۔

(۳) صالحین کی نشست گاہوں، عبادت گاہوں اور رہائش گاہوں پر یادگاری نشان کھڑے کر دینا بھی صریحاً لغو فعل ہے۔

(۴) استھانوں اور انصاب و نشانات کو بزرگوں کے نام سے موسوم کرنا بھی "وحی شیطانی" ہی کا نتیجہ ہے۔

(۵) صالحین کی عبادت اُن کی زندگی سے زیادہ اُن کی وفات کے بعد ہوتی رہی ہے۔

(۶) مُردہ بزرگوں کی پرستش محض جہالت کا کرشمہ ہے۔ اس کو علم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی بخشی ہوئی اعلیٰ درجہ کی بصیرت سے خوب جانتے تھے کہ رجالِ صالحین تو دراصل اپنے پورے وجود کے ساتھ دوسرے لوگوں کو صالحیت کا سبق دیتے ہیں۔ مگر کمزور ذہن اُلٹی صالحیت کا اُلٹا اثر قبول کیا کرتے ہیں اور اُن کی صالحیت رفتہ رفتہ اُلوہیت و معبودیت سے متصف کر دی جاتی ہے۔ اس لئے آپؐ نے مختلف موقعوں پر مختلف الفاظ اور عبارتوں میں اپنی اُمت کو قبروں کے ساتھ غیر معمولی اعتنا و اہتمام برتنے سے بار بار منع فرمایا ہے۔ مشکوٰۃ شریف کے باب دفن المیت میں بحوالہ مسلم حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ:-

نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ یُّبْنٰی عَلَیْہِ وَاَنْ یُّقْعَدَ عَلَیْہِ۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو گچ سے پختہ کرنے، اسپر عمارت بنانے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔

مشکوٰۃ کے اسی باب میں بحوالہ ترمذی حضرت جابرؓ ہی سے منقول ہے کہ:-

نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ تُجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ یُّکْتَبَ عَلَیْھَا وَاَنْ تُوْطَاءَ۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو گچ سے پختہ کرنے، اُنپر لکھنے اور اُن کو روندنے سے منع فرمایا۔

ان دونوں حدیثوں پر غور کیجئے۔ بنظر ظاہر قبروں کو پختہ کرنے اور ان پر مقبرے اور گنبد تعمیر کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو اس کے فوائد و مصالح بیان کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مگر حضورؐ خوب سمجھتے تھے کہ اگر اس اہتمام کا آغاز ہو گیا تو یہ اہتمام احترام تک اور احترام، سجدہ و طواف اور عبادت تک پہنچکر رہے گا۔ اس لئے آپؐ نے بالفاظ ہیج اس سے منع کر دیا تاکہ اُن راہوں کا سد باب ہی ہو جائے جہاں سے شرک دبے پاؤں داخل ہوتا ہے اور آگے چل کر خرافات و بدعات کا ایک طوفان اُٹھا دیتا ہے۔ رہ گیا قبروں پر بیٹھنا اور اُن پر لکھنا تو ظاہر ہے کہ خالی خولی بیٹھنا یا صرف صاحبِ قبر کا نام اور تاریخ وفات وغیرہ لکھنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ طلبِ حاجات کے لئے یا مراقبہ و مجاہدہ کی خاطر یا مجاور و خادم بن کر وہاں نہ بیٹھنا چاہئے اور آیات و احادیث یا ایسے اشعار اور فقرے، جن میں صاحبِ قبر کی حمد و ستائش نہایت مبالغہ کے ساتھ کی گئی ہو، لکھنے

سے پرہیز کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ سارے افعال بآسانی شرک و بدعت تک منجر ہوتے ہیں اور مقصود دراصل اسی راہ کو بند کرنا ہے۔ چنانچہ قبروں کو پختہ کرنا تو ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اونچی قبریں تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔

ابو الہیاج اسدی کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے مجھ سے فرمایا:۔

"کیا میں تم کو ایسے کام کے لئے نہ بھیجوں جس کے لئے خود مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا اور وہ یہ ہے کہ تم کسی مورت کو مٹائے بغیر اور کسی اونچی قبر کو برابر کئے بغیر نہ چھوڑو۔" (مشکوٰۃ باب دفن المیت بحوالہ مسلم)

یہی تعلیم تھی جس کی بنا پر قبے اور عالیشان عمارتیں بنانا تو درکنار صحابہ کرام کسی قبر پر معمولی سا شامیانہ یا سائبان تک دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے عبد الرحمٰن کی قبر پر ایک شامیانہ لگا ہوا دیکھا تو فرمایا:۔

یا غلام انزعہ انما یظلہ عملہ۔ اے لڑکے! اس کو الگ کر دے، ان پر تو ان کا عمل سایہ کر رہا ہے)

ان مشروعات کا راستہ جن جن مفاسد و قبائح تک پہنچتا ہے۔ اُن کی نسبت بھی حضورؐ کے احکام نہایت صاف و صریح ہیں۔ مثلاً فرمایا:۔

لَا تجعلُوا قبرِی عِیداً۔ میری قبر کو "عید" نہ بناؤ۔ (مشکوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی بحوالہ نسائی۔ بروایت ابوہریرہؓ) ایک اور جگہ ہے:۔

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبرِی وَثَناً یُعْبَدُ اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا کہ پوجی جائے۔ (مشکوٰۃ۔ باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ۔ بحوالہ مالک بروایت عطاء)

قبروں کا بت بنا کر پوجا جانا تو ایک صاف و صریح بات ہے جسکی تشریح کی

حاجت نہیں۔ البتہ لفظ "عید" کچھ تشریح طلب ہے۔ عید عربی لغت میں اُس چیز کو کہتے ہیں جو عود کرے یعنی بار بار آئے۔ چونکہ خوشی اور جشن کا روز سال بہ سال آتا رہتا ہے اس لئے اسے بھی عید کہا جاتا ہے۔ عید بلا تعین روز و تاریخ نہیں آتی، بلکہ اُس کی ایک تاریخ معین ہوتی ہے، جس میں لوگ جمع ہوتے اور خوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی دعا منقول ہے کہ انھوں نے کہا تھا:۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا۔

اے اللہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما تاکہ وہ ہمارے لئے ہمارے اگلے پچھلے سب لوگوں کیلئے ایک خوشی کا دن قرار پائے

یہود و نصاریٰ اپنے بزرگوں کی قبروں پر سال بہ سال جمع ہوتے اور میلے لگایا کرتے تھے۔ سرکار رسالت مآبؐ نے اپنی اُمت کو حکم دیا کہ اس طرح روز و تاریخ معین کرکے میری قبر پر اجتماع نہ کرو جیسا کہ خوشی اور جشن کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ پھر دوسری حدیث میں وہ غرض بھی واضح فرمائی ہے جس کے لئے یہ میلے ٹھیلے اور اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ یعنی قبر کو بت بنا کر پوجنا۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ جب حضورؐ ہی نے اپنی قبر پر میلوں اور اجتماع کو پسند نہ فرمایا اور نہ یہ پسند کیا کہ قبرِ مبارک ایک بُت بن کر رہ جائے، جس کی پرستش ہوتی رہے۔ یہاں تک کہ اس کے لئے خدا سے دعا بھی مانگی تو پھر دوسروں کو یہ حق کہاں سے پہنچ سکتا ہے کہ اُن کی قبریں بُت بنا کر پوجی جائیں اور سال بہ سال نہایت شان و اہتمام کے ساتھ وہاں میلے لگتے رہیں۔

اس امرِ واقعی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ حضورؐ افضل المرسلینؐ خاتم النّبیین ہیں اور پوری کائنات میں خداوند قدوس کے بعد آپ ہی کی ہستی بزرگ ترین ہستی ہے۔ اگر خدا کے سوا کسی اور چیز کی عبادت جائز ہوتی اور مزاروں

سالانہ اجتماعات کسی درجہ میں بھی محمود و مقصود یا کم از کم جائز ہوتے تو حضورؐ کی قبر مبارک اس کی اولین مستحق تھی۔ مگر جب حضورؐ نے خود اپنی ذات کے لئے بھی اس کی نہی فرمادی تو پھر کسی دوسری قبر کے لئے اس کا تصور تک کرنا ایمان کو متزلزل کرنے کیلئے کافی ہے۔ رہ گئے اس کے لئے جواز و استحباب پیدا کرنے کی کوشش کرنے والے، یا اسے ضروری اور لازم قرار دینے والے۔ سو حضورؐ کے صریح ارشادات کی روشنی میں اُن کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیئے۔

حضورؐ کے بعد پوری اُمت میں سب سے افضل صحابۂ کرامؓ کی جماعت ہے لیکن کسی صحابی کے متعلق یہ سُننے میں نہیں آیا کہ اُن کی قبر کو بھی بُت بنا کر پُوجا گیا ہے اور "عرس" کے نام سے وہاں سالانہ اجتماع منعقد ہوتا رہا ہے۔ پس پوری اُمت میں سے چند مخصوص اولیاء و صوفیاء کی قبروں کے ساتھ یہ سارا معاملہ بیّن طور پر انتہائی فسادِ عقیدہ کا مظہر ہے جس سے ہر متبعِ شریعت مسلمان کو توبہ کرنی چاہئے۔

قبروں کی عبادت کا ایک جزو اور نہایت اہم جزو یہ ہے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی حضورؐ کے ارشادات نہایت واضح ہیں مثلاً حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا:-

لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی	اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے۔ انھوں نے
اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَآئِھِمْ	اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ (مشکوٰۃ
مَسَاجِدَ۔	باب مساجد و مواضع الصلوٰۃ بحوالہ صحیحین)

یہی ارشاد حضرت ابوہریرہؓ کے واسطے سے بھی منقول ہے۔ جسے بخاری و مسلم کے علاوہ ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ مشکوٰۃ کے مذکورۂ بالا باب میں مسلم کے حوالے سے ایک اور حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:-

اَلَا وَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا	خبردار ہو! تم سے پہلے کے لوگ اپنے انبیاء

يَتَّخِذُونَ قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّيْ اَنْهَاكُمْ مِنْ ذَالِكَ۔

وصالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے پس تم کہیں قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنا لینا۔ میں تمہیں اس فعل سے منع کرتا ہوں۔

+ + + +

یہاں یہ امر بھی لائق ذکر ہے کہ انبیاء وصالحین کی قبروں کو سجدہ کرنا تو ایک طرف خود امام الانبیاءؐ نے اپنی زندگی میں اپنی ذاتِ بابرکات کے لئے بھی سجدہ کو جائز نہیں رکھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ مہاجرین اور انصار کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک اُونٹ آیا اور اُس نے حضور کو سجدہ کیا۔ اس پر اصحابؓ نے کہا کہ:۔

يَسْجُدُ لَكَ الْبَهَائِمُ وَالشَّجَرُ فَنَحْنُ اَحَقُّ اَنْ نَسْجُدَ لَكَ۔

جانور اور درخت آپکو سجدہ کرتے ہیں۔ پس ہم تو آپکو سجدہ کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔

آپ نے فرمایا:۔

اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَاَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ۔

عبادت صرف اپنے رب کی کرو رہ گیا تمہارا بھائی تو اس کا صرف اکرام کیا کرو۔

ملاحظہ کیجئے مشکوٰۃ باب عشرت النساء بحوالہ امام احمد بروایت حضرت عائشہؓ

اس حدیث میں عبادت اور اکرام کا فرق بھی بتا دیا گیا ہے اور رب کے مقابلہ میں دوسرے سارے انسانوں کو "بھائی" کہہ کر یہ امر بھی ذہن نشین کر دیا گیا ہے کہ ان میں باہمی کتنا ہی فرقِ مراتب ہو، بہرحال وہ عبدیت کے رشتہ سے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس اُن کا اکرام تو جائز ہے۔ لیکن اس میں غلو کرکے عبادت تک نوبت پہنچا دینا فی الجملہ حرام ہے۔

جو قبریں سجدہ گاہ تک کا مرتبہ حاصل کر چکی ہوں، نا ممکن ہے کہ لوگ اُن پر

دُور دراز سے سفر کرکے سازوسامان ساتھ لئے نہایت اہتمام کیساتھ حاضری نہ دیں۔ چنانچہ اسفارِ زیارت کا رواج عہدِ جاہلیت میں بھی تھا اور آج بھی اس کا مشاہدہ ہر جگہ کیا جاسکتا ہے۔ حضورؐ نے اسے ممنوع قرار دیتے ہوئے صاف فرمایا کہ:۔

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَۃِ مَسَاجِدَ المسجد الحرام والمسجد الاقصٰی ومسجدی ھٰذا (مشکوٰۃ۔ باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ بحوالہ صحیحین بروایت ابوسعید خدری)۔ مطلب یہ ہے کہ زیارت کے واسطے کسی استھان یا مکان تبرک کو سفر کرکے جانا درست نہیں ہے۔ اس قسم کا سفر صرف تین مسجدوں کے لئے جائز ہے۔ ایک مسجدِ حرام یعنی کعبہ شریف۔ دوسری مسجد اقصیٰ۔ تیسری مسجد نبویؐ۔ اس حدیث سے اسفارِ زیارت کی نوعیت خود بخود متعین ہو جاتی ہے۔

جو لوگ ان تمام تنبیہات کے باوجود "زیارتِ قبر" کے نام سے "عبادتِ قبر" کرتے ہیں وہ دیدہ و دانستہ خدا کی لعنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اس معاملہ میں مرد و عورت دونوں یکساں ہیں۔ لیکن زائرین کے مقابلہ میں زائرات کے لئے اعتقادی و اخلاقی فتنوں میں مبتلا ہونے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ اُن پر حضورؐ نے لعنت فرمائی ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ "لعن اللّٰہ زائرات القبور" احمد، ترمذی اور ابنِ ماجہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ لعن اللّٰہ زوارات القبور"۔

اُوپر کی توضیحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قبر پرستی اور اولیاء پرستی بالیقین "شرک" کی تعریف میں داخل ہے۔ لہذا اب شرک کی اہمیت بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے:۔

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کی جو نصیحتیں

نقل فرمائی ہیں اُن میں ایک فقرہ یہ ہے:۔

يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۔	بیٹا! اللہ کا شریک نہ کرنا۔ بلاشبہ شرک بڑا ظلم ہے۔[1]

قرآن میں "ظلم" بالعموم گناہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پس شرک اس لحاظ سے ایک بڑا گناہ قرار پاتا ہے۔ لیکن قرآن ہی بتاتا ہے کہ اس گناہ کی حیثیت دوسرے گناہوں سے بالکل مختلف ہے۔ دوسرے گناہ چاہے وہ بجائے خود کتنے ہی بڑے ہوں لائقِ معافی ہیں، لیکن شرک بالکل ناقابلِ معافی جرم ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى إِثْمًا عَظِيمًا ؎	یقیناً اللہ اس امر کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے۔ ہاں اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں انھیں وہ جس کے لئے چاہے گا معاف کر دیگا۔ کیونکہ جس نے اللہ کا شریک قرار دیا، اُس نے ایک بڑا گناہ اور افترا کیا۔[2]

+ + + +

---

[1] حضرت لقمان چونکہ بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے اسلئے اسکی فہم و ذکا کے مطابق انھوں نے شرک کو صرف ظلم عظیم کہکر چھوڑ دیا مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے ایک ایک فرد کو بلا لحاظ خورد و کلاں بلا لحاظ عام و خاص جو نصیحت فرمائی ہے وہ سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:۔ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ وَإِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ۔ (مشکوٰۃ باب الکبائر بحوالہ احمد بروایت معاذ بن جبل) یعنی اللہ کا شریک نہ ٹھیرانا اگرچہ تو قتل کر دیا جائے یا جلا ڈالا جائے ۱۲

[2] ایک حدیث قدسی میں یہی مضمون ان الفاظ نقل کیا گیا ہے:۔ يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ لَوْ لَقِيْتَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيْتَنِيْ لَا تُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً (مشکوٰۃ باب الاستغفار بحوالہ ترمذی بروایت حضرت انس رض) یعنی اے ابن آدم! جب تو مجھ سے ملے تو چاہے زمین بھر گناہوں کا بوجھ لئے ہوئے ہو مگر مجھ سے ملے اس حالت میں کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ قرار دیا ہو تو یقیناً میں تیرے پاس زمین بھر بخشش لے آؤں ۱۲

حضرت لقمانؑ کی نصیحت میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے اسے اثم عظیم فرمایا ہے اور اس پر لفظ "افترا" ایزاد کیا ہے جو جھوٹ تصنیف کرنیکا ہم معنی ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دوسرے گناہ تو کسی نہ کسی عارضی سبب سے سرزد ہوا کرتے ہیں۔ لیکن شرک کی سرے سے کوئی علت ہی نہیں۔ یہ محض انسان کے توہم پرستانہ ذہن کی خلاقی ہے۔ آیتِ شریفہ میں مَا دُوْنَ ذٰلِکَ گناہوں کی معافی کا جو اعلان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک سے بچا رہے۔ باقی دوسرے گناہ خوب دل کھول کر کرتے جائیں۔ بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک کو ایک بہت معمولی گناہ نہ سمجھا جائے۔ یہ تو تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ یہانتک کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے، مگر یہ گناہ قطعی طور پر ناقابلِ معافی ہے۔ اس سے ان لوگوں کا بر سرِ غلط ہونا پوری طرح واضح ہوتا ہے جو شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے ہیں، بلکہ ان کا سارا وقت فقیہانہ جزئیات کی ناپ تول ہی میں صرف ہوتا رہتا ہے۔ لیکن شرک اُن کی نگاہ میں اتنا ہلکا فعل ہے کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ طرح طرح کی تاویلوں اور تحریفوں سے شرک کو توحید کا لباس پہنانے میں بھی تامل نہیں کرتے اور تحریف کا کمال یہ ہے کہ شرکِ خفی کو شرکِ جلی تک بنا ڈالتے ہیں۔

اسی سورہٴ نساء میں چند رکوع آگے ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ	یقیناً اللہ شرک کو معاف نہیں کریگا۔ البتہ اس کو چھوڑ کر دوسرے گناہ جس کے لئے چاہے گا معاف کر دیگا۔ جو شخص اللہ کا شریک

فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيْدًا ٥ (رکوع ۱۸) قرار دیتا ہے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

یعنی دوسرے گناہوں کے ارتکاب میں بھی آدمی وقتی طور پر راہِ ہدایت سے انحراف کر جاتا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت کیچڑ سے بھری ہوئی چکنی زمین پہ چلنے والے کی لغزش کی سی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ایک مشرک راہِ ہدایت سے ہٹ کر اتنی دور نکل جاتا ہے کہ ضلالت کے جنگل ہی میں سرگشتہ و حیران ہو کر رہ جاتا ہے اور راہِ ہدایت اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں اُس کی سرگشتگی اُس کی تباہی پر ختم ہوتی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو نہایت بلیغ الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔ سورۂ حج میں ہے :۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ٥ (رکوع ۴)

جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ گویا آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اُسے پرندے اُچک لیجائینگے یا ہوا اسکو ایسی جگہ لیجا کر پھینک دیگی جہاں اس کی ہڈیاں پِس کر رہ جائیں گی۔

یہ تو شرک کا دُنیوی انجام ہے۔ رہ گیا اُخروی انجام تو سورۂ مائدہ میں فرمایا کہ :۔

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ٥ (رکوع ۱۰)

جو شخص اللہ کا شریک قرار دیتا ہے اُس پر اللہ نے جنّت حرام کر دی ہے اور اُس کا ٹھکانا آگ ہے ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

یہی شرک ہے جس کے متعلق سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ نے کم و بیش ۱۸ پیغمبروں کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (ملاحظہ فرمایئے رکوع ۱۰) یعنی اگر ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا کیا کرایا سب غارت ہو جاتا۔

ہم پوچھتے ہیں کہ شرک سے متعلق اس سے زیادہ تصریحات اور کیا ہو سکتی ہیں؟ جب انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ جماعت کے اعمال بھی شرک کی وجہ سے قابلِ حبط قرار پا سکتے ہیں تو وہ دوسرے کون ہیں جنھیں "شرک" کے بعد اپنے اعمال کی کوئی جزا ملنے یا شرک کی سزا سے بچ رہنے کا اطمینان حاصل ہے؟ شرک تو ظلمِ عظیم ہے اور ایسے تمام ظالموں کے لئے اللہ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ ان کا کوئی مددگار نہیں۔ اب نہیں معلوم اللہ کے ارشاد کے مقابلہ میں کس کے "ارشادات" ظالموں کو کہیں سے مدد پہنچنے کا یقین دلا رہے ہیں۔

(۲)

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر قبر پرستی، اولیاء پرستی اور اس کے سارے لوازم و مقتضیات شرک یا قریب بہ شرک یا شرک کی طرف لے جانے والے وسائل و ذرائع ہیں تو پھر قرآن و حدیث کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں خود مسلمانوں کے اندر اس کا کثرتِ شیوع اس حد تک کیسے پہنچ گیا کہ آج شاید کوئی شہر، کوئی قصبہ اور کوئی گاؤں ایسا نہیں جو اس کی پرچھائیں سے محفوظ رہا ہو۔ سو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ۔ یعنی پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں۔ اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہارے لئے کتنی ہی تعجب انگیز کیوں نہ ہو اور دوسرا جواب ـــــ یہ ہے کہ یہ سب کچھ علمِ دین کی کمی اور انتہائی کمی کی وجہ سے ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس معاملہ کے بہت سے تاریخی، نفسیاتی اور داخلی و خارجی اسباب بھی ہیں۔ جن کی طرف ہم یہاں مختصراً اشارہ کئے دیتے ہیں۔

مسلمانانِ ہند کی پچھلی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام کسی منظم کوشش کے نتیجہ میں نہیں پھیلا ہے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر عمومی حالت یہ رہی ہے کہ بالکل ایک غیر منظم طریقہ سے کہیں کوئی صاحب علم آ گئے جن کے اثر سے کچھ مسلمان ہو گئے۔ کہیں کوئی تاجر پہنچ گیا جس کے ساتھ ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا اور کہیں کوئی نیک نفس اور خدا رسیدہ بزرگ تشریف لے آئے جن کے بلند اخلاق اور پاکیزہ زندگی کو دیکھ کر بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ بلکہ بہت سے تاریخی تذکرے تو اس امر کی شہادت بھی دیتے ہیں کہ بہت سے غیر مسلم اسلام کے ابتدائی مقتضیات تک کو جانے بوجھے بغیر محض خوارق و کرامات کے مشاہدہ سے مسلمانوں میں آ شامل ہوتے رہے۔ اس حالت میں ضروری تھا کہ جو لوگ مسلمان ہوتے چلے گئے اُن کے فکر و عمل میں وہ پورا انقلاب لایا جاتا جو اسلام میں مطلوب ہے۔ کیونکہ تاریخ و نفسیات پر اور بالخصوص اسلام و جاہلیت کی کشمکش پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی دوسرے مذہب سے نکل کر اسلام میں آ جانا جتنا آسان ہے، اعتقادات و خیالات سے لیکر رسوم و اعمال تک کے ایک ایک گوشہ میں پوری طرح اسلامی روح کو جذب کرنا اُتنا آسان نہیں ہے۔

اس کے لئے باقاعدہ تعلیم و تربیت اور ایک مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے اور خود حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ دین اور سعی اصلاح اس پر شاہد ہے کہ جاہلیت سے نکل کر آنے والے لوگوں کو اسلام کے معیارِ مطلوب تک پہنچانے کے لئے آپ نے مستقل اور مسلسل کتنی توجہ فرمائی اور اس کے باوجود عرب کی ابتدائی معاشرے میں کبھی کبھار جاہلی فکر ابھر آتی تھی۔ یہ منظم اور انتھک جد و جہد کی ضرورت اُس ملک اور اس معاشرہ میں اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے جہاں مشرکانہ عقائد اور مشرکانہ خیالات و توہمات دل و دماغ میں خوب گہرے اُترے ہوئے ہوں اور

مشرکانہ اعمال و رسوم انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ کو پوری طرح اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہوں۔ اس لحاظ سے سرزمینِ ہند جو حیثیت رکھتی ہے اُس سے کون واقف نہیں۔

پس یہ نہایت ضروری تھا کہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اسکے استحکام کا اُتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہتمام کیا جاتا۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ علماء نے اپنے مدرسوں اور تعلیمی خدمات کے ذریعہ اور صوفیاء نے اپنی خانقاہوں اور اپنے سلسلۂ بیعت و ارشاد کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی اپنی سی کوششیں جاری رکھیں اور مسلمانوں کے فکر و عمل میں جتنی روشنی پیدا ہو سکی اور ترقی کرتی گئی، وہ انہی بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مگر ایک طرف تو اُن کے پاس ایسے ذرائع نہ تھے کہ نہایت وسیع پیمانہ پر دائرۂ اسلام میں آنے والے لاکھوں کروڑوں افراد کی مکمل اصلاح کر دیتے دوسری طرف اُن کی کوششوں اور کاوشوں کے اثرات فطرتاً اُونچے اور متوسط طبقہ پر ہی پڑ سکتے تھے اور انہی طبقوں نے کم و بیش فائدہ بھی اُٹھایا۔ لیکن عوام الناس توحید کے تقاضوں سے بے خبر اور آبائی عقائد و اوہام میں مبتلا رہے۔

اسلام پھیلانے والے بزرگوں کی مساعیٔ جمیلہ کو پوری طرح کامیاب بنانے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وقت کی حکومتیں اُن کے ساتھ تعاون کرتیں اور دوسرے مذاہب سے نکل نکل کر آنے والے تمام مسلمان فرداً فرداً نہ سہی، کم از کم اپنی ایک معتدبہ اکثریت کے ساتھ انفرادی و اجتماعی حیثیت سے اسلام میں پوری طرح جذب ہو جاتے۔ اسلامی حکومت تو غیر مسلموں کے لئے دعوتِ اسلام کا ایک بہترین عملی مظہر اور مسلمانوں کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک منظم ادارہ ہوا کرتی ہے۔ اس لئے مسلم حکمرانوں کا کام یہ تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ اسلام کی توسیع کی اور نظامِ تعلیم و نظامِ قانون و سیاست کے ذریعہ اسلام کے استحکام کی کوشش کرتے مگر یہاں

جو لوگ فتح و ظفر کے جھنڈے اُڑاتے درّۂ خیبر سے آگے بڑھے اور اندرونِ ملک
چاروں طرف پھیل گئے، وہ خود نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اسلام بھی
اُس وقت لائے تھے جب خود اس کے تہذیبی مرکزوں (حجاز، عراق اور شام وغیرہ)
میں انحطاط رونما ہو چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ملک گیری اور کشور کشائی ہی
کو زیادہ تر اپنا نصب العین بنایا اور دُنیوی عیش و تنعّم ہی کو بہت کچھ سمجھ بیٹھے۔ اس
صورتِ حال میں ان کی حکومتیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا معیاری ادارہ نہیں
بن سکتی تھیں اور نہ بنیں۔

یہ حکومتیں اسلامی دعوت و تبلیغ کا کام تو کیا انجام دیتیں۔ جن اللہ کے بندوں
نے یہ کام شروع کر رکھا تھا اور جس کے لئے انھوں نے اپنی زندگیاں وقف کر دی
تھیں۔ اُن کے ساتھ تعاون تک نہ کیا، بلکہ کتنے ہی وقتوں اور موقعوں پر وہ اپنے
سارے وسائل و ذرائع اور اپنے سارے حاکمانہ اختیارات کے ساتھ اُن کی راہ میں
حائل ہوئیں اور ان بیچاروں کو درباری اثر و رسوخ اور شاہی اقتدار کا سخت مقابلہ
کر کر کے اپنا کام جاری رکھنا پڑا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ سخت سے سخت مظالم
کا تختۂ مشق بنے اور طرح طرح کی سختیاں جھیلتے رہے۔ اگرچہ تختِ سلطنت پر جلوہ فروز
ہونے والے سارے ہی مسلمان بادشاہ نااہل و ناکارہ اور فاسق و فاجر نہیں تھے انہیں
شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود، محمد تغلق، فیروز تغلق، سکندر لودی اور ایسے
ہی بعض دوسرے فرمانروا بھی گذرے ہیں۔ جنھوں نے نیکی اور پاکیزگی کے لحاظ
سے تاریخ میں ایک خاص مقام پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کی دینداری اول تو شخصی دینداری
تھی، دوسرے اُنھوں نے شرک کو مٹانے اور توحید کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے
لئے تعلیم و تربیت اور تنفیذِ قوانینِ الٰہیہ کی جو کوششیں کیں وہ مسلمانوں کی روز افزوں
آبادی میں اُن کے ایک ایک فرد کے اندر شرک کے جراثیم کو پوری طرح ہلاک کر دینے

کے لئے کافی نہیں تھیں۔ پھر موروثی شاہی نظام اُن کے پوری طرح کامیاب ہونے میں بھی مانع تھا۔ کیونکہ آئے دن اچھے اور بُرے افراد کا ادل بدل ہر اصلاحی کوشش پر اثر انداز ہوتا اور یہ کوششیں اپنے پورے نتائج تک پہنچنے بھی نہ پاتیں کہ اس طرح ختم کر دی جاتیں گویا یہاں دین کی خدمت اور اصلاح حال کا کوئی کام کیا ہی نہیں گیا۔ اس لئے شرک اپنے پَر پُرزے نکالتا ہی رہا اور اس کی سمیت سے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کا ذہن متاثر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک وہ دَور بھی آگیا کہ "شرک" کو باقاعدہ سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی۔

یہ مغلیہ خاندان کے مشہور بادشاہ اکبر کا دَور تھا، جس میں اگرچہ کائناتی قیامت نہ آئی نہ سہی، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دینِ اسلام پر قیامت آگئی۔ یہ شخص اَن پڑھ تھا اور اس کے درباری و مصاحب سخت گم کردہ راہ۔ اس کے منحوس دَور میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے دائرہ میں شرک اپنے عالم آشوب ناز و انداز کے ساتھ پورے کبر و افتخار کا مظاہرہ کرتے ہوئے داخل ہوا، بلکہ سرے سے دینِ اسلام ہی پر خطِ تنسیخ پھر گیا اور بادشاہ کی خدمت میں ایک محضر نامہ پیش کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ :-

"بادشاہ ظل اللہ ہے، مہدی ہے، صاحبِ زماں ہے، امامِ عادل ہے، مجتہد العصر ہے، کسی کا پابند نہیں، اُس کا حکم سب پر بالا ہے۔"

چنانچہ اسے معصومیت کی سند دے دی گئی اور وہ اپنی عقل کو بھی معصوم سمجھنے لگا۔ ایک صاحب تو یہانتک بڑھے کہ اکبر کو خدا کا عکس ہی ٹھیرا دیا۔ بس پھر کیا تھا ایک نئے دین کی بنیاد پڑ گئی۔ اس نئے دین کا نام برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق "دین الٰہی" رکھا گیا اور اس کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ تجویز کیا گیا۔ جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے ان کو "دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ ام" سے توبہ کرنی پڑتی اور ان کو لفظ "چیلہ" سے تعبیر

کیا جاتا۔ بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھا۔ چیلوں کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی، جسے وہ پگڑی میں لگاتے۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا۔ اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری دی جاتی تو اُس کے سامنے سجدہ بجالایا جاتا۔ درباری علماء و صوفیاء بے تکلف سجدہ فرماتے اور اس صریح شرک کو "سجدۂ تحیۃ" اور "زمیں بوسی" جیسے الفاظ کے پردہ میں چھپاتے۔ اکبری محل میں دائمی آگ کا الاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنے کے وقت قیام تعظیمی کیا جانے لگا۔ حضرت مریمؑ کو بھی معبود بنایا گیا اور ستاروں کی پرستش بھی کی گئی۔ خود اکبر نے مشرک عورتوں سے شادیاں کیں، جس کی وجہ سے قصر شاہی میں ہندو تہذیب و معاشرت کا سکہ چلنے لگا۔ اُن کے لئے قصر میں خاص عبادت خانے بنائے گئے اور بتوں کی پوجا کا باقاعدہ انتظام ہوا۔ ہندو تہوار دیوالی، دسہرہ، راکھی پونم، شیوراتری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں ہوم کی رسم ادا کی جانے لگی۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ناموں کا جاپ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام زبان پر آتا تو "جلت قدرتہ" کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ دوش و کمر پر جنیو ڈالا جاتا اور گائے کی تعظیم کی جاتی۔

اب آپ ایک طرف اکبری حدود سلطنت اور حکومت کی اسلام دشمنی پر نظر کیجئے اور دوسری طرف اُن کروڑوں مسلمانوں کا تصور کیجئے جو لاکھوں مربع میل زمین میں پھیلے ہوئے اپنے غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے اور پھر اندازہ لگائیے کہ جب ایک عظیم الشان شاہی حکومت کفر و شرک کی علمبردار ہو تو لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی باقاعدہ دینی تعلیم و تربیت اور اُن کی مکمل ذہنی اصلاح کے لئے ان چند علماء و صوفیاء حق کی

کوششیں کس حد تک مفید ہو سکتی ہیں جو حکومت کے ذرائع و وسائل سے نہ صرف محروم ہو کر بلکہ اُن کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے متفرق طور پر اپنا کام کر رہے ہوں۔

کم و بیش ربع صدی تک "دینِ الٰہی" کی قاہرانہ سرپرستی کر کے جب اکبر دُنیا سے رخصت ہوا تو جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ تعزیر و سیاست میں اسکا عدل عام طور پر مشہور ہے۔ لیکن خود دینِ اسلام پر اُس نے اتنا بڑا ظلم کیا کہ محض سجدۂ تحیہ نہ کرنے کے جُرم میں خدا کے ایک صالح و مصلح بندہ کو اُس نے جیل میں بھیجدیا۔ جہاں تک اقامتِ توحید، ازالۂ شرک، احیاءِ سنت اور امحاءِ بدعت کا تعلق ہے، نہ صرف شخصی زندگی میں بلکہ حکومت کے تمام ممکنہ وسائل و ذرائع کے ساتھ پُوری اجتماعی زندگی میں اس کی مکمل جدوجہد کرنیوالی مغل حکمرانوں میں صرف ایک ہی شخصیت تھی اور وہ ہے حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت۔ عالمگیر نے مشرکانہ خیالات و نظریات کی اصلاح کرنے اور مشرکانہ رسوم و رواجات کو دیس نکالا دینے کے لئے نصف صدی تک جہاد کیا۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کی حکومت بھی موروثی حکومت تھی۔ اس لئے اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی اُن کے نااہل اور بدکار جانشینوں نے اُن کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

آپ اس وقت سے لے کر مسلم حکومت کے خاتمہ تک تختِ دہلی پر بیٹھنے والے بادشاہوں کے حالات و خیالات کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس وقت ہندوستان پر ایک قیامت کی سی تاریکی مسلط تھی۔ اُس زمانہ میں نہ صرف اعتقادی خرابیاں پرورش پاتی رہیں، بلکہ اخلاقی بے حیائیوں اور بے راہ رویوں کا بھی وہ طوفان اُٹھا کہ اُس نے مسلمانوں کے پُورے

نظامِ اجتماعی کو تہ و بالا کر ڈالا۔ اس زمانہ میں فرج و شکم کی جس جس طرح پوجا کی گئی اور سلاطین و اُمراء نے بدکاریوں اور بد اخلاقیوں کے جس جس طرح مظاہرے کئے اُس کے تذکرے تاریخ کے اوراق میں پڑھ کر ایک مسلمان کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے دُنیوی فوائد و لذائذ ہی کو معبود بنا کر پوجا ہو، اُنھیں شرک و توحید کی بحث سے کیا تعلق رہ سکتا ہے۔ اگر قبریں پُج رہی ہوں تو کیا مضائقہ ہے۔ اگر اولیا پُوجے جا رہے ہوں تو کیا بُرائی ہے اگر مشرکانہ بدعات کا زور ہے تو ان کا کیا بگڑتا ہے۔ اگر شرک نے پھیل کر پوری زندگی کو لپیٹ میں لے لیا ہے تو اس سے اُن کا کیا نقصان ہے چنانچہ یہی صورتِ حال تھی جس میں قانونِ الٰہی کے مطابق مسلمانوں کو تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا اور ایک غیر مسلم قوم نے چیرہ دست ہو کر اپنی حکومت کے لادینی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے نہ صرف مذہب کے دائرہ کو سیاست سے الگ کر لیا۔ بلکہ اپنے نظامِ تعلیم و تربیت، اپنے نظامِ تہذیب و تمدن اور اپنے نظامِ معیشت و معاشرت کے تسلط سے کروڑہا کروڑ مسلمانوں کو دین سے بیگانہ بنا ڈالا

پھر جب اس قوم کا تسلط ختم ہوا اور یہ ملک دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا تو جس حصۂ ملک پر ہندو حکمران ہو گئے وہ تو بہرحال شرک سے پاک نہیں ہو سکتا مگر جس حصہ پر مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہوئی، وہاں بھی انتہائی منظم اور باقاعدہ اصلاحی کوششوں اور ہر طرح کی قربانیوں کے باوجود [illegible] ہو گئے ابھی وہ اصلاح مکمل نہیں ہو سکی۔ جس کے نتیجہ میں شرک اور اس کے لوازمات کو پوری طرح ملک بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو گمراہیاں صدیوں تک پلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہیں اُنھیں قدامت کی

وجہ سے خواہ مخواہ تقدس اور بزرگی کا مقام حاصل ہوتا چلا جاتا ہے اور اُنکی اصلاح کا کام بھی اسی مناسبت سے نہایت مشکل اور دیر طلب ہوتا ہے۔

ان گمراہیوں کی شراب کو جس چیز نے دو آتشہ بلکہ ہزار آتشہ بنا دیا وہ بندۂ زر علماء اور دُنیا پرست صوفیاء کا وجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ لوگ ان گمراہیوں کی حمایت کرنے، شرک پر توحید کا پردہ ڈالنے، بدعت کو سُنت بنانے اور مشرکانہ طور طریقوں کو سندِ جواز دینے کے لئے موجود نہ رہتے تو مسلمانوں کو غلط کار حکمرانوں اور غیر اسلامی حکومتوں سے جتنا نقصان پہنچا اُس کا آدھا حصہ بھی نہ پہنچتا۔ انھوں نے عوام کو بھی گمراہ کیا اور حکومتوں کو بھی غلط راستہ پر ڈالا۔ آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ جہاں چند علماء صوفیاء حق دینِ اسلام کی اقامت و حمایت میں جانیں لڑا رہے ہیں وہیں ایسے مولوی اور صوفی بھی موجود ہیں جو "جی حضوری" بن کر اہلِ جاہ و منصب اور اربابِ اقتدار و حکومت کی غلط بینی و غلط کاری میں اُن کے ساتھ ہیں۔ انھی کی سازشوں سے اہلِ حق پر بڑی بڑی آفتیں آئیں اور وہ سخت سے سخت مصیبتوں میں گرفتار ہوئے۔ اگر یہ ظالم ضلالتوں سے صرف رواداری برتتے یا گمراہوں اور غلط کاروں کا صرف ساتھ دینے پر اکتفا کرتے تو یہ بھی کسی بڑے مفسدہ کا موجب نہ تھا۔ مگر انھوں نے عوام اور اہلِ حکومت دونوں کے اندر اپنا تقدس قائم کرنے اور اُن کو اُن کی ضلالتوں پر مطمئن کر دینے کے لئے قرآن و حدیث کو بھی خوب خوب استعمال کیا اور چونکہ یہ عوام اور اہلِ حکومت کے رہنما نہیں رہے ہیں، بلکہ ان کا کام صرف ان کی چشم ابرو کی طرف دیکھنا اور اُن کی شہوات و مرضیات کا اتباع کرنا ہی رہا ہے اس لئے جو جو کچھ وہ کہتے اور کرتے رہے۔ یہ قرآن و حدیث کی رُو سے اُسے جائز بتاتے رہے اور آیات و احادیث کو توڑنے مروڑنے اور اُنھیں اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے بڑی دیدہ ریزی

سے کام لیا اور جہاں اس کی بھی گنجائش نظر آئی وہاں ضعیف و موضوع روایات اور من گھڑت کہانیوں کا سہارا ڈھونڈا اور اس کا بھی ایسا انبار لگایا کہ حق کا علم ہی اس کے نیچے دب کر رہ گیا۔ کہیں باطل کو حق کا رنگ دیا گیا اور کہیں حق و باطل کو ایسا گڈمڈ کر دیا گیا کہ لوگوں کے لئے حق کی صورت پہچاننا مشکل ہو گیا۔

اس قماش کے لوگوں کے تمام کارناموں کو چھوڑ کر اگر صرف ان کی تحریری و تصنیفی کاوشوں پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے لے کر بڑی بڑی کتابوں بلکہ قرآن کی تفسیروں تک انھوں نے اتنا زبردست لٹریچر مہیا کر دیا ہے کہ آج جو بات کسی جاہل کے منہ سے نکلتی ہے چاہے وہ کتنی ہی غیر معقول اور بے ہودہ ہو اور جو کام جاہل لوگ کرتے ہیں چاہے وہ کتنا ہی غلط اور بے ڈھنگا ہو، اس کی تائید و تصویب میں بآسانی بیسیوں تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہی تحریریں لوگوں کا مرجع ہیں اور چونکہ ان تحریروں میں قرآن و حدیث کا نام بھی بار بار آتا ہے۔ اس لئے لوگوں کو اس بات کا پورا اطمینان حاصل ہے کہ جو کچھ وہ کہہ اور کر رہے ہیں وہ ہرگز قرآن و حدیث کے خلاف نہیں ہے۔

یہ بڑی ہی افسوسناک صورتِ حال ہے۔ ان میں اتنی صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے کہ وہ عربی ادب کی ایک خاص حد تک تحصیل و تکمیل کریں۔ قرآن و حدیث کے وسیع ذخیرہ پر خوب گہری نظر رکھیں۔ اس ذخیرہ میں جہاں جہاں معنوی تحریفیں اور تاویلیں کی گئی ہیں ان کی تہ تک پہنچیں [?]۔ اختلافات میں محاکمہ کر کے جانب راجح کو اختیار کریں۔ شرعی احکام کی مصلحتوں اور باریکیوں کو سمجھیں اور حدودِ شرعیہ کے نکتوں کو پائیں۔ پچھلوں اگلوں کی تاریخ پر بھی وسیع نظر ڈالیں اور ان کے تمام اقوال و افعال میں حق و ناحق اور مناسب و نامناسب

کو بھی ممیز کرتے چلے جائیں۔

یہ سب کچھ اہلِ علم کا کام ہے اور جب اُنھیں میں سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی نکلتی چلی جائے جو "با زمانہ بساز" کے نظریہ پر عامل ہوں اور دنیا پرستانہ اور مطلب جویانہ ذہنیت لے کر میدان میں اُتر آئیں تو عوام کو امن کہاں ملے گا۔ اُن کی گمراہیوں کا دائرہ پھیلے گا اور خوب پھیلے گا۔ اُسکے سکڑنے اور کم ہونے کی آخر صورت کیا ہے؟

ان مولویوں نے کتابوں اور رسالوں کا جو ڈھیر لگا دیا ہے اور اس میں کتاب وسنت کی کھُلی کھُلی معنوی تحریفات سے عوام کے مطلب کی جو جو باتیں چھانٹی ہیں وہ تو بے شمار ہیں۔ مگر ہم محض ناظرین کی سرسری واقفیت کے لئے اپنے موضوع کی حد تک چند باتوں کا ذکر کرتے ہیں تاکہ ایک ہی چاول سے اندازہ کیا جاسکے کہ پوری دیگ میں کیا ہے۔

موجودہ زمانے میں ایک صاحب نے قرآن کی تفسیر لکھی ہے۔ جب انھوں نے قرآن کھولا تو اس کی ابتدائی آیتوں ہی میں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن پر پہنچکر وہ رُک گئے۔ انھیں یہاں یہ مشکل پیش آئی کہ یہ لفظ تو اُن پورے معتقدات کی جڑ ہی پر ایک کاری ضرب لگا رہا ہے جو عامۃ الناس میں شائع وذائع ہیں اور جن کی بنیاد پر انھوں نے مشرکانہ اعمال ورسوم کی ایک نئی شریعت ایجاد کر رکھی ہے۔ چنانچہ مفسر صاحب نے اس کانٹے کو راہ سے نکالنے یا کم از کم اسے بے ضرر بنا دینے کے لئے قرآن میں غور وخوض کرنا شروع کیا اور چند عقلی وتجربی دلائل کی کمک بھی ساتھ ساتھ لے آئے۔ پھر اس سے بھی کام نہ چلا تو مغالطے دینے اور جذباتی انداز میں گفتگو کرکے لوگوں کو عقلی ونقلی دلائل سے بے پرواہ کرنے کی کوشش کی۔

إِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں حصر موجود ہے اور عربی کا ہر مبتدی اس کا ترجمہ اُردو زبان میں یہی کر سکتا ہے کہ "اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں"۔ اگرچہ "ہی" کے حصر کو اُڑا دینے کے بعد راستہ کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ مگر ترجمہ کی تحریف کے باوجود متن تو جُوں کا تُوں رہتا ہے اور اس میں تحریف ممکن نہیں۔ اس لئے مفسّر صاحب نے تفسیر کا ایک اور راستہ اختیار کیا اور وہ یہ ہے کہ اہل اللہ سے مدد مانگنا دراصل اللہ ہی سے مدد مانگنا ہے۔ اہل اللہ غیر اللہ نہیں ہوتے، فنا فی اللہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنی حاجات میں اُن سے مدد مانگنا ایاک نستعین کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور فرمایا کہ دیکھو! قرآن میں فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ۔ (یعنی قوت سے میری مدد کرو) آیا ہے۔ یہ ذوالقرنین کا قول ہے۔ جب اُس جیسے زبردست اور طاقتور بادشاہ کو بھی دوسروں کی مدد ضروری ہوئی تو ہم جیسے کمزوروں کو اللہ والوں کی مدد کیوں ضروری نہیں؟

اس کے بعد وہ "عقلی و تجربی دلائل" پر آئے اور کہا کہ کوئی شخص اگر جنگل میں بھٹک جائے تو کیا وہ لوگوں کو نہیں پکارے گا کہ بھائیو میری مدد کرو بس اسی طرح ہم بھی بھٹکے ہوئے ہیں اس لئے پکارتے ہیں کہ "یا غوث! یا خواجہ! ہماری مدد کیجئے!"۔ جب ان "قیمتی دلائل" پر بھی دل مطمئن نہ ہوا تو مغالطہ دہی کی سوجھی اور ارشاد فرمایا کہ تم جس طرح پانی لانے کے لئے ملازم کو پکارتے ہو اور ملازم کی یہ مدد جائز ہے تو اولیاء اللہ کو پکارنا اور ان سے مدد مانگنا کیوں ناجائز ہوا۔ یہ سب کچھ کہہ جانے کے باوجود مفسّر صاحب کی تسلّی نہیں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ عوام کو نقلی و عقلی باتوں سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف جذباتی باتوں سے متاثر ہوا کرتے ہیں اس لئے انھوں نے کہا کہ جو لوگ اولیاء اللہ

کو نہیں مانتے وہ ایسے اور ایسے ہیں۔ اولیاء اللہ کا درجہ اتنا اتنا بلند ہے اور خدا تک براہِ راست رسائی تم جیسے کمینوں کا کام نہیں ہے اس لئے ان کے واسطے سے پہنچو اور ان تک پہنچ جانا خدا ہی تک پہنچ جانا ہے وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ ان تمام باتوں میں ایک بات بھی صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک اسباب طبعی کا تعلق ہے اُن سے کام لینا اور اس کام کے دوران میں ایک دوسرے کی مدد کرنا صرف جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری ہے اور اسی پر سانس لینے اور زندہ رہنے کا دارومدار ہے۔ لیکن فوق الطبعی اسباب کو پیدا کرنا اور اس سے کام لینا بالکل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور اس کے لئے اسی سے مدد مانگنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص پیاس کی حالت میں اپنے خادم کو پانی لانے کے لئے پکارتا ہے تو وہ اسی لئے پکارتا ہے کہ خادم اُس کی آواز سُنتے اور پکارنے والے کو یقین ہے کہ اس کا خادم پانی لانے پر قادر ہے۔ لہٰذا اُس کا پکارنا اور یقین کرنا بالکل درست ہے کیونکہ یہ سب سلسلۂ اسباب کے تحت ہے جس پر سارا نظامِ عالم قائم ہے لیکن اگر پانی کے لئے کسی ولی کو پکارے جو اس سے سیکڑوں ہزاروں میل دُور کسی قبر میں دفن ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان ولی صاحب کو سمیع و علیم سمجھتا ہے اور اس کا اعتقاد یہ ہے کہ عالمِ اسباب پر اُن کی فرمانروائی قائم ہے جس کی وجہ سے وہ مافوق الطبعی طور پر سلسلۂ اسباب کو پیدا کرنے اور اُسے حرکت دینے پر قادر ہیں اور یہی شرک فی الصفات ہے جو کسی طرح جائز نہیں۔

اور ایک پانی ہی کیا، زمین و آسمان اور اُن کی درمیانی اشیاء میں سے کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس کے طبعی و مافوق الطبعی اسباب کا سرِرشتہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں نہ ہو۔ مگر طبعی اسباب سے کام لینے اور اُس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی اللہ تعالیٰ نے خود اجازت دی ہے اور اسی کا نام زندگی یا حیات ہے

اس لئے وہ تو بالکل جائز ہے۔ مگر اس سے ہٹ کر مافوق الطبعی طور پر اللہ تعالیٰ کے سوا یا اُس کے ساتھ کسی جاندار یا بے جان چیز کو متصرف فی الخلق سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا بالکل ناجائز ہے۔ ایاکَ نستعین میں حصر اسی دوسری چیز کے لئے ہے نہ کہ پہلی چیز کے لئے۔ یہی پہلی چیز ہے جس کو عمل میں لانے کا ہر انسان محتاج ہے۔ چاہے وہ اپنی ذات میں کتنا ہی طاقتور اور اپنی صفات میں کتنا ہی برگزیدہ ہو۔

یہی چیز تھی جس کے لئے ذوالقرنین نے فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ کہا تھا۔ اُس نے اپنے اردگرد کے زندہ لوگوں سے اپنے زیرِ تعمیر بند کے استحکام کے لئے جسمانی محنت و مشقت کی مدد مانگی تھی۔ اس نے یہ نہیں کیا تھا کہ بند کی ضرورت محسوس ہوئی تو گذرے ہوئے زمانہ کے لوگوں کو قبروں سے بلانا شروع کر دیا۔ یا اُن کو اس لئے پکارنے لگا کہ وہ مافوق الطبعی اسباب کو حرکت دے کر ایک کرشمہ یا کرامت کی ذریعہ اُس کے لئے ایک عظیم الشان بند بنا کر دے دیں۔

رہ گیا عبد و معبود کا تعلق تو عبد خواہ کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ جائے اور اس سے معبود کا اور معبود سے اُس کا تعلق کتنا ہی گہرا اور مضبوط ہو وہ عبد ہی رہتا ہے۔ اس کے اندر معبودیت یا اُلوہیت کا کوئی شائبہ تک نہیں آنے پاتا۔ اس عقیدہ پر خود وہ کلمۂ شہادت ہی دال ہے جسے ادا کر کے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ۔ اس میں اللہ کے سوا کسی کے الٰہ ہونے کی قطعی نفی کی گئی ہے۔ آپ لفظ الٰہ کے لغوی معانی کی تحقیق کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی اور نفع و نقصان پہنچانے کے تمام مافوق الطبعی تصورات موجود ہیں۔ پھر حضورؐ پر جس حیثیت سے ایمان لانا اور اس کی بار بار گواہی دیتے رہنا فرض ہے وہ یہی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسولؐ تو ہیں، لیکن آپؐ سب سے پہلے اللہ کے بندے ہیں اور اللہ

کے ساتھ انتہائی برگزیدگی کا تعلق رکھنے کے باوجود آپ میں اُلوہیت کی ایک صف بھی نہیں پائی جاتی۔

اب فرمائیے کہ کلمہ کی رُو سے ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہئے اس کے برخلاف عقائد رکھتے ہوئے کلمہ پڑھتے رہنا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ بھٹکے ہوئے ہیں تو خدا نے ہدایت کا راستہ روشن کرکے رکھدیا ہے۔ اُس پر چلئے۔ اسے چھوڑ کر اور ہدایت یافتہ اسلاف کو پکار کر تو آپ اور زیادہ بھٹکے جارہے ہیں۔

لطف یہ ہے کہ مفسر مذکور نے اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تفسیر میں محض استعانت بغیر اللہ ہی کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ لگے ہاتھوں فاتحہ وغیرہ قسم کی بہت سی چیزوں کا بھی اسی شان کے ساتھ ذکر فرمادیا۔ اب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جہاں قرآن کی بسم اللہ ہی ایسی ایسی "نکتہ آفرینیوں" سے کی گئی ہو' وہاں پورے قرآن کی تفسیر کا کیا رنگ ہوگا۔

ایک اور مثال لیجئے :۔

عامۃ الناس میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اولیاء اللہ مرنے کے بعد بڑی زبردست قوت کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ ساری دنیا کی باتوں کو جانتے' ساری آوازوں اور دعاؤں کو سُنتے' تمام حرکات وسکنات کو دیکھتے' اُن کے حضور پیش کی جانے والی تمام درخواستوں کو پڑھنے اور ہر کارروائی کا فیصلہ فرماتے ہیں۔ وہ نذر دینے والوں سے خوش اور منت پوری نہ کرنے والوں سے ناخوش ہوتے ہیں اور دفع مضرات دافع بلیات اور عطاء و بخشش کے بڑے وسیع اختیارات رکھتے ہیں۔ اس خیال کی تائید وتصویب کے لئے جب قرآن پر نظر ڈالی گئی تو وہ اس آیت پر جاکر ٹھیری:۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ [۱]

---

[۱] اس آیہ مقدسہ کی شرح وتفسیر کیلئے اسی شمارہ کا "نقش اول" ضرور ملاحظہ فرمالیا جائے۔ (ایڈیٹر)

بس کہدیا گیا کہ دیکھو یہ حیات بعد مُردن کا کتنا کھُلا اثبات ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے ان بزرگوں کو اَحْيَاءٌ (زندہ لوگ) فرمایا ہے۔ اور وہ بھی اتنی تاکید کے ساتھ کہ "اُنھیں مُردہ نہ کہو"۔ پس معلوم ہوا کہ زندہ نہ سمجھنا تو ایک طرف اُنھیں زبان سے مردہ تک کہنا جائز نہیں، جو شخص "مردہ" کا لفظ زبان سے نکالتا ہے وہ سخت گستاخ اور بے دین ہے۔ پھر یہ حیات، انتقالِ مکانی کے بعد کی ہے اس لئے وہ حیاتِ دُنیوی کے مقابلہ میں اتنی اعلیٰ و اشرف ہے کہ اِس دُنیا کا کوئی شخص اُس کا تصور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسی لئے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لَا تَشْعُرُوْنَ (تم سمجھ نہیں سکتے) رہ گئی یہ بات کہ اس آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو فی سبیل اللہ قتل کئے جائیں۔ تمام اولیاء و بزرگانِ دین کا عموم اس سے نہیں نکلتا تو اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا گیا کہ کافر کے ہاتھ سے قتل ہونے والا انسان جب یہ مرتبہ حاصل کرتا ہے تو بھلا عشقِ الٰہی کی تلوار سے قتل ہونے والا یہ مرتبہ کیوں نہیں حاصل کر سکتا۔ بلکہ غور کیجئے تو اس قسم کے لوگ ہی عام شہیدوں سے بہت بلند و بالا ہیں[1]۔

اگرچہ آیت کی یہ تفسیر ہی عامۃ الناس کے عقیدہ کو خوب مضبوط کرتی ہے مگر پھر بھی یہ کچھ ڈھیلی ڈھالی اور ناکافی سی ہے۔ کیونکہ بزرگانِ دین کی حیات برزخ سے جس جس طرح اُلوہیت کی صفات کو وابستہ کیا گیا ہے اُس کے لئے مزید تائید کی ضرورت ہے۔ اس لئے یہ کسر بھی پوری کر دی گئی۔ کہا [illegible] بزرگانِ دین طرح طرح کے سخت مجاہدوں سے اپنی روح کو دنیا میں اتنا طاقتور بنا لیتے ہیں کہ انتقالِ مکانی کے بعد اُن کی روح بلندی میں پرواز کرتے وقت [illegible] سب ہی

---

[1] غازی ز پئے شہادت اندر تگ و پوست — غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر ازوست
در روزِ قیامت ایں بآں کے ماند — ایں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

بن جاتی ہے۔ پھر وہ جو کچھ کرتی ہے۔ خدا کا فیصلہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے۔

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ۔

یعنی لوگ آپؐ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ روح تو امر رب ہے۔

نیز آدمؑ کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے چند مقام پر اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں :۔

وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ۔

اور میں اُس میں اپنی روح پھونک دوں۔

حالانکہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے اُس میں سب سے اوّلین قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بَلْ اَحْیَاءٌ کی تفسیر میں شہداء و اولیاء کی حیات سے متعلق جتنی باتیں چاہے کہہ لیجئے۔ لیکن اس کو اُلوہیت کی صفات سے متصف نہ کیجئے۔ یہی تو شرک ہے جس کی تردید سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ قرآن کی پوری دعوت ہی توحیدِ الٰہ کی بنیاد پر ہے۔ اس لئے اس کی کسی آیت کی ایسی تفسیر ہرگز جائز نہیں جو اس کی پوری تعلیم اور اس کے سارے اصول و کلیات کے خلاف ہو۔ بلکہ اس قسم کی تفسیری کوششیں در اصل معنوی تحریفیں ہیں۔ رہ گئیں آیات قل الروح اور وَ نَفَخْتُ۔ تو جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے اس میں لفظ "روح" ہی کے متعلق اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے کہ اس سے مراد جان ہے یا کچھ اور؟

ابنِ عباس، قتادہ، حسن بصری وغیرہم نے روح کے معنی وحی یا وحی لانے والا فرشتہ بیان کئے ہیں۔ تاہم اس سے مراد جان ہی ہو تب بھی اسکے لئے مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یعنی وہ میرے رب کے حکم سے ہے نہ کہ خود امرِ رب ہے۔ لفظ مِنْ کو نظر انداز کر دینے سے مفہوم کہیں کا

کہیں پہنچ جاتا ہے۔ یہی حال دوسری آیت کا ہے۔ اس میں اوّل تو یہ نہیں فرمایا کہ "میں اپنی روح پھونک دوں" بلکہ یہ فرمایا ہے کہ "اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں۔" دوسرے اس کا مفہوم محض یہ ہے کہ انسانی روح صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے اور اسی عکس یا پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائک سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔ اس سے یہ مطلب نکال بیٹھنا کہ صفاتِ الٰہی میں سے ایک حصہ پانا اُلوہیت کا کوئی جُزو پالینے کا ہم معنی ہے۔ اتنی بڑی غلط فہمی ہے کہ قرآن کی پوری تعلیم ہی پر خطِ تنسیخ پھیر دیتی ہے۔ قرآن نے اپنی تعلیم مبہم مُغلق بنا کر پیش نہیں کی ہے۔ اگر کہیں اختصار سے کام لیا ہے تو دوسری جگہ توضیح و تفصیل بھی کر دی ہے اور اس کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جو اس کے پیش کردہ تصورِ الٰہ پر غلط طریقے سے اثر انداز ہوتی ہو۔ یہ تو خود لوگوں کی اپنی ہی شرک پرستانہ ذہنیت اور اس ذہنیت کو تقویت دینے والی فتنہ جویانہ نیت ہے جس کے زیر اثر توحید کی تعلیم دینے والی کتاب میں شرک کے جراثیم کُلبلاتے نظر آتے ہیں۔

مزید ایک مثال سُنئے:-

عوام کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ دوسری تمام بخششوں کی طرح عطائے اولاد کے لئے بھی اولیاء اللہ نہ صرف خدا سے دُعا کرتے ہیں، بلکہ خود بھی اسے بخشنے پر قادر ہیں۔ چنانچہ اس کا اظہار اُن کی زبانوں ہی سے نہیں، بلکہ باقاعدہ اُن کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے جو وہ درخواستوں کی شکل میں مزاراتِ اولیاءً پر لٹکاتے ہیں۔ ان میں صاف صاف اہلِ قبور سے خطاب کیا جاتا ہے کہ۔ "ہمیں اولاد دیجئے۔" اب کیسے ممکن تھا کہ جن مولویوں کا سارا مفاد ہی عوام

کے عقائد و اعمال سے وابستہ ہے۔ وہ اسے بھی سندِ جواز نہ دیں چنانچہ اس غرض کے لئے انھوں نے قرآن میں ٹوہ لگائی اور تلاش و تفحص کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اگر وہ طلب ہدایت کے لئے قرآن پڑھتے تو کسی مقام کی دو چار آیتیں ہی اُن کی ہدایت کے لئے کافی تھیں۔ مگر وہاں سرے سے طلب ہدایت ہی مقصود نہ تھی۔ وہاں تو مقصود صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح کہیں سے کوئی اشارہ ہی ایسا نکل آئے جس سے اُن کے "پیارے عوام" کے عقائد کی صحت پر مُہرِ تصدیق ثبت ہو سکے۔ چنانچہ وہ بیسیوں ایسی آیات پر سے گذرے جن میں نہایت صاف و صریح الفاظ کے ساتھ اُن کے عقائد کا ابطال اور صحیح عقائد کا اثبات موجود ہے۔ اللہ نے پھیر پھیر کر حقائق واقعیہ کو بیان فرمایا ہے۔ مگر اُن کے پھرے ہوئے ذہن میں کوئی بات اُتر نہ سکی۔ جب قرآن کے مجموعی مضامین و مطالب میں اپنے مفید مطلب بات کے پانے سے وہ مایوس ہو گئے تو پھر لفظ لفظ اور حرف حرف کو دیکھنا شروع کیا۔ تاکہ اگر کوئی رائی بھی کہیں مل سکے تو وہ اپنے نحوی اور صرفی علم کی مدد سے اسے پہاڑ بنا دیں۔ بالآخر اُن کی نگاہ سورۂ مریم کے دوسرے رکوع میں آیت :- قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا پر جا کر ٹھیر گئی اور جب انھوں نے غور کیا تو لفظ لِأَهَبَ پر پہنچ کر وہ خوشی کے مارے اُچھل پڑے۔ انھوں نے کہا دیکھو یہ ہے دلیل اس بات کی کہ اولیاء اللہ کو عطاءِ اولاد پر پوری قدرت حاصل ہے۔ یہاں فرشتہ نے اولاد کی بخشش کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ لہٰذا مسجودِ ملائک انسان اور انسانوں میں بھی نہایت بزرگ و برتر ہستیوں کے لئے بھلا یہ کیسے ناممکن ہے کہ وہ اولاد جیسی چیز نہ دے سکیں۔

حالانکہ اس معاملہ کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ فرشتہ نے "بخشنے" کا فعل

محض مجازی طور پر استعمال کیا ہے وہ خود کہتا ہے کہ :-

"میں آپ کے رب کا بھیجا ہوا ہوں"

آیتِ مذکورہ کا سیاق و سباق دیکھئے! اللہ تعالیٰ خود اس فرشتہ کے متعلق فرماتا ہے :- فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا (مریمؑ کے پاس فرشتہ کو ہم نے بھیجا) مریم علیہا السلام بے شوہر بچہ پیدا ہونے پر تعجب کا اظہار کرتی ہیں تو فرشتہ کہتا ہے :-

قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (آپ کا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے) فرشتہ کا یہ قول اس کے زیر بحث قول کو قطعی طور پر مجاز کا رنگ دے رہا ہے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو کیا اللہ تعالیٰ نے کارِ تخلیق میں فرشتوں یا کسی اور مخلوق کو اپنا شریک بنا رکھا ہے؟

خدا کے ماننے والوں میں نہ کوئی انسان ایسا پایا گیا ہے اور نہ کبھی پایا جائیگا جو خدا کے خالقِ واحد ہونے اور کائنات کی ہر جاندار و بے جان چیز کے مخلوق ہونے کا انکار کرتا ہو۔ جب انسان اور فرشتے اس کی مخلوق ہیں تو مخلوق ہی کو کارِ تخلیق میں شریک کر دینے کا کیا مطلب ہے؟ پھر حق تعالیٰ جل شانہٗ خود فرماتے ہیں

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا	ہم یہ اس لئے کریں گے تاکہ اس لڑکے کو لوگوں کے لئے ایک نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنا دیں

یہی واقعہ سورہ آلِ عمران کے پانچویں رکوع میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ایک فرشتہ نہیں بلکہ فرشتوں کی ایک جماعت حضرت مریمؑ کے پاس آئی تھی اور اس لئے آئی تھی کہ مریمؑ کو لڑکے کی بشارت دے۔ سرگروہ کی حیثیت سے جب ایک فرشتہ حضرت مریمؑ سے مخاطب ہوا تو کہا کہ :-

كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ	ایسا ہی ہوگا۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے
اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ	وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس یہ کہدیتا

كُنْ فَيَكُوْنُ ٥ ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔

کیا یہ کُنْ فَیَکُوْنُ کی شان بھی اللہ کے سوا کسی اور کے لئے مختص ہے؟ کیا اس میں بھی اُس نے فرشتوں اور انسانوں کو شریک ٹھیرا لیا ہے؟ اگر بات یہ نہیں ہے تو ماننا چاہئے کہ فرشتہ لڑکا دینے کے لئے نہیں، بلکہ بشارت دینے کے لئے آیا تھا۔ مگر جب وہ انسانی شکل میں متمثل ہو کر حضرت مریمؑ کے سامنے آگیا تو اُس نے بشارت کی تقویت کے لئے لڑکا بخشنے کا فعل مجازی طور پر اپنی طرف منسوب کر لیا۔ پورا قرآن تو خیر خود اس لفظ لِاَھَبُ کا سیاق و سباق ہی اس ذرا سے مجاز کو حقیقت کی طرف لے جانے کے سارے راستے بند کر دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں سورۃ اعراف کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات کا مطالعہ نہایت بصیرت افروز ہوگا۔ فرمایا ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ٥ فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ٥	وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے پھر جب مرد اور عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لئے لئے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے مل کر اپنے رب اللہ سے دعا کی کہ اگر تو نے ہمکو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گذار ہونگے مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح و سالم بچہ دیدیا تو وہ اس کی اس بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھیرانے لگے۔ اللہ بہت بلند و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

+ + + +

+ + + +

ان آیات پر "تفہیم القرآن" میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہٗ نے جو حاشیہ لکھا ہے اُس کا حسب ذیل پیراگراف بار بار پڑھنے اور عبرت حاصل کرنے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی مذمت کی ہے وہ عرب کے مشرکین تھے اور اُن کا قصور یہ تھا کہ وہ صحیح و سالم اولاد پیدا ہونے کے لئے تو خدا ہی سے دُعا مانگتے تھے مگر جب بچہ پیدا ہو جاتا تھا تو اللہ کے اس عطیہ میں دوسروں کو شکریہ کا حصہ دار ٹھیرا لیتے تھے۔ بلاشبہ یہ حالت بھی نہایت بُری تھی۔ لیکن اب جو شرک ہم توحید کے مدعیوں میں پا رہے ہیں وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ یہ ظالم تو اولاد بھی غیروں ہی سے مانگتے ہیں۔ حمل کے زمانہ میں منتیں بھی غیروں کے نام ہی کی مانتے ہیں اور بچہ پیدا ہونے کے بعد نیاز بھی انہی کے آستانوں پر چڑھاتے ہیں۔ اس پر بھی زمانہ جاہلیت کے عرب مشرک تھے اور یہ موحد ہیں۔ اُن کیلئے جہنم واجب تھی اور اِن کے لئے نجات کی گارنٹی ہے۔ اُن کی گمراہیوں پر تنقید کی زبانیں تیز ہیں مگر ان کی گمراہیوں پر کوئی تنقید کر بیٹھے تو مذہبی درباروں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اسی حالت کا ماتم حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں کیا ہے:۔

کرے غیر گر بُت کی پوجا تو کافر — جو ٹھیرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر — کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جسکی چاہیں

نبیؐ کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں — اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ جاجا کے نذریں چڑھائیں — شہیدوں سے جاجاکے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے

نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے"

یہ نمونہ تو تھا قرآن کی "تفسیر" کا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے یہاں قبروں اور قبر والوں کے تعلق سے جو رسمیں رائج ہیں اُن کے کوئی اصطلاحی نام تو قرآن و حدیث میں نہیں ملتے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اُن کے ایسے نام تجویز کر دیئے جائیں جو فی نفسہٖ قابلِ اعتراض بھی نہ ہوں اور شرکِ جلی کی تعریف میں بھی نہ آسکیں چنانچہ مولویوں نے یہ فنی خدمت بھی خوب انجام دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں :۔

آپ اُن تمام کھانوں سے واقف ہی ہوں گے جو خاص خاص تاریخوں میں بڑے اہتمام و احترام کے ساتھ، مخصوص آداب و قواعد کے تحت مسلمانوں کے یہاں پکائے جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک باقاعدہ نظامِ فکر و عمل ہے اس کے الگ الگ اجزاء کو لیجئے تو خواہ مخواہ ان کے تعین و عدم تعین اور جواز و عدم جواز کی بحث پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس مجموعہ کا ایک مختصر اور مفید نام فاتحہ رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ کوئی بُرا اور بے معنی لفظ نہیں ہے ایک اچھا اور بامعنی لفظ ہے اور قرآن کی ایک سورۃ کا نام بھی ہے اور سورۃ بھی وہ جو جسے خود قرآن نے سبع المثانی کہا ہے۔ یعنی سات ایسی آیتیں جو بار بار دُہرائی جانے کے لائق ہیں۔ اس کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :۔

لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ

یعنی سورۃ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ بھلا اس پر اعتراض کی گنجائش ہی کیا ہے۔

لیکن آپ کو صاف محسوس ہو گا کہ لفظ "فاتحہ" کے معنی اور خود سورۂ فاتحہ سے عقیدہ و عمل کے اس پورے نظام کو کوئی دُور و قریب کا تعلق نہیں ہے، جو مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اب آپ اگر "فاتحہ" کے قائلیں سے یہ فرمائیں کہ تم جو نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہو یا غیر از نماز کہیں بیٹھے بیٹھے پڑھ لیتے ہو، اسی کو کافی سمجھو اور اس کے سوا "فاتحہ" کے نام سے کچھ نہ کرو تو ان میں سے کوئی شخص اس کے لئے آمادہ نہ ہو گا۔ مگر اس کے باوجود "فاتحہ" کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے۔ اس کو یہ ایک لفظ اعتراض کی زد سے نکال لیتا ہے۔

رہ گئی "فاتحہ" کی غرض تو اس کے لئے بھی کوئی ایسا ہی بامعنی۔ بلکہ شرعی تصوّرات سے قریب تر کوئی لفظ چاہیئے تاکہ مقصد کی پاکیزگی ثابت ہو جانے کے بعد عمل کی پاکیزگی خود بخود ثابت ہو جائے۔ چنانچہ فاتحہ کی غرض کو "ایصالِ ثواب" کا نام دیا گیا۔ جس کے معنی ہیں "ثواب پہنچانا"۔ جہانتک مُردوں کو ثواب پہنچانے کا تعلق ہے۔ اس کی تو بعض شکلیں خود حدیث نبویؐ میں موجود ہیں اور ائمہ فقہ بھی قائل ہیں کہ بدنی اور مالی عبادات کا ثواب پہنچ سکتا ہے۔ پس عقیدہ و عمل کی بہت سی خرابیاں اس لفظ کے پیچھے جا چھپیں اور کسی فقیہ کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ وہ "ایصالِ ثواب" کو ناجائز کہدے۔ مگر اس سلسلہ میں جو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اُن کو چھوڑ کر صرف دو باتیں قابلِ توجہ ہیں:-

(۱) ایک تو یہ کہ قرآن و حدیثِ نبویؐ میں ایصالِ ثواب کی بہترین صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ آدمی اپنے ساتھ اپنے اسلاف کو بھی دعواتِ خیر میں شریک رکھے۔ دعاءِ خیر سے زیادہ بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہے اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایصالِ ثواب کے لئے بدنی یا مالی عبادت کی اجازت دی بھی ہے تو

وہ بھی کبھی کبھار۔ یہ کہیں نہیں پایا جاتا کہ آدمی اسے معمول ہی بنا لے اور فرائض تک سے بے پرواہ ہو کر اس کام میں اپنی قوت اور دولت کا بڑا حصہ خرچ کر دے پھر یہ "ایصالِ ثواب" کے نام سے کئے جانے والے لمبے چوڑے کاموں کی اصل علت کیا ہے؟

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ ایصالِ ثواب کے اصل مستحق ہمارے وہ اعزا و اقربا یا دوست احباب ہیں جن کی وفات ہمارے سامنے ہوئی ہے اور جن کے حالات سے ہم واقف رہے ہیں۔ یا پھر وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کم از کم ہمارا گمان یہ ہو کہ وہ ثواب کے محتاج یا مستحق ہیں۔ مگر جن بزرگوں نے خود اپنی نیکی اور پرہیزگاری سے اپنے لئے ثواب کا بہت کچھ سرمایہ اکٹھا کر لیا ہو، بلکہ اُن کی بزرگی یہاں تک تسلیم کر لی گئی ہو کہ وہ "ایصالِ ثواب" کرنے والوں کے نزدیک اُلوہیت تک میں شریک ہو گئے ہوں، جس کی بناء پر وہ اُنھیں پکارتے اور اپنی حاجات میں مدد مانگتے ہیں تو اُنھیں "ثواب" پہنچانے کا کیا مطلب ہے۔ آخر کوئی یہ بھی تو سوچے کہ ثواب کس قسم کے لوگوں کی طرف سے کس قسم کے لوگوں کو پہنچایا جا رہا ہے؟ کیا آپ کے خزانے میں ثواب اتنی بڑی مقدار میں جمع ہے کہ آپ کو اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے اور آپ مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنا زائد از ضرورت ثواب دوسروں کو پہنچا دیا جائے؟ اور پہنچے بھی وہ آپ کی طرف سے حضرت پیرانِ پیر اور خواجہ اجمیری وغیرہ جیسے بزرگوں کو؟

یہی حال قبر پرستی اور اس کے سارے لوازم و مقتضیات کا بھی ہے "قبر پرستی" کو "زیارتِ قبر" کا شرعی نام دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ "زیارتِ قبر" نہیں "عبادتِ قبر" ہے۔ قبروں پر حاضری دینے کی اصل غرض کو توسّل اور

اکتسابِ فیض وغیرہ جیسے الفاظ کے خوشنما پردوں میں چھپایا گیا ہے۔ حالانکہ کسی ولی کی قبر پر حاضری دے کر یہ سمجھنا کہ چھوٹے صاحب تک رسائی ہو چکی ہے، اب وہ ہمیں بڑے صاحب کے یہاں پہنچانے اُن کے ہاں ہماری سفارش کرنے اور ہمیں اُن کا مقرب بنانے کا اختیار رکھتے ہیں یا اُس قبر کو فیض کا ایک بحرِ ذخّار سمجھ بیٹھنا، جہاں سے ہر حاجت مند کو اپنی ہر چھوٹی بڑی مادّی و روحانی ضرورتیں پوری کرنے کا سامان مل جایا کرتا ہے، بے ریب و شک ایک مشرکانہ عقیدہ ہے۔ نام کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی اور نہ حقیقت کی تبدیلی کو نام کی تبدیلی کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ توسّل کی حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے ذواتِ صالحہ کو وسیلہ بناتے ہوئے دُعا کی جائے[۵۱]۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی دعا میں کہا تھا کہ اِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِعَمِّ نَبِیِّنَا (اے اللہ! ہم اپنے نبیؐ کے چچا کے ذریعے تیرے دربار میں توسّل[۵۲] کرتے ہیں یا ہم اپنے نبیؐ کے چچا کو تیرے پاس وسیلہ بناتے ہیں)

---

[۵۱] واضح رہے کہ اس مسئلہ میں جواز، عدم جواز اور سکوت کے لحاظ سے علماء محققین کے تین مسلک ہیں اور تینوں کے دلائل میں حسب مراتب کچھ نہ کچھ وزن پایا جاتا ہے جو لوگ اس مسئلہ کے تمام اطراف سے پوری آگاہی حاصل کرنا چاہیں اُنھیں خود مطالعہ و تحقیق سے کام لینا چاہئے۔ ہم نے محض ذکر یہاں جواز کے پہلو کو پیشِ نظر رکھا ہے ۱۲ [۵۲] قرآن پاک میں جتنی دعائیں ملتی ہیں اُنہیں توسل کہیں نہیں آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ماثورہ دعائیں اُمت تک پہنچی ہیں اُن میں بھی براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی سے دُعا اور التجا کی گئی ہے کسی کا توسّل اس میں نہیں ہے اور صحابہ کرامؓ بھی اپنی دعاؤں میں "توسل" کا التزام نہیں کرتے تھے۔ ان درجنوں قرآنی دعاؤں اور مسنون احادیث و آثار سے ثابت شدہ دعاؤں کے مقابلہ میں ایک دو "حدیث و آثار" میں توسل بھی اگر ملتا ہے تو ایک محتاط مسلمان کا رجحان "شذوذ" کے مقابلہ میں "کثرت" کی طرف ہی ہونا چاہئے۔ "الوسیلہ" کے موضوع پر محترمہ عطیہ خلیل عرب کا مقالہ اسی "توحید نمبر" میں ضرور پڑھ لینا چاہئے۔ (ایڈیٹر)

مگر اس کا التزام کر لینا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو خدا وسیلے کے بغیر کسی دعا کو قبول ہی نہیں کرتا۔ یا اس پر مخلوق کا کوئی حق ہے کہ جس کا واسطہ بار بار دلایا جا رہا ہے اور یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

رہا اکتسابِ فیض کا معاملہ تو اس کی حقیقت اُن تصوّرات سے خود بخود نکھر کر سامنے آجاتی ہے جو شریعت نے اپنے پیروؤں کو دیئے ہیں۔ ہر مسلمان کو سلفِ صالحین کے حالات وخیالات اور اُن کی باقیات سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس کے مطابق خود اتباعِ شریعت اور ارتقاءِ رُوحانیت میں سرگرم رہنا چاہئے۔ اس حال میں اگر وہ کسی مردِ صالح کی قبر پر جائے تو اسے یقیناً روحانی بالیدگی اور قلبی نورانیت حاصل ہوگی اور یہی آخری حد ہے جہاں تک ایک مسلمان حدودِ شریعت میں رہ کر جا سکتا ہے۔ (قلبی نورانیت اور روحانی بالیدگی کا سبب یہ ہوگا کہ زائر اس قبر پر موت اور آخرت کو یاد کرے گا۔ اس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہوگی اور یہ سبب ہوگا دل کی نورانیت اور روح کی بالیدگی کا۔ ایڈیٹر)

اگر یہی چیز "اکتسابِ فیض" ہے تو اس کے جائز ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر جانور، غلے اور دوسری اشیاء کے ساتھ جن منّتوں، مُرادوں اور قربانیوں وغیرہ کا ہنگامہ قبروں پر جاری ہے، اُس پر تو "اکتسابِ فیض" کا اطلاق نہ لفظی حیثیت سے ہو سکتا ہے نہ معنوی اعتبار سے۔ تاہم اس خاص فعل کے لئے بھی مولویوں نے چند اصطلاحات عوام کو دے رکھی ہیں "بھینٹ" کا لفظ چونکہ ایک ہندی لفظ ہے اور مندروں اور استھانوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے آپ کسی مسلمان کی زبان سے یہ لفظ نہ سُن سکیں گے۔ البتہ اسی چیز کے لئے جو الفاظ انھیں علماء کے دربار سے مل گئے ہیں وہ ہیں نذر، نیاز وغیرہ۔

دیکھئے! کس قدر بے ضرر اور معصوم الفاظ ہیں۔ اگرچہ لغوی ومعنوی اعتبار سے

اُن کا استعمال غیر اللہ کے لئے بہت کچھ محلِ نظر ہے مگر نذر تو نذرانہ اور تحفہ کے
معنی میں مستعمل ہی ہے اور نیاز کے لفظ کو بھی لوگ ایک دوسرے کے لئے بے تکلفانہ
استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے اس میں کراہت، نفرت اور حرمت کی وہ شدت نہیں
ہے جو بھینٹ، چڑھاوا اور نذر لغیر اللہ وغیرہ الفاظ میں پائی جاتی ہے۔

مگر یہ تو محض ایک فعل ہے، ایسے کتنے ہی مختلف افعال کا ارتکاب سال
بہ سال قبروں پر ہوتا رہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس پورے بکھیڑے میں دولت
قوت اور محنت کا صَرف کہاں تک جا پہنچتا ہے اور گانے بجانے اور ناچ رنگ
تک کی رنگینیاں اس میں کس طرح جلوہ دکھاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے ہنگامے
کا جو کہیں کہیں اور کبھی کبھی نہیں ہوتا، بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت اس کی بہار دیکھی جاسکتی
ہے کوئی ایک مختصر اور جامع نام ہونا چاہئے جس کے پس پردہ احکامِ شریعت کی
دل کھول کر توہین و تذلیل کی جاسکے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ نام کیا ہے؟ جاترا
نہیں بلکہ "عرس" کیونکہ "جاترا" اس وقت تک کہتے تھے جب تک مسلمان نہ
ہوتے تھے۔ اب اس کی جگہ "عرس" کہتے ہیں۔ یہ لفظ اپنی معنویت کے اعتبار
سے فی الواقع لائقِ داد ہے۔ "عرس" عربی میں شادی بیاہ کو کہتے ہیں اور شادی
بیاہ لازماً ایک خوشی کا کام ہے۔ لہٰذا خوشی اور جشن کے موقع پر جو کچھ انسان
کرسکتا ہے اور کرتا رہا ہے وہ سب قبروں کے عرس میں از خود حلال ہوگیا، رہا
یہ شبہ کہ بزرگوں کے یوم وفات کو شادی کا دن کس معنی میں قرار دیا گیا ہے تو
ہمارے علمائے کرام کی باریک بین اور نکتہ چیں نگاہوں نے اسے بھی دور کردیا۔
جب اِن کے سامنے وہ حدیث آئی جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر میت صالح ہوتی
ہے تو فرشتے سوال و جواب کے بعد اس سے کہتے ہیں نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ (
سو جاؤ جس طرح دُلہن سوتی ہے) بس انھوں نے فرمایا کہ لو دیکھو یہی ہے عرس۔

چونکہ اولیاء اللہ اُس دن عروس کی طرح سو جاتے ہیں اس لئے اُس دن یا اُس سے آگے پیچھے جو کچھ اُن کی قبروں پر ہوتا ہے وہ عرس ہے۔

اس تحقیق انیق پر بہت سی باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے مگر اس سے کلام بہت طویل ہو جائے گا۔ اس لئے ہم اشارۃً دو ہی باتیں عرض کئے دیتے ہیں۔

ایک یہ کہ صالحین کو دُلہن کی سی میٹھی، پیاری اور گہری نیند محض اس لئے نصیب ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کو عمل صالح سے دُلہن کی طرح آراستہ کیا تھا۔ آخر اُن کی خوشی میں آپ کے شریک ہونے کا کیا موقع ہے؟ آپ بھی جاگیے اور ویسی ہی زندگی اختیار کرنے کی کوشش کیجئے۔ قبروں پر ہنگامے بپا کرنے اور میلے لگانے سے تو صالحیت نہیں پیدا ہو سکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر صالحین اپنے یوم وفات ہی میں گہری نیند سو گئے ہیں تو ان سے اپنی حاجات طلب کرنے اور انھیں اپنا معبود بنانے کا کیا موقع باقی رہا۔ کیا معبود بھی سو جایا کرتے ہیں؟ اگر معبود بھی سو جائیں اور دلہن کی سی نیند سو جائیں تو وہ اپنے عابدوں اور نیاز مندوں کا کیا بنا سکیں گے؟ اور اگر ان کی نیند بیداری ہی کی مترادف ہے تو پھر سونے کا کیا مطلب ہے؟

مگر کسی مسلمان کی زبان پر اللہ کے سوا کسی ہستی کے لئے معبود، خدا اور الٰہ وغیرہ کے الفاظ نہیں آسکتے۔ اس لئے ان صالحین امت کے ساتھ وہ سب کچھ معاملات رکھنے کے باوجود جو صرف اللہ ہی کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں، انھیں معبود، خدا اور الٰہ نہیں کہا جاتا۔ معبود بھی ہو اور معبود نہ کہلائے، الٰہ بھی ہو اور الٰہ نہ ٹھیرے یہ ایسا مشکل مسئلہ ہے جسے کوئی بے علم اور نادان شخص حل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آپ خود اس کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ آپ کسی شخص سے یہ کہہ دیجئے کہ تو اولیاء اللہ کو اپنا معبود سمجھتا ہے یا اُنھیں اپنا خدا بنا رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ،

ایک جاہل کندۂ ناتراش، دیہاتی اَن پڑھ آدمی بھی اس کا انکار کردے گا۔ اور آپ کا منہ نوچنے اور آپ کو پتھر مارنے کے لئے دوڑے گا۔ اس لئے حسب دستور مولویوں ہی نے اس مشکل کو حل کر دیا اور وہ یہ ہے کہ اولیاء و صالحین کو خدا اور معبود بنانا کیا ضرور، ان کے ساتھ معاملہ تو وہی رکھو جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ مگر انھیں غوث، قطب، دستگیر، گنج بخش، بندہ نواز، مشکل آسان، اولیاء اللہ، اہل اللہ وغیرہ سے اُوپر نہ لے جاؤ۔ ان الفاظ کی تاویل آسان بھی ہے اور اس سے تمہاری مسلمانی پر حرف بھی نہیں آتا، ورنہ ذرا تجاوز کر جاؤ تو ہر فقیہ تمہیں مشرک ٹھیرائیگا اور خواہ مخواہ کی پریشانی مول لینی پڑے گی۔

ناظرین اندازہ فرمائیں کہ عقائدِ باطلہ و فاسدہ کی تائید و حمایت کے لئے اگر علماءِ سوء اس طرح کمربستہ نہ رہتے تو بھلا اسلام میں شرک بیچارہ کہاں بار پا سکتا اور مسلمانوں میں اس کے اثرات اتنی کثرت و وسعت کے ساتھ کیوں رونما ہوتے۔

یہ تو نمونہ ہے اُن علماء کی کاوشوں کا جو کسی نہ کسی طرح شریعت کے دائرہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ مگر اُن سے کہیں زیادہ نقصان جس طبقہ نے پہنچایا ہے وہ ایسے جاہل اور خیرہ سر صوفیوں کا طبقہ ہے جنھوں نے شریعت اور طریقت کو ایک دوسرے سے بالکل متضاد قرار دے لیا ہے۔ ان کے نزدیک ظاہر و باطن کے کوچے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں اور دونوں کوچوں کے قانون بھی جُدا جُدا ہیں۔ حتیٰ کہ ایک قانون میں جو چیز حلال ہے وہ دوسرے میں بالکل حرام اور ایک میں جو چیز قطعی حرام ہے وہ دوسرے میں بالکل حلال بلکہ فرض اور کارِ ثواب۔ چونکہ یہ طبقہ مسلمانوں ہی میں شامل رہنا چاہتا ہے۔

اس لئے وہ شریعت کا نام لینے اور قرآن وحدیث کی باتیں کرنے پر بھی مجبور ہے۔ مگر راہِ فرار اتنی کشادہ ہے کہ جب اور جس طرف سے چاہے نکل بھاگے۔ شریعت کی پابندیوں کا ذکر کیجئے تو وہ طریقت میں جا پناہ لے گا۔ مگر طریقت بھی بہر حال ایک قانون ہے اور قانون کی بندش بہر حال اُس کے ہوائے نفس پر سخت گراں ہے۔ اس لئے وہ وہاں سے بھی نکل بھاگے گا اور حقیقت تک جا پہنچے گا۔ پھر چونکہ مسلمانوں کا دینی کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے اور اس کلمہ سے فرار اسلام ہی سے فرار ہے۔ اسلئے وہ مقامِ حقیقت پر کھڑا ہو کر پکارے گا کہ لا الٰہ الا اللّٰہ کے معنی ہیں "کچھ نہیں سوائے اللہ کے" جب اس کے سامنے قرآن کھول کر آئیے اور اسکے مزعومہ معنی کی تردید کرنے بیٹھئے تو وہ سینہ اور سفینہ کی بحث چھیڑ دیگا۔ کہے گا کہ یہ اوراق کیا لئے بیٹھے ہو، جو کچھ ہمارے لوحِ دل پر نقش ہے اور جو ہم تک سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر پہنچا ہے وہ تو کچھ اور ہی ہے۔

اس گروہ کی تحریریں اور تقریریں دراصل ہفوات وہزلیات کی ایک پوٹ بلکہ ایک بحران زدہ بیمار کے ہذیانات ہیں۔ قبر پرستی اور اولیاء پرستی کے لئے ان لوگوں نے وہ وہ طوفان اُٹھائے ہیں کہ زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین بنا ڈالا۔ وہ قبر پر پیشانی رکھ دیں گے، مگر کہیں گے کہ تم اندھے ہو۔ تم کیا جانو کہ ہم کس کو سجدہ کرتے ہیں۔ دراصل کعبہ سامنے آگیا تھا، اس لئے ہم نے فوراً خدا کے آگے اپنی جبیں رکھ دی۔ وہ عرسوں میں عورتوں کا ناچ دیکھیں گے اور نظارہ بازی سے لطف اندوز ہوں گے۔ مگر کہیں گے کہ اَلْمَجَازُ قَنْطَرَۃُ الْحَقِیْقَۃِ (مجاز حقیقت کا پُل ہے) تم کو کیا خبر کہ ہم اس حُسن میں کونسے حُسن کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ وہ رات دن سازوں کے مشغلہ

میں مگن ہوں گے۔ مگر کہیں گے کہ ان سازوں میں ہم خدا کی آواز سُن رہے ہیں۔ وہ شراب تک پی جائیں گے مگر کہیں گے کہ یہ دراصل شرابِ طہور کی یاد ہے، بلکہ خود شراب طہور ہے (جی، کیوں نہیں؟ دوسروں کو تو شراب طہور آخرت میں ملے گی مگر ان "خدا رسیدہ بزرگوں" کو دنیا ہی میں دی جا چکی ہے) وہ بدکاری تک کر گذریں گے مگر کہیں گے کہ خدا کی مشیت کے بغیر دنیا میں پتہ تک حرکت نہیں کر سکتا۔

ظاہر ہے کہ اس طرز کے لوگوں کی بکواس کا جواب کسی ہوشمند انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لئے ہم اسے یہیں ختم کئے دیتے ہیں مگر ناظرین سے ضرور عرض کریں گے کہ جب گمراہی کے آنے اور پھیلنے کے اتنے بے شمار راستے ہیں تو آپ کو تعجب نہ ہونا چاہئے۔ اگر آپ دیکھیں کہ مسلمانوں میں مشرکانہ اعمال و رسوم کا خوب چرچا ہے اور یہ کہاں سے ہوتا آیا ہے۔

﴿۳﴾

ہماری اُوپر کی ساری بحث صرف "قبر پرستی" کے رد میں ہے۔ اسی لئے ہم نے اپنے مضمون کا سرِ عنوان "قبر پرستی" قرار دیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم قبور اور اہلِ قبور کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کرنے ہی کو ناجائز ٹھیرا رہے ہیں۔ دوسرے تمام مسئلوں کی طرح شارع نے اس مسئلہ میں بھی واضح حدود مقرر فرمائے ہیں اور خود بھی اس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈال دیں۔ اچھا۔ اب آئیے دربارِ رسالت ؐ میں چلیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ایک مسلمان کو قبروں اور قبر والوں سے کس قسم کا اور کتنا تعلق رکھنا چاہئے:۔

فرمایا ہے:۔

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّمَا تُزْهِدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْاٰخِرَةَ۔	میں نے تم کو زیارتِ قبور سے منع کیا تھا سو اب قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ چیز دنیا سے بے رغبت کرتی اور آخرت کی یاد دلاتی ہے (مشکوٰۃ باب زیارۃ القبور بحوالہ ابنِ ماجہ بروایت ابنِ مسعودؓ)۔

اس حدیث سے تین باتیں معلوم ہوئیں:۔

(۱) حضورؐ نے ابتداء میں زیارتِ قبور سے منع فرمایا تھا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حکمتِ تشریع اسی کی مقتضی تھی، ایک کام خواہ وہ بجائے خود صحیح اور مفید ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس کے ساتھ غلط اعتقادات اور غلط رسوم ورواجات کا جوڑ لگ گیا ہے تو جب تک اعتقادات کی بخوبی اصلاح نہ ہو جائے اس سے منع کرنا چاہئے۔ یہ ممنوعیت عارضی ہوتی ہے۔ مگر ضروری بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس روک کے بغیر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ آدمی کہیں مزید مفسدوں کا شکار نہ ہو جائے اور اگر یہ بات نہ بھی ہو تب بھی فسادِ عقیدہ کے باعث دوسرے طریقوں سے اُس کی اصلاح دیر طلب ہو جایا کرتی ہے۔ چونکہ عہدِ جاہلیت کے عرب قبر پرستی میں مبتلا تھے اس لئے اُن کے عقائد کی مکمل اصلاح تک حضورؐ نے قبروں کے پاس جانے سے اُنھیں روک دیا۔

(۲) جب حضورؐ نے یہ محسوس فرمایا کہ لوگوں کے ذہن وفکر کی اُس حد تک اصلاح ہو چکی ہے جہاں تک اُنھیں اسلام پہنچانا چاہتا ہے تو پھر آپؐ نے یہ عارضی روک ہٹالی اور فرمایا کہ زیارتِ قبور کیا کرو۔ یہ اجازت بھی ہے اور حکم بھی۔ کیونکہ اس سے دینی فکر کو قوت اور دینی جذبات کو حرکت ملتی ہے لہٰذا جو چیزیں دینی مقصد ومفید مقصد ہیں مسلمانوں کو اُن سے باز نہ رہنا چاہئے۔

(۳) دُنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد مسلمان کی اعلیٰ صفات ہیں اور چونکہ زیارتِ قبور ان میں اُس کی مددگار ہے اس لئے مسلمان کو اسے اختیار کرنا چاہیئے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زیارتِ قبور میں لازماً یہی مقصد پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ جن زیارتوں میں یہ مقصد سرے سے پیشِ نظر ہی نہیں ہوتا وہ حدودِ شرع سے صریحاً متجاوز ہیں اور حسبِ مراتب شرک، قریب بہ شرک یا بدعت وغیرہ کی موجب ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریمؐ اپنی والدہ صاحبہ کی قبر کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تو آپؐ پر گریہ طاری ہو گیا۔ حضورؐ کی حالت دیکھ کر صحابہؓ بھی رونے لگے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کی مغفرت کے لئے دعا کرنے کی اجازت چاہی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے منع فرمایا۔ پھر میں نے زیارتِ قبر کی اجازت چاہی تو مجھے اجازت دے دی گئی۔ لہذا تم لوگ قبروں پر جایا کرو کیونکہ اس سے موت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:۔

(۱) یہ کہ بفحوائے آیتِ کریمہ:۔

مَاكَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ	نبی کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں روا نہیں کہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں چاہے وہ اُن کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں جبکہ اُن پر یہ بات کھل چکی ہو کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ (سورۃ توبہ رکوع ۱۴)

کسی مشرک کے لئے دعائے مغفرت جائز نہیں۔ اگرچہ اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ بی بی آمنہ کے لئے شرک کے سوا کسی اور سبب سے دعائے مغفرت کی اجازت نہ دی گئی ہو۔ مثلاً یہ کہ اُن کا انتقال حضورؐ کی بعثت سے پہلے ہو چکا تھا۔

اُن کے لئے دعائے مغفرت کی اجازت دی جاتی تو عہدِ جاہلیت میں مرنیوالے تمام لوگوں کے لئے اس کی اجازت کا دروازہ کھل جاتا۔ درآنحالیکہ ان تمام لوگوں کے کفر و ایمان کا صحیح فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ تاہم اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مشرکوں اور مجہول الحال لوگوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ نام لے کر دعائے مغفرت کرنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

(۲) یہ کہ مسلمان غیر مسلموں کی قبروں کو دیکھ کر بھی موت کو یاد کر سکتا ہے۔ اور اُس سے عبرت حاصل ہو سکتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ ایک مرتبہ مدینہ کے قبرستان سے گذرے تو فرمایا کہ السلام علیکم یا اھل القبور یغفر اللہ لنا ولکم انتم سلفنا ونحن بالاثر۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہؐ! زیارتِ قبر کے وقت میں کیا پڑھا کروں؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ پڑھا کرو۔ السلام علیٰ اھل الدیار من المؤمنین والمسلمین ویرحم اللہ المستقدمین منا والمستاخرین وانا انشاء اللہ بکم لاحقون ط

حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ اقدس لوگوں کو قبرستان میں جا کر پڑھنے کے لئے یہ دعا تعلیم فرمایا کرتے تھے:۔

السلام علیکم اھل الدیار من المؤمنین والمسلمین وانا انشاء اللہ بکم لاحقون نسئل اللہ لنا ولکم العافیۃ ط

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ زیارتِ قبر کے موقع پر پڑھنے کے لئے ایک خاص دعا خاص الفاظ کے ساتھ خود حضورؐ نے سکھائی ہے اس لئے یہ مسنون ہے اور ہر زائر کو پڑھنی چاہئے۔ اگرچہ دعا کے الفاظ میں تھوڑی سی

ردّ و بدل موجود ہے۔ لیکن سب میں زیارتِ قبر کے مقصد کی اصل روح جاری و ساری ہے اور اس کے پڑھنے سے زیارت کا اصل مقصد بدرجۂ کمال حاصل ہو جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ والا جس رات میرے یہاں رہتے، آدھی رات کے وقت جنت البقیع تشریف لے جاتے اور یہ دعا فرمایا کرتے:۔ السلام علیکم دار قوم مومنین واتاکم ما توعدون غدا مؤجلون وانا انشاء اللہ بکم لاحقون اللّٰھُمَّ اغفر لاھل البقیع لہ اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) یہ کہ حضورؐ زیارتِ قبور کی کثرت فرماتے اور کم و بیش ہر ہفتہ قصداً زیارت کے لئے جاتے۔

(۲) یہ کہ زیارتِ قبور کے لئے رات کا وقت اور خصوصاً وہ وقت جبکہ تمام لوگ سو چکے ہوں اور بستیوں پر سناٹا چھاگیا ہو ایک موزوں ترین وقت ہے۔ کیونکہ اس وقت زیارت کا مقصد بدرجۂ اتم پورا ہوتا ہے۔ اور قلب بہت زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔

حضرت محمد ابن نعمانؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس شخص نے ہر جمعہ کو والدین کی زیارت کی اس کو بخش دیا جائے گا اور اس کو نیکوں سے

لہ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ حضور کا زیارتِ قبور کے لئے تشریف لے جانا استمداد اور طلب برکت کے لئے ہرگز نہ تھا اور نہ حضورؐ نے یہ فرمایا ہے کہ قبروں پر طلب برکات، اکتساب فیض اور استمداد کیلئے جایا کرو۔ حضورؐ کا قبروں پہ جانا اہلِ قبور کے لئے دعائے مغفرت کیلئے تھا اور اس لئے بھی کہ "موت" یاد آئے اور اپنے فانی و ہالک اور اللہ تعالیٰ کے حی و قیوم ہونے کا یقین پختہ تر ہو بلکہ تازہ ہوتا رہے۔ (ایڈیٹر)

زمرہ میں لکھا جائے گا۔

اس حدیث سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔

(۱) آدمی پر اس کے متوفی عزیزوں اور دوستوں کا زیادہ حق ہے کہ وہ ان کی زیارت کیا کرے۔ خصوصاً وہ لوگ جو تعلقات میں قریب تر رہے ہوں۔

(۲) زیارت کے لئے کسی دن کو مخصوص کر لینا بُرا نہیں ہے۔ اس کے لئے جمعہ کا دن اپنی افضلیت کی وجہ سے بہت موزوں ہے۔

(۳) زیارتِ قبر ایک ایسی نیکی ہے جس سے خود زائر کی مغفرت متوقع ہے۔ کیونکہ بار بار موت کو یاد کرنے سے اس کے اندر دُنیا سے بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صفت اُسے بدراہ اور بے عمل نہیں بننے دیتی۔

اب ہم زیارت کے لئے چار قسم کے لوگوں کی قبروں کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں:۔

(۱) عوام کی قبریں

اگرچہ زیارتِ قبور کی جو غرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے اس کی رُو سے عوام و خواص اور مسلم و غیر مسلم سبھی کی قبریں یکساں ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ غریبوں اور عام لوگوں کی قبروں کی زیارت کر کے جو فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے وہ دُوسروں کی قبروں سے کم ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہاں بے کسی و بے بسی، خستہ حالی و پریشاں حالی اور فنائیت کی ایک مکمل تصویر بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور آس پاس کوئی ایسی چیز بھی موجود نہیں ہوتی جو خیالات کو مرکوز کرنے اور توجہات کو قائم کرنے میں مانع ہوتی ہو اور اگر یہ زیارت حضورؐ انور کے اپنے عمل کے مطابق رات کے سناٹے میں کی جاتی رہے تو آخرت کی فکر کرنے اور حالات بعد الموت پر توجہ دینے کی اچھی خاصی تربیت بھی ہوتی چلی جاتی ہے۔

اگر آپ کو ابھی تک اس کا تجربہ نہیں ہوا ہے تو ایک مرتبہ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ رات کو سوتے سے اُٹھئے اور چپکے سے قریب کے کسی قبرستان میں چلے جائیے۔ آپ کو پہلا خیال یہی آئے گا کہ یہ تو شہرِ خموشاں ہے ہی۔ لیکن زندہ انسانوں کی بستی بھی تھوڑی دیر کے لئے قبرستان ہی بنی ہوئی ہے اور اسی لئے نیند کو موت کی بہن کہا بھی جاتا ہے۔ مگر یہ گھروں میں سونے والے صبح جاگینگے اور پھر وہی زندگی کا ہنگامہ جاری ہو جائے گا جو روزانہ دن میں جاری رہتا ہے۔ لیکن قبروں کے سونے والے اس لیل و نہار کے ہنگامہ سے گذر چکے ہیں اور اپنی مدتِ حیات ختم کر کے اس طرح ہمیشہ کے لئے سو گئے ہیں کہ بس اُنھیں اسرافیل کا صور ہی جگائے گا۔

اُس وقت آپ کے ذہن پر موت کی یاد اور آخرت کی فکر کے سوا کوئی اور چیز غالب نہ آسکے گی۔ آپ مختلف قبروں کو دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ کچھ تو پختہ ہیں اور کچھ بوسیدہ۔ بہت سی قبروں کا تو نام و نشان بھی باقی نہیں رہا ہے[۵۱]۔ اور کتنی قبریں ہیں جو دُوسری قبروں پر بنتی چلی گئی ہیں۔ کچھ قبریں پختہ بھی ہیں تو اُن میں تزک و احتشام اور شان و اہتمام موجود نہیں ہے۔ یہ مشاہدہ آپ کے قلب میں بڑی رقّت پیدا کرے گا اور اگر وہاں آپ کے دوست احباب اور اعزّا و اقربا بھی دفن ہیں تو اُن میں سے ایک ایک کی یاد آپ کو تڑپائے گی اور دنیا سے بیزاری پیدا کرے گی۔

پھر آپ حضورؐ کی سکھائی ہوئی دعا پڑھیں گے تو یہ محسوس ہو گا کہ گویا آپ دنیا سے چلنے کے لئے بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ اگر اسی طرح زیارت کی کثرت ہو تو یہ قلبی

---

[۵۱] امیر مینائی مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں — پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

کیفیات زیادہ سے زیادہ بڑھتی چلی جائیں گی۔ آپ قبروں کے پاس حضورؐ کی بتائی ہوئی دعا کے ساتھ دوسری دعائیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ مگر ان میں وہ روح زیادہ سے زیادہ ہونی چاہئے جو حضورؐ کے بتائے ہوئے الفاظ میں موجود ہے۔

۲۔ سلاطین و اُمراء کی قبریں

سلاطین و امراء کی قبروں کی زیارت بھی کچھ کم مفید نہیں ہے[1]۔ اگرچہ ان لوگوں کی قبریں بہت ہی کم کہیں کچی اور سادہ حالت میں ملتی ہیں۔ ورنہ تقریباً تمام تر قبریں نہایت پختہ ہیں اور ان پر نہایت عالیشان قبے بنے نظر آتے ہیں جن میں فنِ تعمیر کی خوبیاں اور نادرہ کاریاں نمایاں ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین و اُمراء کی شان و شوکت مرنیکے بعد بھی قائم ہے۔ مگر اس کے باوجود اُن کی دُنیوی شان و شوکت کے مقابلہ میں یہ شان و شوکت بالکل مختلف نظر آتی ہے اور اس لئے دلوں پر اس کا اثر بھی بہت مختلف ہوتا ہے۔

مثلاً ایک طرف مقبروں کی عظمت و بلندی آپ کو محوِ حیرت کرے گی۔ مگر دوسری طرف خود صاحبِ قبر کی بے بسی اور خاموشی پر آپ کو حسرت بھی ہوگی۔

---

[1] سلاطین و اُمراء کی قبروں پر اس نیت سے جانا کہ ان کے لئے دعائے مغفرت کی جائے اور اُن کی قبروں کو دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے، یقیناً فائدہ سے خالی نہیں۔ مگر امیروں اور بادشاہوں کی قبروں پر جو اُونچے گنبد، شاندار قبے اور دیدہ زیب مجر تعمیر کئے گئے ہیں اُنھیں دیکھ کر زائر کو موت شاذو نادر ہی یاد آتی ہے۔ وہ تو گنبد کی شان و شوکت، دیواروں کی میناکاری اور تابوت کے نقش و نگار ہی میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاج محل اور جہانگیر کے مقبرے پر جاکر لوگ "پک نک" مناتے ہیں اور بجائے اس کے کہ موت کی یاد آئے اور دنیا کی خرافات سے بے رغبتی پیدا ہو، دنیا کی تفریحات کے جھرمٹ وہاں جھیلے کئے جاتے ہیں ۱۲ (ایڈیٹر)

اُن کے مقبروں کی عظمت و شوکت چاہے جیسی کچھ ہو مگر قبر والوں کی عظمت و شوکت تو ختم ہو چکی ہے اور ان کا نام صرف تاریخوں میں باقی رہ گیا ہے۔ اب نہ ان کا حکم و اقتدار چلتا ہے نہ کوئی اپنے کو اُن کی رعایا تسلیم کرنے پر آمادہ ہے۔ نہ اُن کی درباداریاں ہیں نہ میٹنگیں۔ اگر وہ نیک اور عادل تھے تو اُن کی یہی صفت اس بات کے لئے کافی ہے کہ ان کا نام ادب سے لیا جائے اور دل میں اُن کی عزّت و محبت پیدا ہو اور اگر وہ فاسق و ظالم تھے تو خواہ اُن کے مقبرے کتنے ہی عالی شان ہوں اُن کو کوئی شخص اچھے الفاظ میں یاد نہیں کر سکتا۔

بادشاہوں اور امیروں کے مزارات پر پہلا خیال اُن کے دنیوی ٹھاٹھ باٹ ہی کا آتا ہے۔ مگر یہ دیکھ کر دُنیا کے متاعِ غرور ہونے کا انتہا شدید احساس پیدا ہوتا ہے کہ آج ان کے مزاروں پر کہیں کوئی حاجب و دربان نہیں پایا جاتا جو زائرین کو آداب و قواعد سکھاتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر آپ لاہور میں جہانگیرؒ کے مقبرے پر حاضر ہوں تو کیا آپ کو اس کا خیال نہ آئے گا کہ دُنیوی جاہ و جلال کے زمانہ میں اس کے یہاں آئینِ ادب کی انتہا یہ تھی کہ حاضرین کو اس کے سامنے سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی آدمی پر مصیبت کے پہاڑ لا گراتی تھی۔

یہی جہانگیر تھا جس نے حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مجدد و مصلح بزرگ کو اپنے یہاں طلب کیا تھا اور انھوں نے اپنے عقیدہ کی رُو سے اسے سجدہ نہ کیا تھا تو اُن پر برقِ غضب چمک گئی تھی اور اُن جیسا گوشہ نشین فقیر دیکھتے دیکھتے جیل کی چار دیواری میں پہنچا دیا گیا تھا۔

آج یہی زبردستی کے مسجود ہیں کہ زمیں بوس اور خاموش ہیں اور انھیں کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کا دربار کہاں ہے اور آپ کس حال میں ہیں؟

آپ آگرہ تشریف لے جائیں اور شاہ جہاں کی قبر پر جانا ہو تو تاج محل کی خوبی و خوبصورتی کو دیکھ کر آپ چاہے جتنی حیرت اور مسرت کا اظہار کریں۔ مگر خاک میں سونے والے کے لئے تو بہر حال حسرت کے چار آنسو ہی بہا سکیں گے۔ آپ کو معاً یہ خیال آئے گا کہ شاہجہاں نے اپنی بیوی کی محبت میں چاہے لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کر کے دنیا کی ایک بے نظیر عمارت ہی کیوں نہ بنا دی ہو اور خود بھی اپنی بیوی کے پہلو میں کیوں نہ سو رہا ہو۔ مگر دُنیا کے حجلۂ عیش سے اس کو آخر کیا اور کس قسم کی مناسبت ہو سکتی ہے؟ کیا اس وقت آپ کی دیدۂ عبرت سے دو آنسو بھی نہ ٹپک سکیں گے؟

اگر آپ خلد آباد ضلع اورنگ آباد دکن میں حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر جائیں تو شاید سب سے زیادہ سبق آپ یہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو دنیا میں کچھ نہ ملا ہو۔ اگر وہ فقیر و درویش بن کر رہیں تو یہ بڑا کمال نہیں ہے۔ مگر جن کو دنیا کی ہر چھوٹی بڑی نعمت ملی ہوئی ہو اور دنیا کے سارے فوائد و لذائذ اُن کے قدموں میں لوٹ رہے ہوں۔ مگر وہ اُن سے بے رغبت ہوں اور فکرِ آخرت انھیں فقر کی دولت سے نواز دے تو وہ بڑے صاحبِ کمال ہیں۔

بادہ خوردن و ہشیار نشستن سہل است
گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

حضرت موصوف کے مزار پر اُن کی پاکیزہ زندگی کے اوراق آپ کے ذہن میں تیزی سے پلٹتے چلے جائیں گے اور آپ محسوس کریں گے کہ جس شخص کو اکبر و جہانگیر کی سلطنت سے بھی کہیں زیادہ وسیع اور بڑی سلطنت ملی ہوئی تھی۔ اور جس کے سامنے اس کے آبا و اجداد کے خدائی ٹھاٹھ باٹ کے نمونے بھی موجود تھے، وہ عمر بھر فقر کے نشہ میں ایسا سرشار رہا کہ "فقر او از تربتش پیدا ستے" اس نے

یہ بھی نہ چاہا کہ اس کی قبر کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو بادشاہوں اور امیروں
کے ساتھ ہوتا چلا آتا ہے۔

اگر آپ رنگون جائیں اور بہادر شاہ ظفر کے مزار پر جانا ہو جائے تو
آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کی قبر کا صحیح نشان تک موجود نہیں ہے۔ اُس وقت
اگر آپ ذوق مرحوم اور دوسرے شعراء کے اُن قصیدوں کو ذہن میں رکھ
لیں جو اُس کی شان میں کہے گئے ہیں اور خود اس کے دلّی سے نکلکر رنگون
پہنچنے اور مرنے تک کی تاریخ بھی ساتھ ساتھ یاد کرلیں تو دُنیا کی بے ثباتی کا
ہی نہیں، دوسرے متعدد سبق آپ حاصل کر سکتے ہیں۔

علامہ اقبال جب کابل میں بابر کے مزار پر پہنچے تو فرمایا ؎

خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرمید ایں جا — کہ ایں میں زطلسمِ فرنگ آزاد است

چونکہ بابر ہندوستان پر چڑھائی کرنے کے باوجود ہندوستان میں نہیں
مرا اور اس وقت ہندوستان "طلسم فرنگ" میں گرفتار اور افغانستان

۱؎ ۱۳۳۱ھ میں عثمان علی خاں سابق فرمانروائے دکن نے عالمگیر کے مزار کو سنگِ مرمر سے
پختہ کروا دیا ہے۔ مگر قبر کا درمیانی حصہ کھلا چھوڑا گیا ہے اور قبر بھی اونچی نہیں بنائی گئی۔ قبر
کی چار دیواری اتنی مختصر اور محدود ہے کہ پانچ سات آدمی ہی داخل ہو سکتے ہیں اور
اس چار دیواری پر چھت بھی نہیں ہے ۱۲ ؎ ظفر نے کہا تھا: ؎

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو — ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

اتفاق دیکھئے کہ اس کی موت بھی اسی کی پسند کے مطابق واقع ہوئی۔ دلّی میں
تو سات پشت خاندان زیرِ زمین آباد ہے۔ کابل میں بابر، سکندرہ میں اکبر، لاہور میں
جہانگیر، آگرہ میں شاہجہاں، دکن میں عالمگیر، یہ غریب مرا تو کہاں؟ رنگون میں۔
جل شانہٗ وجل جلالہٗ ۱۲

آزاد تھا۔ اس لئے معاً انھیں بابر کی خوش نصیبی کا خیال آ گیا۔ مگر یہ ایک ضمنی بات تھی اور بادشاہت کے تصور سے فقر کا تصور پیدا ہونا لازمی تھا۔ اور خود علاّمہ اقبال۔۔۔۔ فقیر اور فقیر دوست تھے۔۔۔۔ اس لئے انھوں نے اپنی ذات کی نسبت فرمایا:۔

درونِ دیدہ نگہ دارم اشکِ خونیں را　　　　کہ من فقیرم و ایں دولت خداداد است

سلطان محمود غزنوی کے مزار پر گئے تو سلطان کا ذکر ان الفاظ میں کیا:۔

برقِ سوزاں تیغِ بے زنہارِ او　　　　دشت و در لرزندہ از یلغارِ او
زیرِ گردوں آیت اللہ رایتش　　　　قدسیاں قرآں سرا بر تربتش

پھر اپنے ذاتی تأثرات ان الفاظ میں بیان فرماتے:۔

شوخیٔ فکرم مرا از من ربود　　　　تا نبودم در جہانِ دیر و زود
رُخ نمود از سینہ ام آں آفتاب　　　　پردگیہا از فروغش بے حجاب
ہرِ گردوں از جلالش در رکوع　　　　از شعاعش دوش می گردد طلوع
وا رہیدم از جہانِ چشم و گوش　　　　فاش چوں امروز دیدم صبحِ دوش

پھر شہر غزنی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

قصرہائے او قطار اندر قطار　　　　آسماں با قُبّہ ہائش ہم کنار

نکتہ سنجِ طوس را دیدم بہ بزم　　　　لشکرِ محمود را دیدم بہ رزم
روحِ سیرِ عالمِ اسرار کرد　　　　تا مرا شوریدہ و بیدار کرد

یعنی غزنی کے قطار در قطار قصروں اور آسمان سے ہمکنار ہونیوالے قبّوں کو دیکھنے کے باوجود اُن کی نظر انہی چیزوں میں اٹک کر نہیں رہ گئی، بلکہ اُن کی چشمِ تصوّر نے فردوسی کو بزم میں اور محمود کو رزم میں بھی دیکھا اور روح نے عالمِ اسرار کی ایسی سیر کی کہ انھیں بیدار کر دیا۔ پھر غزنی کے ویرانے

میں پہنچے تو پہلے "مکرِ ایام" سے پناہ مانگی اور پھر خدا سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

مردِ حق آں بندۂ روشن نفس ‏ ‏ ‏ نائبِ تو در جہاں او بود و بس
او بہ بندِ نقرہ و فرزند و زن ‏ ‏ ‏ گر توانی سومنات او شکن
ایں مسلماں از پرستاران کیست؟ ‏ ‏ ‏ در گریبانش یکے ہنگامہ نیست!
سینہ اش بے سوز و جانش بے خروش ‏ ‏ ‏ او سرافیل است و صورِ او خموش

احمد شاہ ابدالی کی قبر پر گئے تو فرمایا۔

ملتے را داد ذوقِ جستجو ‏ ‏ ‏ قدسیاں تسبیح خواں بر خاکِ او
از دل و دستِ گہر ریزے کہ داشت ‏ ‏ ‏ سلطنت ہا برد و بے پروا گذاشت

سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو شہید کے مقبرہ پر تشریف لے گئے تو شہادت کے تصور کو تازہ کیا اور دوسروں کے اندر بھی اس کا تصور پیدا کرنے کے لئے رودِ کاویری کے نام سلطان شہید کا ایک پیغام نظم کیا جس میں حیات، موت اور شہادت کی حقیقت سمجھائی۔ یہ نظم طویل ہے اور پوری کی پوری پڑھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے (ملاحظہ کیجئے جاوید نامہ آں سوئے افلاک) اس کے چند شعر یہ ہیں۔

سینہ داری اگر در خورد تیر ‏ ‏ ‏ در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر
زانکہ در عرضِ حیات آمد ثبات ‏ ‏ ‏ از خدا کم خواستم طولِ حیات
زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟ ‏ ‏ ‏ یک دمِ شیری بہ از صد سالِ میش
بندۂ آزاد را شانے دگر ‏ ‏ ‏ مرگ او را می دہد جانے دگر
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست ‏ ‏ ‏ مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست
بگذر از مرگے کہ سازد با لحد ‏ ‏ ‏ زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد
مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک ‏ ‏ ‏ آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر ‏ ‏ ‏ مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است — جنگِ مومن سنّتِ پیغمبری است
آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت[1] — جنگ را رہبانیِ اسلام گفت
کس نداند جز شہید این نکتہ را — کو بخونِ خود خرید این نکتہ را

غرض بے شمار مزاروں پر بے شمار کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں اور آپ ان سب سے سبق لے کر وہی کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جس سے آپ کی زندگی ایک مسافرانہ زندگی بن کر رہے اور دنیا میں رہ کر بھی دُنیا سے دل نہ لگے۔

۳۔ علماء و صلحا کی قبریں

علماء و صلحا در اصل قوم کے رہنما ہوتے ہیں اور انہی کی علمی و دینی خدمات سے دُنیا میں اسلام کا چراغ روشن رہا اور انشاء اللہ ہمیشہ رہے گا۔ ان کی قبروں کی زیارت تذکرِ آخرت اور تصوّرِ موت کے ساتھ یہ سبق بھی دیتی ہے کہ آدمی کو آخرت کا سامان کرنے کے لئے اس دُنیا میں کیا کچھ کرنا چاہئے اور سلفِ صالحین نے اس سلسلہ میں کیا کچھ نمونہ چھوڑا ہے۔ اگر وہ نامعلوم الاسم ہوں تو اجمالی سبق بہرحال حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اُن کے نام معلوم ہوں اور نام کے ساتھ ساتھ اُن کے کام سے بھی آدمی کو ضروری واقفیت حاصل ہو تو یہ بہت زیادہ مفید ہے[2] اور اگر زائر کو ان کے ساتھ

---

[1] پہلے مصرعہ میں حضور سرورِ کائنات مراد ہیں اور دوسرے مصرعہ میں حدیث الجہاد رہبانیۃ الاسلام کی طرف اشارہ ہے ۱۲ [2] فاضل مقالہ نگار کی یہ رائے صائب ہے اور قرینِ حق و صواب ہے۔ مدیر "فاران" کو اس سلسلہ میں صرف ایک ضروری بات کی طرف متوجہ کر دینا ہے۔ وہ یہ کہ آجکل اولیاء اور صلحاء کی قبروں پر عام طور سے لوگ نذر و نیاز گذارنے اور استمداد کی نیت ہی سے حاضر ہوتے ہیں۔ عرس کے علاوہ بعض قبروں پر دن رات میلہ سا لگا رہتا ہے ان حالات میں جناب شیخ احمد صاحب جیسے صحیح عقیدہ کے لوگ قبروں پر جاتے ہیں تو انہیں وہاں "حاضر" (؟) دیکھ کر اہلِ بدعت یہی سمجھتے ہیں کہ جن معتقدات اور مرادوں کو لیکر ہم "مزارِ اقدس" پر آتے ہیں اسی کام کیلئے یہ صاحب بھی آئے ہیں ان دنوں اولیاء و صلحاء کی قبروں کی زیارت اگر اس "فتنہ" میں اضافہ کر رہی ہو تو کیا کیا جائے۔ فافہم فتدبر۔ (مدیر)

اعتقادی، اخلاقی اور روحانی نسبت بھی حاصل ہے تو اس نسبت میں جتنی زیادہ مضبوطی اور گہرائی ہوگی اتنا ہی زیادہ یہ زیارتیں زائر کو متأثر کریں گی۔ علامہ اقبال کو حکیم سنائی غزنوی سے گہری عقیدت تھی کیونکہ علامہ اقبال مولانا روم کو اپنا پیر سمجھتے تھے اور حکیم صاحب موصوف خود مولانا کے اکابر میں سے تھے جن کا ذکر مولانا نے اپنی مثنوی میں ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ اقبال نے حکیم صاحب کی کتابوں کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اسلئے جب انھیں سنہ ۱۹۳۳ء میں حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کا موقع ملا تو وہ مزار کے پاس جاتے ہی بے اختیار ہوگئے اور سرہانے کھڑے ہو کر دیر تک زور زور سے روتے رہے۔ خود علامہ نے اپنی مثنوی "مسافر" میں اس روحانی نسبت کو خوبی سے نظم کیا ہے۔ شہر غزنی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

خفتہ در خاکش حکیم غزنوی — از نوائے او دلِ مرداں قوی
آں حکیم غیب آں صاحب مقام — ترک جوش رومی از ذکرش تمام
من ز پیدا او ز پنہاں در سرور — ہر دو را سرمایہ از ذوقِ حضور
او نقاب از چہرۂ ایماں کشود — فکرِ من تقدیرِ مومن وا نمود
ہر دو را از حکمتِ قرآں سبق — او ز حق گوید من از مردانِ حق
در فضائے مرقدِ او سوختم — تا متاعِ نالہ اندوختم

سلہ علامہ اقبال مرحوم نے اپنی شاعری کے ذریعہ دین کی بلاشبہ بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور وہ عقائد کے اعتبار سے بھی بہت صحیح الخیال تھے، مگر انکے ہر قول و فعل کو فقیہ یا محدث کے قول و فعل کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اقبال نے اپنے کلام میں موضوع حدیثوں تک کو نظم کر دیا ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی منقبت میں انھوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے۔ ع مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

جہانتک اسفارِ زیارت کا تعلق ہے آپ زیارت ہی کے لئے بالقصد سفر نہ کریں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ سیر و سیاحت یا اپنی دیگر ضروریات سے آدمی جہاں جہاں جاسکے وہاں جاہے تو قبروں پر بھی کبھی ہو آئے یا کبھی کبھار قرب وجوار میں چلا جائے۔ جہاں التزام و اہتمام یا وقت و دولت کا بڑا صرف موجود ہو وہاں چاہے ابتداءً مقصد صحیح اور نیت نیک ہی رہے مگر اس میں اندیشہ ہے کہ آہستہ آہستہ کہیں فسادِ عقیدہ یا فسادِ عمل میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اس لئے ایک محتاط و متقی انسان کو احتیاط و تقویٰ ہی کے مقتضیٰ پر عمل کرنا اور شدِ رحال والی حدیث کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

مزاروں کے پاس آپ دعائے مسنونہ کے ساتھ کوئی اور دعا خدا سے مانگ سکتے ہیں، کیونکہ اس وقت تأثر کے باعث قبولیتِ دعا کا زیادہ امکان ہوتا ہے، مگر صاحبِ مزار سے یہ نہ کہئے کہ آپ میرے لئے خدا سے دعا مانگیں اگرچہ بعض علماءِ کرام نے اس فعل کو حدِ جواز میں لانے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے اس میں سخت کلام ہے اور میں ان علماء کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جنہوں نے اس فعل کو "بدعت" قرار دیا ہے۔[1] کیونکہ اوّل تو اموات پر سلام بھیجنے کی اجازت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ ہر قسم کی آوازوں اور دعاؤں کو سنتے بھی ہیں۔ اور اگر سنتے بھی ہیں تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے مطابق انھیں کچھ کرنے کی آزادی بھی دی گئی ہے۔ عالمِ برزخ ہمارے لئے غیب کا حکم رکھتا ہے اور ہم ذہن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حالانکہ کوئی ولی کسی نبی سے بلند نہیں ہو سکتا۔ یہ اقبال کے "مزلات" ہیں انپر نگاہ رکھنی چاہئے (ایڈیٹر) [1] علامہ آلوسی بغدادی، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمہم اللہ اور بہت سے علماء سلف وخلف کی یہی رائے ہے۔۱۲

تک جا سکتے ہیں جہاں تک حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات ہمیں لے جاتے ہیں۔ اس کے آگے استنباط و اجتہاد یا استنتاج و استدلال سے کسی چیز کا تعین ہمارے علم و یقین کے دائرے سے باہر ہے پس جب کہ حضورؐ سے اسکی اجازت منقول نہیں ہے اور نہ صحابہ، تابعین اور ائمہ اسلام نے کبھی ایسا کیا تو ہمیں بھی اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ معاملہ بہرحال مشتبہ ہے اور بندۂ مومن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان کو ہر قسم کے اشتباہات سے پاک رکھے۔ دوسرے یہ کہ اموات قبر کے عذاب و ثواب سے دوچار ہیں۔ اگرچہ ہمیں ہر ولی و صالح کے ساتھ، بلکہ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے ساتھ بھی حُسنِ ظن رکھنا چاہیئے۔ لیکن اگر ہم اُنکے کاموں اور حالات کو پیشِ نظر رکھیں تب بھی ہم ظنِ غالب سے آگے نہیں جا سکتے۔ یقینی علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے کہ ان کی صالحیت و ولایت کیا درجہ و مقام رکھتی ہے کیونکہ وہی نیتوں کا جاننے والا اور غیب و شہادت کا عالم ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت سعد بن معاذ کی تدفین عمل میں آئی تو حضورؐ نے تسبیح و تکبیر کہی۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس نیک بندے پر قبر تنگ ہو گئی تھی۔ اس کے ذریعہ اللہ نے کشادہ فرما دی۔ انہی سعد بن معاذ کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ان کی وفات پر عرش حرکت میں آ گیا تھا۔ اُنکے لئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے گئے تھے اور اُن کے جنازے میں ستّر ہزار فرشتے شریک تھے۔ مگر اُن کی قبر پہلے تو تنگ ہوئی اس کے بعد کشادہ کر دی گئی۔

اس سے اندازہ فرمایئے کہ کون یہ جان سکتا ہے کہ کون کس حال میں اپنی قبر کے اندر پڑا ہے۔ ہمیں بلاشک اولیاء و صالحین سے حسن ظن رکھنا چاہیئے۔ مگر بہرحال ہر ایک کی صحیح حالت صرف خدائے علیم و خبیر ہی کے علم میں ہے اسلئے ہمیں اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔

اگر آپ اولیاء وصالحین کی ذات کو وسیلہ بناتے ہوئے خدا سے دعا کریں تو اس کے جواز و عدم جواز میں بھی اختلاف ہے اور جہاں تک میں نے غور کیا ہے دونوں گروہوں کے دلائل میں خاصا وزن پایا جاتا ہے۔ اس لئے صحیح مسلک یہ ہے کہ کبھی کبھار ایسا کر لیا جائے تو ناجائز نہیں ہے۔ مگر اس کا التزام نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بغیر توسّل کے خدا کسی کی دُعا سنتا ہی نہیں اور یہ خیال بالبداہتہ غلط ہے۔ خدا فرماتا ہے:۔

وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ	اے نبی! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں
فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ	بتا دو کہ مَیں اُن سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب
الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔	مجھے پکارتا ہے تو مَیں اس کی پکار سُنتا اور جواب دیتا ہوں۔

مزارات کے پاس خواہ وہ عوام کے ہوں یا سلاطین و امراء کے یا اولیاء و صالحین کے، تلاوتِ قرآن کرنا میرے نزدیک جائز بلکہ مستحسن ہے۔ چاہے صرف حصولِ ثواب کی خاطر کی جائے یا صاحبِ مزار کے ایصالِ ثواب کے لئے۔ مگر تلاوتِ قرآن یا کسی بدنی عبادت کے ایصالِ ثواب میں ائمۂ اسلام کا اختلاف ہے۔ امام اعظم اور امام احمد بن حنبل اسے درست بتاتے ہیں اور امام مالک و امام شافعی نادرست۔ تاہم نفسِ تلاوتِ قرآن خود ایک ایسا فعل ہے جو نزولِ رحمت کا موجب ہے۔ اسلئے خواہ کوئی شخص قصداً ایصالِ ثواب نہ کرے مگر اہلِ قبور اللہ کی رحمت سے محروم نہیں رہ سکتے۔

۴۔ غیر مسلموں کی قبریں

غیر مسلموں کی قبروں کو دیکھنے کا اتفاقاً موقع ملے تو وہ دُعا نہ پڑھی جائے جو مسلمانوں کے قبرستان میں پڑھی جاتی ہے۔ کیونکہ سلام و دعا کا یہ طریقہ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے وہاں صرف اپنی موت کو یاد کرنے اور آخرت کی طرف دھیان دینے پر اکتفا کرے اور اگر

غیر مسلموں کی زندگیوں میں کوئی عبرت کا پہلو موجود ہے تو اس سے عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ علامہ اقبال نے نپولین کی قبر پر ایک نظم لکھی ہے جسمیں وہ کہتے ہیں۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز ‏ ‏ جوشِ کردار سے کُھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع ‏ ‏ کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر ‏ ‏ سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر ‏ ‏ جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس ‏ ‏ عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

"عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشان است

حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز"

ایک غیر مسلم کی قبر دیکھنے سے ایک بندۂ مومن کے سینہ میں جو جذبات و احساسات پیدا ہوتے ہیں اس نظم میں علامہ نے اُن کی بہترین ترجمانی کی ہے وہ کہتے ہیں کہ مسلم اور غیر مسلم سبھی یہاں "جوشِ کردار" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر مردانِ خدا کا "جوشِ کردار" ایک دوسری ہی چیز ہے کہ میدانِ جنگ میں اُن کی تکبیر خدا کی آواز بن جاتی ہے۔ اسلئے جوشِ کردار رکھنے والوں کو اپنے عمل کی راہ سوچ لینی چاہئے اور جلد سرگرم عمل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ "فرصتِ کردار" تھوڑی ہے اور قبر کی رات لمبی مسلم و غیر مُسلم سب کی آخری منزل تو وہی "وادیٔ خموشاں" ہے جسکی طرف سب گئے ہیں اور روز چلے جاتے ہیں۔ نام اللہ کا۔

دفاضل مضمون نگار کے اس گرانقدر مقالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قبر و نیز عُرس خیرہ کے نام سے جو کچھ ان دنوں ہو رہا ہے اُنہیں سے بعض چیزیں تو "شرک" کی تعریف میں داخل ہیں اور بعض خطرناک قسم کی بدعات ہیں۔ مسلمانوں کو ان سب سے قطعاً اجتناب کرنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قبروں کی زیارت دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کیلئے ہے نہ کہ کسبِ فیض و برکت کے لئے) (م۔ق)

مولانا عامر عثمانی (ایڈیٹر تجلی دیوبند)

بدعت توحید کی ضد ہے

توحید ایک سادہ سا لفظ ہے، جس کے مفہوم و مراد کو ہر عام و خاص جانتا ہے۔ لیکن اگر علم و عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہی سادہ سا لفظ اپنی حقیقت، ثمرات اور مقتضیات کے اعتبار سے تمام دنیائے انسانیت کے لئے اتنا عظیم، ایسا اہم اور اس قدر گرانمایہ ہے کہ اسی پر اس کی دنیا اور عقبیٰ، آغاز اور انجام، حیات اور معاد، حتیٰ کہ تمدن و معاشرت کی اصلاح و فساد اور زندگی کے تمام شعبوں کی بھلائی بُرائی کا دار و مدار ہے۔ علم و اعتقاد کا اگر یہ سرچشمہ خشک ہو جائے تو انسان کے پاس خیر و فلاح اور ہدایت و حقیقت تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ شاید اسی لئے ربُّ العزت نے ازل کے دن اپنے بندوں سے سوال کیا تھا کہ "اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ؟" اور بندوں نے کہا تھا کہ "بلیٰ" ہاں تو بیشک ہمارا رب ہے۔ یہ عہد حافظوں سے اگرچہ محو ہو گیا۔ لیکن انسان کے تحت الشعور اور فطرت میں ایک پیاس، ایک تحریک ایک داعیہ بن کر سما گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں، ہر قوم اور ہر مذہب نے کسی نہ کسی نوعیت سے توحید کی شان و عظمت کو تسلیم کیا اور عملاً بے شمار خداؤں کو پوجنے کے باوجود بنیادی اور فطری طور پر یہی مانا کہ بڑا خدا ایک ہی ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے خدا اُسی کے قائم مقام ہیں۔ یا اس کی مختلف صفات کے نمائندے ہیں۔ یا انھیں اُمورِ عالم حصہ وار سپرد کر کے بڑا خدا آرام کر رہا ہے۔ وغیرہ ذٰلک۔ ممکن ہے بہت پرانے زمانہ میں بعض قومیں کسی قلیل مدت تک معبود کے

الگ الگ مظاہر اور نشانات مقرر کر لئے اور علیحدہ علیحدہ اُن مظاہر اور نشانات کو پُوجا۔ ہر مظہر اور نشان کو پوجتے ہوئے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی گمان کرتی رہیں کہ ہم اصل معبود کو پوج رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان اگر کسی عقیدے اور تخیل کی ترجمانی کے لئے ایسے افعال و اطوار اختیار کرے جو حقیقتاً اس عقیدہ و تخیل کی ضد اور نقیض ہوں تو یہ عقیدہ و تخیل دھندلا پڑتے پڑتے بالکل معدوم ہو جاتا ہے اور خواص کے قلب و دماغ میں اس کا موہوم سا نقش باقی بھی ہو تو کم سے کم عوام کے دل و دماغ میں یہ برائے نام بھی باقی نہیں رہتا۔ عوام اپنے اعمال میں عموماً رسم و روایت اور بے مغز تقلید و اتباع کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ فطرت کے تقاضے اور انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کے باوجود غلط اور باطل طریق عبادت نے توحید کے نقش کو اس طرح مٹا دیا کہ جب رسولؐ نے اُن سے کہا کہ ایک ہی خدا کو مانو تو اظہارِ حیرت کرتے ہوئے بولے کہ یہ تو ہمارے سارے معبودوں کو ذلیل کر کے ایک ہی خدا کو سارے حقوق دیئے دیتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ حیرت اور اعتراض توحید کے عقلی و جبلّی انکار اور شعوری تردید پر مبنی نہ تھا' بلکہ عملاً متعدد معبودوں کو پوجتے رہنے اور رسم و رواج کے رنگ میں رنگے جانے کا سطحی نتیجہ تھا۔ جہالت و بے شعوری کا ثمرہ تھا۔

آج کی دُنیا کو دیکھئے' جو قومیں بے شمار بتوں کو پوجتی ہیں اور کتنے ہی انسانوں کو معبود بنائے ہوئے ہیں اور کتنے ہی خیالی دیوتاؤں کی پرستش کرتی ہیں اُن کے رہنماؤں اور عالموں سے آپ کلام کریں تو وہ ہرگز ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ کارخانۂ عالم پر دو یا دو سے زیادہ برابر کی طاقت والے دیوتاؤں کی خدائی ہے' بلکہ وہ اصل اور حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی آمرِ مطلق تسلیم کریں گے۔ لیکن چونکہ سب سے بڑا خدا اور اس کی متعدد طاقتیں اور صفات آنکھوں سے نظر آنے والی چیزیں نہیں اس لئے

اُس خدا اور اُس کی صفات پر اچھی دھیان جمانے اور جس صفت سے مدد لینے کی ضرورت پڑے اُسی صفت پر اپنی توجہ مرتکز کرنے کے لئے ہم نے بتوں کو ظاہری نشان اور مظہر بنالیا ہے۔ بعض انسانوں اور خیالی دیوتاؤں کے بارے میں وہ یہ کہینگے کہ بجائے خود بھگوان تو ہم کسی کو نہیں مانتے۔ ہاں فلاں بزرگ میں بھگوان نے اپنی فلاں صفت ڈال دی اور فلاں دیوتا کو فلاں طاقت سپرد کر دی۔ گویا اصل کے اعتبار سے تو معبود ایک ہی ہے۔ مگر واسطے اور انتظامی آسانیوں کے اعتبار سے یہ لوگ دسیوں معبود بنائے ہوئے ہیں۔

جو قومیں خوش فہمی سے اپنے کو عیسائی کہتی ہیں "خوش فہمی" اسلئے کہ درحقیقت نہ یہ اس تعلیم کو مانتی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم تھی، نہ یہ تعلیم اپنی صحیح شکل میں آج موجود ہے) اُن کا بھی یہی حال ہے کہ علمی و منطقی اعتبار سے قائل تو وہ تثلیث کی ہیں۔ لیکن کسی بھی عیسائی عالم سے گفتگو کیجئے، وہ شرک کا اقرار اور توحید کا انکار ہرگز نہیں کریگا بلکہ اپنی تثلیث کا سرا کھینچ تان کر توحید ہی سے ملائے گا اور باوجود مشرکانہ عقائد و اعمال کے بنیادی ذہن اُس کا یہی ہوگا کہ مستقل بالذات مختارِ مطلق اور تمام اقتدار و قوت کا مرکز تو صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ انسان کے عقل و شعور اور فطرت کس لئے توحید کا میلان رکھتے ہیں؟ کھلی مشرک قومیں کس لئے توحید کا انکار نہیں کرتیں؟ ان سوالوں کا واحد جواب یہ ہے کہ اس کارخانۂ عالم کے لئے کسی ایک ہستی کو خالق و مالک ماننا اور تمام قوت و قدرت کو اسی سے منسوب کرنا عین فطرت اور عین شعور اور عین عقل و فہم ہے۔ عقل چاہے کیسی ہی نکتہ سنجیاں کرلے، منطق چاہے کتنی ہی پلٹیاں کھالے فلسفہ چاہے کیسے ہی گوشے نکال لے۔ لیکن ناچار اس پہاڑ کی طرح اٹل حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کہ معبودِ حقیقی اور تمام اختیار و اقتدار کا مالک اور پروردگار ایک ہی

ہو سکتا ہے اسلام کے اپنی مکمل اور آخری شکل میں آنے سے پہلے تو یہ ممکن بھی تھا کہ خود ایجاد معبودوں کے پجاری اور خود تراشیدہ طرقِ عبادت کے متوالے توحید سے برملا انکار کر دیں۔ لیکن اسلام نے آکر انسان کو اُس کی فطری مانگ کا ٹھیک ٹھیک احساس دلایا۔ تہ نشین داعیے کو ایک حسین وجمیل نظریہ اور اُصول کی شکل میں پیش کیا۔ ٹھوس علمی و عقلی دلائل فراہم کئے اور قرآن کی تنہا ایک ہی دلیل اتنی اثر انگیز، قوی اور آہن و فولاد سے زیادہ مستحکم ثابت ہوئی کہ انسانی عقل و علم اور مشاہدہ و تجربہ کے لئے اس کی تردید ناممکن ہو گئی۔ خدا نے سادہ لفظوں میں کہا کہ اگر ایک سے زیادہ رب ہوتے تو کارخانۂ عالم زیر و زبر ہو جاتا یہ سادی سی مختصر دلیل انسانی عقل و علم کی تمام بساط پر آسمان کی طرح چھا گئی۔ تجربہ نے قدم قدم پر بتایا کہ بقائے عالم کے لئے ایک ہی شہنشاہ اور مالک الملک کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ اسلام نے اور بھی مضبوط دلیلیں دنیا کے سامنے رکھیں اور دنیا کو ماننا پڑا کہ توحید کی صداقت و حقانیت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

دوسرا جواب یعنی اس سوال کا جواب کہ عملاً ایک سے زیادہ معبود ماننے والی قومیں بھی اپنا رشتہ توحید ہی سے کیوں قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہیں ایک اور بھی ہے جو اگرچہ عقلی و قیاسی قسم کا نہیں، بلکہ اس کو سمجھنے اور ماننے کا مدار انسانی قلب و روح کی صلاحیت پر ہے۔ لیکن چونکہ ہمارا خطاب اہلِ ایمان ہی سے ہے اس لئے اس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

سورۂ اعراف رکوع ۲۲ میں ہے:۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ	اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھ سے
مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ	اُن کی اولادیں نکالیں اور خود اُنہی کو اُنکا

وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ۝

گواہ بنا دیا (اُن سے پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اُنھوں نے جواب دیا بیشک (یہ کام اللہ نے اس لئے کیا کہ) تم حشر کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس سے (تیرے رب ہونے سے) بے خبر تھے

یہ واقعہ عالمِ مثال کا ہے۔ ابنِ عباسؓ کی روایت کے مطابق اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روزِ اول سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام ہی انسانوں سے یہ عہد لیا گیا اور الفاظِ آیت کو کسی خاص تعبیرِ انسانی پر بھی بقولِ بعض محمول کیا جا سکتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ توحید کا اعتراف و اقرار فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔ پہلی صورت میں توجیہ کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر انسان اس میں شامل ہے۔ البتہ دوسری صورت میں یہ توجیہ کرنی پڑے گی کہ جس طرح بھوک، پیاس، نیند، عقل اور شعور یا دیگر وغیرہ انسان کے اندر ایک دوسرے میں متوارث ہوتی چلی جاتی ہیں اسی طرح اس عہدِ الست کا اثر بھی قیامت تک متوارث ہوتا چلا جائے گا۔ یہ توجیہ محض تاویل کا درجہ نہیں رکھتی، بلکہ انسان کی تاریخ اس پر ناقابلِ تردید شہادت مہیا کرتی ہے۔ قدیم سے قدیم تر جس زمانہ کا حال ہمیں تاریخ بتاتی ہے اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مہذب، پس ماندہ، بے علم اور ترقی سے ناواقف انسان بھی آپ سے آپ کسی نہ کسی معبود کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔ مانا کہ عقل کی نارسائی اور نفس کی فریب انگیزی کے باعث یہ پوجا توحید کی ضد اور شرک پر مشتمل تھی لیکن اس حقیقت سے انکار کی کیا گنجائش ہے کہ اُن کا جذبۂ عبودیت فطرت ہی کی پکار تھا۔ فطرت نہ اُبھارتی تو آخر کون سی طاقت اُنھیں مجبور کر رہی تھی کہ تلاشِ رزق، جستجوئے آرام و راحت اور دیگر مشاغلِ دُنیاوی کے ساتھ ساتھ وہ خواہ مخواہ؟

پوجا پاٹ میں وقت ضائع کریں اور بے وجہ خود کو کسی ایک یا چند معبودوں کے آگے پست و ذلیل بنائیں آخر کس نے اُن سے کہا تھا کہ سورج یا دریا یا پتھر کے مجسموں کو پوجنا شروع کر دو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض اور محض اسی بناء پر ہو سکتا ہے کہ جس طرح بھوک، پیاس، طلب آرام، نیند اور جنسی میلان فطرت کے ایسے داعیے ہیں کہ ان کے لئے کسی خارجی محرک اور معلم کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جذبۂ عبودیت اور خواہش نیازمندی بھی فطرت ہی میں داخل ہے، جس کے لئے کسی بیرونی محرک و معلم کی احتیاج نہیں۔ احتیاج ہے تو صرف اس بات کی کہ اس جذبہ کو صحیح راہ پر ڈالنے کے لئے اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء کی تعلیم و تفہیم کو قبول کیا جائے۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد وہ اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے جو کم فہم اور سطح بین لوگ عہد الست کے بارے میں کرتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ کہتے ہیں کہ جب یہ ازلی عہد انسان کے حافظہ میں محفوظ نہ رہا تو اس سے کیا حاصل ہوا؟ اور کیوں اللہ نے یہ عبث کام کیا؟

یہ اعتراض اس لئے ختم ہو جاتا ہے کہ یہ عہد حافظوں میں مرتسم کرنے کے لئے لیا ہی نہیں گیا تھا اور نہ اللہ تعالیٰ نے توارث و تناسل میں یہ قاعدہ رکھا ہے کہ جو واقعات باپ کے حافظہ میں محفوظ ہوں وہ کل یا بعض اولاد کے حافظوں میں بھی منتقل ہو جائیں بلکہ اس عہد کا منشاء توحید اور جذبۂ پرستش کو انسان کی فطرت کا جزو بنا دینا تھا اور اس کے اندر پروردگار کی تلاش و تجسس کا رجحان، استعداد اور داعیہ پیدا کر دینا تھا۔ کسی واقعہ کا حافظہ سے محو ہو جانا ہی اس کی بے اثری پر کافی دلیل نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو جوانی میں یہ بالکل یاد نہیں رہتا کہ آج ہم جس زبان کی ہر کتاب کو فر فر پڑھ ڈالتے ہیں اُس زبان کی الف بے ہمیں بچپن میں کس نے، کب اور

کس طرح سکھائی۔ انھیں نہ وہ ماحول یاد ہوتا ہے جس میں انھیں حرف شناسی کے ابتدائی سبق ملے۔ نہ اس سے متعلق کوئی اور تفصیل حافظہ میں محفوظ ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کی موجودہ حرف شناسی اور زبان دانی اور علم وفن کی بنیاد اوّلین ظاہر رہے کہ چھٹپنے کی یہی تعلیم تھی اور اسی تعلیم نے اُن میں یہ ملکہ پیدا کیا کہ ضخیم کتابیں بلا تکلف پڑھ ڈالیں۔ اب کیا کوئی نادان یہ احمقانہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ حافظہ سے محو شدہ ابتدائی تعلیم بے کار اور عبث رہی۔ یا کوئی پڑھا لکھا آدمی محض اس لئے اپنے پڑھے لکھے ہونے سے انکار کر سکتا ہے کہ اسے اپنے بچپن کے معلم کا نام اور حرف شناسی کا زمانہ اور کیفیت اور ماحول اور کچھ بھی یاد نہیں رہا ہے۔ یاد رہے نہ رہے لیکن حرف شناسی کا جو ملکہ اور شعور پیدا ہو چکا ہے وہ بالکل کافی ہے۔

اسی سے کسی نہ کسی حد تک ملتی جلتی مثال عہدِ الست کی ہے۔ وہ حافظوں میں ثبت کرنے کے لئے نہیں لیا گیا تھا۔ بلکہ وہ اس لئے تھا کہ انسان کی جبلّت و فطرت میں ایک ملکہ، ایک استعداد اور ایک مستقل پیاس، ایک طلب، ایک داعیہ ایک تحریک ہمیشہ کے لئے جاگزیں کر دے، اور دیگر عناصرِ فطرت اور اجزائے جبلّت کی طرح یہ بھی قیامت تک فطرت کا جزو بنا رہے۔

اس کو اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے:۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔	اللہ کی فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اس کی تخلیق میں تغیر و تبدل ممکن نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو بایں الفاظ بیان فرمایا:۔

مامِن مولودٍ اِلّا یُولَدُ عَلَی الفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ او ینصرانہٖ او یُمَجِّسَانِہٖ۔	ہر ایک بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی (وغیرہ) بنا دیتے ہیں۔

اصل فطرت یہی ہے کہ انسان ایک خدا کو مانے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ عقل وعلم کی نارسائی کے باعث انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ماننے کے صحیح طریقے اور آداب اور مقتضیات کو آپ سے آپ سمجھ سکے۔ اس کے لئے اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اس ضرورت کو اللہ تعالیٰ برابر پورا کرتے رہے اور آخر کار ایک آخری نبیؐ کو مکمل شریعت اور دین دے کر بھیج دیا کہ قیامت تک کے لئے تمام عالمِ انسانی اس دین کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلکر بندگی کا صحیح حق ادا کرسکے۔

توحید خالص

ان تمہیدی سطور کے بعد اب ہمیں دیکھنا ہے کہ جب تمام ہی قومیں کسی نہ کسی نوعیت میں توحید کی صداقت وحقانیت کی صراحتاً یا اشارۃً قائل ہیں تو کیا اُن کی اور مسلمانوں کی توحید ایک ہی ہے یا الگ الگ ہے؟ کیا توحید کی حد تک سب کو ایک ہی صف میں سمجھا جائے گا یا کچھ فرق کیا جائے گا۔

تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ توحید اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو فرق واختلاف اور تقسیم کی گنجائش ہی نہیں رکھتی۔ لیکن لفظی مفہوم کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے تو ان دو قسموں کا نام توحید ربوبیت اور توحید اُلوہیت رکھا ہے لیکن ہمیں بات کو زیادہ عام فہم بنانے کے لئے ان کا نام توحید لفظی اور توحید حقیقی رکھتا ہوں۔

توحید لفظی تو یہ ہے کہ آدمی خدا کو ایک مانے اور بس۔ یعنی وہ یوں کہے کہ تمام اقتدار وقوت کا مالک ایک ہی ہے اور اس کے مثل اور برابر کوئی نہیں بس بات اتنے پر ختم کردے یا زیادہ سے زیادہ یہ مان لے کہ وہی رزق دینے والا ہے، مارنے والا ہے، جلانے والا ہے۔ اس طرح کی چند صفات مانکر خاموش

ہو جائے اور نہ تو جملہ صفاتِ الٰہیہ کا اقرار کرے نہ اُن مقتضیات اور ثمرات پر توجہ دے جو خدا کو مالک وخالق اور رزّاق ورب ماننے کالازمی نتیجہ ہیں ـــ یہ ہے توحید لفظی، یہی توحید ہے جس کے غیر مسلمین قائل ہیں اور یہی وہ توحید ہے جو اگرچہ لفظاً توحید کہی جاتی ہے. لیکن نتائج اور ثمرات کے اعتبار سے کفر وشرک ہی ہوتی ہے اور اس توحید کے قائلین عموماً وہ کچھ کرتے اور کہتے ہیں جو توحیدِ حقیقی واصلی کے فوائد ومنافع کو پامال کرنے والا اور شرک وکفر کے مضرات وفسادات کو نشوونما دینے والا ہوتا ہے۔

قرآن وحدیث میں لفظی توحید کی پوری صراحت ہے اور بہت صفائی سے بتادیا گیا ہے کہ اس طرح کی توحید نہ خدا کو مطلوب ہے نہ اس سے توحیدِ حقیقی کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ توحیدِ لفظی کے قائلین کا حال اللہ نے ایک جگہ یوں بیان کیا :-

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝

(اے محمدؐ) اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین، آسمان اور ساری چیزیں کس کی ہیں اگر تمہیں معلوم ہو تو کہیں گے اللہ کی۔ تو ان سے کہو تم نصیحت کیوں نہیں پکڑتے؟ (پوچھو) سات آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ کہیں گے اللہ! کہو پھر تم کس لئے نہیں ڈرتے؟ پوچھو تمام کائنات کی ملکیت وحکومت کس کے دستِ قدرت میں ہے۔ وہ کون ہے جو دوسروں کو پناہ دیتا ہے لیکن اسکے بالمقابل کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ کہیں گے اللہ۔ تو کہو پھر تم ...

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ

اگر ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے کہ خدا نے۔

گویا وہ لوگ اللہ کی مالکیت اور حاکمیت اور خالقیت وغیرہ کے تو قائل تھے، لیکن پھر بھی وہ راہ راست سے اس درجہ ہٹے ہوئے تھے کہ گویا سحر زدہ ہوں، جو صاف اور سیدھی راہ پر چلنے کی بجائے غلط اور ٹیڑھی راہ چلے جاتے ہوں۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝

ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود ان میں کے اکثر مشرک ہیں۔

دوسری قسم توحید حقیقی ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ انسان خدا کو بایں معنی ایک مانے کہ تمام صفاتِ کمالیہ کا وہی متصف ہے اور اسی کی حکمرانی نہ صرف مادی کائنات کے ہر گوشے پر ہے بلکہ انسان کے جذبات و خیالات، روح، شعور اور لطیف سے لطیف تر عناصر پر ہے اور اس کے اقتدارِ مطلق اور حاکمیت جامعہ کے جو بھی تقاضے اور مطالبے ہیں وہ سب کے سب نہ صرف دل و زبان سے واجب القبول ہیں، بلکہ انھیں عملی زندگی میں رہنما بنانا اور افعال و اعمال سے اُن پر یقینِ کامل کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے۔ وہی ہر چھوٹے بڑے معاملہ کا منصف، ہر مسئلہ کا حل کرنے والا، ہر کھلی چھپی بات سے باخبر، ہر عیب و صواب کا واقفِ کامل اور ہر مقام پر ہر وقت ہر زمانے میں حکمراں ہے۔

توحید کی یہی قسم ہے جو اللہ کو مطلوب ہے اور اسی کے ماننے والے اس کے نزدیک مومن ہیں۔ جیسا کہ قرآن و حدیث میں اسے بالوضاحت بیان کر دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن و حدیث میں ایسی لفظی تقسیم نہیں ملی جیسی

ہم نے یا بعض علمائے سلف نے کی ہے۔ کیونکہ توحید تو فی الاصل ایک ہی ہے اور جس نامکمل، ناقص اور بے نتیجہ تخیل کو انسانوں نے توحید کا نام دے رکھا ہے۔ وہ توحید نہیں شرک ہے۔ لیکن ہم نے تقسیم محض سمجھانے اور بات کو واضح کرنے کے لئے کی ہے تاکہ اللہ کو جو توحید مطلوب ہے اُس کی وضاحت ہو اور جو مطلوب نہیں ہے اس کی تردید ہو جائے۔

توحیدِ حقیقی کی وضاحت کے لئے اللہ نے قرآن میں بہت سی صریح و واضح آیات نازل فرمائیں اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کی تشریح و توضیح اتنے تکرار اور کثرت سے کی کہ شاید ہی کسی اور آیت کی کی ہو۔ آپؐ نے شرکِ جلی ہی کو واضح نہیں فرمایا، بلکہ شرکِ خفی کو بھی موقع بہ موقع بیان کرتے رہے اور زندگی کے کسی بھی گوشہ میں مشرکانہ خیالات و رجحانات کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ یہانتک کہ فرمایا:۔

یسئل احدکم ربہ حاجتہ کلھا حتی یسئل شسع نعلہ اذا انقطع فانہ ان لم ییسرہ لم یتیسر۔	چاہیئے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی ہر حاجت خدا ہی سے مانگے۔ یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی، جب وہ ٹوٹ جائے۔ کیونکہ اللہ اگر میسر نہ فرمائے تو جوتے کا ایک تسمہ بھی میسر نہیں آسکتا۔

غور کیجئے، کتنی پاکیزہ اور بے میل توحید کا سبق رسول اللہؐ دے رہے ہیں۔ انھوں نے اُمت کو ایک حقیر سی شے۔ جُوتے کے تسمہ کی مثال دے کر یہ تعلیم دی کہ خزانے، جائدادیں اور اہم بالشان چیزیں ہی خدا کی عطا کردہ نہیں ہیں۔ بلکہ دُنیا کی حقیر سے حقیر تر چیز بھی اسی کی مرضی سے میسر آسکتی ہے ورنہ اس کی مرضی نہ ہو تو جُوتے کا تسمہ جیسی حقیر چیز بھی میسر نہیں آسکتی۔ اس کی ہزاروں مثالیں آپ کو اپنے چاروں طرف بکھری نظر آسکتی ہیں۔ ایک شخص ہے جو دونوں وقت قیمتی اور

لذیذ غذائیں کھاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں گیہوں کی ایک روٹی کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ لیکن دوسرا شخص ہے جو گیہوں کی ایک روٹی ہی کے لئے خون پسینہ ایک کرتا ہے اور پھر بھی بعض اوقات اُسے بھوکا سو جانا پڑتا ہے۔ آدمی غور کرے تو اللہ کے انعامات اور جود و سخا کی انتہا نہیں۔ کبھی جس کو نمونیہ ہو اُس سے پوچھئے کہ ایک سانس لینے میں اسے کس کرب و تعب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہوا کی ایک معمولی سی مقدار کو اپنے پھیپھڑوں تک پہنچانے کے لئے کتنی عظیم تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ حالانکہ یہی وہ ہوا ہے جسے تمام انسان بلا ادنیٰ مشقت کے ہر لحظہ اپنی زندگی کے کام میں لاتے ہیں اور محسوس بھی نہیں کرتے کہ ان کا ہر سانس اللہ جل شانہٗ کی عطا اور انعام ہے وہ جب چاہے اسی سانس کو انسان پر بارِ عظیم بنا سکتا ہے لہٰذا انصاف اور علم و عقل کا تقاضا یہ ہے کہ بڑی سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی چیز تک اُسی کے تصرف و اختیار میں ہو اور یہ حقیقت کسی آن نہ فراموش کی جائے کہ اشیائے ضرورت کے حصول میں دُنیاوی ذرائع اور اسباب محض بہانے کا درجہ رکھتے ہیں اصلی معطی اور بخشندہ وہی ہے۔ مالک الملک ذوالجلال والاکرام۔

توحید کی نزاکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے واضح ہوتی ہے

مَنْ صلّٰی یُرائی فقد اَشرکَ ۔ جس نے دکھاوے کیلئے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا۔

ومن صامَ یُرائی فقد اَشرکَ ۔ جس نے دکھاوے کیلئے روزہ رکھا اُس نے شرک کیا۔

ومن تصدّق یُرائی فقد اَشرکَ ۔ جس نے دکھاوے کیلئے صدقہ دیا اُس نے شرک کیا۔

جانتے ہیں آپ یہ کس کے الفاظ ہیں؟ اُس صادق و مصدوق کے جس کے لئے اللہ جل شانہٗ نے وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی فرمایا۔ جس کا ہر فرمودہ ریب و شک سے بالاتر اور عینِ صداقت ہے۔ غور کیجئے فکر و نظر کی کن گہرائیوں تک توحید کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور کس آخری درجہ تک اجتناب

عن الشرک مطلوب ہے۔ براہ راست کسی مخلوق کو صفاتِ الٰہیہ میں سے کسی صفت کے ساتھ متصف کرنا تو درکنار صرف اتنی سی بات بھی شرک قرار دی گئی کہ آدمی عبادت کرتے ہوئے دکھاوے کی نیت رکھے۔ گویا وہ اپنی عبادت کا صلہ مقبولیت و شہرت اور عقیدت و نیازمندی کی شکل میں مخلوق سے طلب کر رہا ہے۔ حالانکہ اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ مگر دل میں دکھاوے کا خیال پایا جانا ہی حکمِ شرک کے لئے کافی سمجھا گیا اور کیوں نہ سمجھا جاتا جب کہ اللہ نے شروع ہی میں یہ تعلیم بندوں کو پہنچائی کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ حصرِ جلی و صریح پر مشتمل یہ الفاظ یقیناً اس کے طالب تھے کہ شرک کے شائبہ تک کو مٹا دیا جائے اور توحیدِ خالص و حقیقی کی بنیاد پر اُمتِ اسلامیہ کی تعمیر ہو۔ سب جانتے ہیں کہ عربی میں "عبد" غلام کے معنی میں آتا ہے اور "اَمَتہ" لونڈی کے۔ یہ دونوں لفظ اسلام سے پہلے اور اس کی آمد پر اہلِ عرب میں عموماً مستعمل تھے۔ لیکن رسول اللہ ؐ فرماتے ہیں:۔

لَا یقولنّ احدکم عبدی	تم میں سے کوئی بھی ہرگز کسی کو عبدی اور اَمتی نہ
وَ اَمتی کلکم عبید اللّٰہ وکل	کہے کیونکہ تم سب اللہ کے عبد ہو اور سب عورتیں اللہ
نسائکم اماء اللّٰہ ولکن لیقل	کی باندیاں ہیں ہاں تمھیں کہنا چاہئے غلامی (میرا غلام)
غلامی وجاریتی وفتای و فتاتی	اور جاریتی (میری کنیز) اور جوان مرد اور جوان عورت

ظاہر ہے کہ اپنے معروف معنیٰ کی وجہ سے کوئی بھی عرب عبدی اور اَمتی اُن معنی میں تھیں بولتا تھا جن معنیٰ میں انسان کو اللہ کا عبد اور اَمَتہ کہا جاتا ہے۔ لیکن صدقے اِس شانِ توحید اور تنزیہِ مکمل کے کہ لفظی تشابہ بھی پسند نہیں فرمایا اور فساد و تخریب کی جڑیں کاٹ دیں۔

توحیدِ خالص کے اثبات اور شرک کے بطلان پر قرآن و حدیث سے صدہا

دلیلیں لائی جاسکتی ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارا روئے سخن اُن لوگوں کی طرف ہی جو توحید کے قائل اور شرک کو بُرا سمجھنے والے ہیں۔ اس لئے اور کچھ کہنے کی بجائے ایک حدیث پر کلام کے اس پہلو کو ختم کرتے ہیں۔ یہ حدیث ابن حبان اور حاکم اور ترمذی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ اس سے ہر مسلمان اندازہ کر سکتا ہے کہ اسلام کو صرف اتنا ہی مطلوب نہیں کہ آپ اللہ کو ایک اور خالق و مالک اور رازق و رب مان کر اُمورِ دُنیا میں غرق ہو جائیں۔ بلکہ وہاں تو اس کی تمام صفاتِ کاملہ کا اعتراف و ایقان مطلوب ہے۔ تاکہ آپ کو زندگی کے کسی بھی گوشہ سے اس کے اقتدار و تصرف کو خارج کر دینے کی گنجائش نہ ملے اور کسی بھی عنوان سے آپ اس کے سوا کسی کو بااختیار و حکمراں تصوّر نہ فرما سکیں۔ اہلِ توفیق اگر اس حدیث میں بیان کردہ اسمائے حسنہ کو حفظ کر لیں گے تو ان کے پڑھتے رہنے کی بڑی منفعت اور برکت علماء و اتقیا نے لکھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ پڑھنے کا فائدہ جبھی ہے جب معانی اور ان کے تقاضے بھی ملحوظ رہیں۔

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ علیہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ لِلّٰہِ تَعَالٰی تِسْعَةً وَّ تِسْعِیْنَ اِسْمًا مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ هُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَهَّارُ

روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں جو اُنہیں یاد کرے گا جنت میں جائیگا۔ وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی لائقِ بندگی نہیں وہ نہایت مہربان بہت رحم والا، وہ شہنشاہ ہے پاک ہے۔ ہر نقصان و زیاں سے بَری ہے، امان دینے والا پناہ میں لینے والا ہے۔ زبردست ہے، دباؤ والا ہے، صاحبِ عظمت بنانے والا، نکال کھڑا کرنے والا، صورت بنانیوالا، بہت بخشش والا، بہت غلبہ والا، بہت دینے والا

الوهّاب الرزّاق الفتّاح
العليم القابض الباسط الخافض
الرافع المعزّ المذلّ السميع
البصير الحكم العدل اللطيف
الخبير الحليم العظيم الغفور
الشكور العليّ الكبير الحفيظ
المقيت الحسيب الجليل الكريم
الرقيب المجيب الواسع الحكيم
الودود المجيد الباعث
الشهيد الحقّ الوكيل القويّ
المتين الوليّ الحميد المحصي
المبدئ المعيد المحيي
المميت الحيّ القيّوم الواجد
الماجد الواحد الاحد
الصمد القادر المقتدر
المقدّم المؤخّر الاوّل
الآخر الظاهر الباطن
الوالي المتعالي البرّ التوّاب
المنتقم العفوّ الرؤف
مالك الملك ذوالجلال
والاكرام المقسط الجامع

روزی عطا کرنے والا، فیصلہ کرنے والا، باخبر، تنگی
اور فراخی کرنے والا، پست و بلند کرنے والا، عزت
وذلت بخشنے والا، سننے والا، دیکھنے والا، اٹل فیصلہ
والا، انصاف کرنیوالا، بھید جاننے والا، خبردار،
بردبار، عظمت والا، مغفرت کرنیوالا، تھوڑے
عمل پر بہت دینے والا، بلند مرتبہ، بڑائی والا۔
حفاظت کرنیوالا، حصہ بانٹ کر دینے والا، حساب
کرنے والا، بزرگی والا، بے مانگے عطا کرنیوالا، نگران،
جواب دینے والا، وسعت والا، حکمت والا، بڑی محبت
والا، حمد وشرف والا، اٹھانے والا، گواہ، ثابت،
کارساز، زور آور، مضبوط، دوست اور مددگار،
تعریف کا مستحق، ہر چیز کا شمار رکھنے والا، عدم سے
وجود میں لانیوالا، معدوم کو پھر موجود کرنیوالا، زندہ
کرنیوالا، مارنیوالا، سدا زندہ، مخلوق کی ہستی کو
منضبط رکھنے والا، ہر کمال بالفعل رکھنے والا،
شرف والا، یکتا، یگانہ، بے نیاز، قدرت والا،
ہر شے پر قابض، آگے اور پیچھے کرنیوالا، سب سے
مقدم اور سب کے بعد باقی رہنے والا، سب پر عیاں اور
نگاہوں سے اوجھل، ہر شے کا ذمہ دار، بہت بلند،
بڑا محسن، توبہ کی توفیق بخشنے والا اور قبول کرنیوالا،
بدلہ لینے والا، معاف کرنیوالا، بڑی رحمت والا،

اَلْغَنِیُّ اَلْمُغْنِیْ اَلْمَانِعُ ساری کائنات کا مالک، جلال بخشش والا، انصاف
اَلضَّارُّ النَّافِعُ اَلنُّوْرُ کرنیوالا، جمع کرنیوالا، سب سے بے نیاز، دوسروں کو غنی
اَلْهَادِیْ اَلْبَدِیْعُ اَلْبَاقِیْ بنانیوالا، روکنے والا، نقصان پہنچانیوالا، نفع پہنچانیوالا،
اَلْوَارِثُ الرَّشِیْدُ الصَّبُوْرُ۔ خود بخود ظاہر، ہدایت دینے والا، بغیر نمونہ کے بنانیوالا،
ہمیشہ رہنے والا، تمام مخلوقات کی فنا کے بعد اُن کے مال کا مالک۔

درست راہ بتانے والا، ضبط کرنے والا۔

غور فرمائیے کہ کیا یہ کثیر اسمائے صفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے نعوذ باللہ یونہی عبث بیان فرمائے؟ کیا ان کا یہ منشاء نہیں ہے کہ کائنات میں جو بھی اسباب و نتائج اور وسائل و ثمرات نظر آتے ہیں ان سب میں اللہ ہی کی کارسازی اور قدرت کارفرما ہے۔ یہ نہیں کہ وہ مالک الملک کائنات کو تخلیق کرکے ایک طرف ہوگیا اور مخلوق کو من مانی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا نہ یہ کہ رزق حیات و موت اور اسی نہج کے چند اہم باشان اُمور تو اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھے باقی جملہ قوتیں مخلوق میں تقسیم کردیں۔ بلکہ وہ ہر زمانہ اور ہر مقام پر انسان کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں، رنج و راحت میں، کامیابی و خسران میں، ذلت و عزت میں، غربت و امارت میں پوری طرح متصرف اور کارپرداز ہے۔

بدعت توحید کی ضد اگرچہ شرک ہے، لیکن انسان کی عقل اور علم کو اتنی رسائی نہیں کہ وہ نبیِّ صادق کی توضیح و تنبیہ کے بغیر پوری طرح یہ سمجھ سکے کہ کون سے اُمور ہیں جو شرک کے تحت آتے ہیں، اور کون سے معتقدات باوجود مشرکانہ نظر نہ آنے کے فی الحقیقت مشرکانہ ہوتے ہیں "ریا" ہی کو دیکھ لیجئے یہ اپنی ظاہری شکل میں زیادہ سے زیادہ ایک ناقص اور عیب دار فعل نظر آتا ہے جس کا مرتکب اکثر حالات میں انکارِ توحید کا وہم بھی نہیں کرتا اور یہ تصور تک نہیں

کرتا کہ وہ شرک کی غلاظت سے آلودہ ہو رہا ہے لیکن زبانِ صادق و مصدوق نے اُسے متعدد بار شرک سے تعبیر کیا۔

یہی معاملہ بدعت کا بھی ہے۔ بدعت کسے کہتے ہیں، پہلے اسے سمجھ لیجیے۔ اللہ نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعہ انسان کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی نازل فرمایا اور زندگی کی کارفرمائی کے لئے جتنے گوشے ممکن ہو سکتے ہیں اُن سب کے لئے کچھ اُصول، کچھ طریقے اور کچھ قوانین مقرر فرما کر اعلان کر دیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ آج ہم نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ گویا مملکتِ عالم کے لئے جس دستورِ جاودانی کی ضرورت تھی اسے تمام و کمال اللہ جلّ شانہٗ نے انسان کو عطا کر دیا اور اس کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ قیامت تک اس میں کوئی اضافہ یا اس میں کچھ کمی کی جا سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے بالفاظِ صریح بار بار اس کی تصدیق کی:۔

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا (وفی رِوَایَۃٍ فِیْ دِیْنِنَا) ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ۔

جس شخص نے ہمارے اس امر میں (اور ایک روایت میں "فی دیننا" کے الفاظ ہیں) کوئی نئی چیز نکالی وہ ناقابلِ قبول ہے۔

دوسری جگہ کہا:۔

اِیَّاکُمْ وَ مُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ۔

خبردار! بدعت سے بچتے رہنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

ایک اور جگہ بتایا کہ دین میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے انتہائی غضب کا مستحق ہوگا۔ ایک اور جگہ بتایا کہ جب کسی جگہ ایک بدعت اختیار کی جاتی ہے تو اس کے عوض وہاں سے ایک سنت اللہ تعالیٰ اُٹھا لیتا ہے۔ گویا دوہری محرومی، ایک تو بدعت کا گناہ دوسرے سنت کی برکت سے محرومی۔

کسی کو اختیار نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی نئی عبادت، کوئی جدید طریق پرستش، کوئی خود ایجاد اصل و فرع دین میں بڑھا سکے۔ صرف اتنا اختیار دیا گیا ہے کہ جن اُمور و مسائل کے لئے وضاحت و صراحت کے ساتھ کھلے احکام بیان نہیں کئے گئے اُن میں دین کے دیگر اصول و احکام کی روشنی میں اجتہاد غور و فکر اور استنباط کرو۔ احکام کے اسباب و علل پر نظر رکھو۔ قیاس صحیحہ سے کام لو، اور جو عبادات و وظائف کسی خاص شکل میں متعین کر دیئے گئے ہیں اُن میں ہرگز تبدیلی مت کرو۔ چنانچہ اجتہاد و استنباط کی مثال تو وہ فقہ ہے جو اُمت کے علماء و ماہرین نے قرآن و حدیث کی روشنی میں مدوّن کی اور عبادات و وظائف کی مثال نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں کہ اُن کے لئے جو تعداد جو تفصیل جو اوقات جو شرح مقرر کر دی گئی ہے اُس میں تبدیلی کی سرِ مو گنجائش نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ فجر میں دو کی بجائے چار یا ظہر میں چار کی جگہ چھ فرائض پڑھے جائیں۔ روزہ کو مغرب کی بجائے عشاء کے وقت افطار کیا جائے۔ حج میں افعال کی ترتیب و کیفیت بدل دی جائے یا زکوٰۃ کی شرح میں من مانے تغیر کر دیئے جائیں۔ اب رہے وہ اُمور جو بجائے خود ممنوع و مکروہ نہ ہوں، مگر انھیں قرونِ مبارکہ میں اختیار نہ کیا گیا ہو تو کسی خاص سبب اور تقاضے کے پیش آجانے پر انھیں بطور ذریعہ و وسیلہ اختیار تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اُنھیں عبادتِ مستقلہ کی شکل دینا اور اُن پر اصرار و شدت جائز نہیں ہے۔

بدعت کی حقیقت کو سمجھنے میں سطحی فہم رکھنے والوں کو ایک اور دشواری پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ اگر ہر نئی بات بدعت ہے تو بے شمار اُمور ایسے ہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں نہیں تھے، نہ قرآن و حدیث میں اُنکی وضاحت ہے۔ لیکن بعد کے مسلمان اُنھیں اختیار کئے ہوئے ہیں اور تمام علماءِ اسلام اُنکی

علت بلکہ ضرورت واہمیت پرمتفق ہیں۔ مثلاً دینی کتابیں لکھ کر چھاپنا اور فروخت کرنا، مدرسے بنا کر اُن میں مہتمم اور تنخواہ دار مبلغین رکھنا۔ انجمنیں بنانا، دفاتر کھولنا وغیرذالک۔

یہ اشتباہ فی الحقیقت دین اور احکام دین کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ ایسا دستور کوئی ہو ہی نہیں سکتا جس میں تمام ممکن جزئیات بیان کردی گئی ہوں، دستور تو اصول وکلیات سے بحث کرتا ہے اور مطلوب وغیر مطلوب افعال وعقائد کی تشریح بیان کردیتا ہے۔ اب یہ عوام الناس کا کام ہے کہ اپنے افعال وعقائد کو اس کی روشنی میں جانچیں اور اُن مقاصد کو پورا کریں جن کا دستور طالب ہے۔ قرآن و حدیث نے علم کی اشاعت کا حکم جاری کیا۔ اب یہ انسانوں کا کام ہے کہ ہر دور کے وسائل وذرائع کے مطابق اس حکم کی تعمیل کریں اور بہتر سے بہتر انتظام کے ذریعہ مقصدِ اشاعت کو پورا کئے جائیں۔ کتابیں چھاپنا تو ایک طرف اگر ریڈیو یا کسی اور ایجاد کو اس مقصد کا ذریعہ بنائیں گے تب بھی کوئی خرابی واقع نہ ہوگی کیونکہ ان وسائل واسباب کی حیثیت نہ ایجاد فی الدین کی ہے نہ بجائے خود یہ عبادت ہیں۔ بلکہ ان کو اختیار کرنا ایک مقصدِ نیک کے حصول کی خاطر ہے جس کی پاکیزگی وخوبی قرآن وحدیث نے صراحتہً بیان کی ہے۔ حضور نے فرمایا۔ بلّغوا عنی ولو آیۃ دوسروں تک پہنچاؤ خواہ میری ذرا سی بات ہی ہو۔ اب ایک شخص کو اختیار ہے کہ لوگوں کو حدیث سنانے اونٹ پر بیٹھ کر جائے یا ریل پر فرش پر بیٹھ کر سنائے یا تخت پر۔ کوئی بھی ایسا طریقہ جس میں دین کے کسی اور حکم کی نافرمانی نہ ہوتی ہو اس کے لئے جائز ہوگا اور بدعت نہ کہلائے گا۔

ان تمہیدی سطور کے بعد اب سمجھئے کہ بدعت توحید کی ضد کیسے ہے۔ بہت سیدھی سی بات ہے کہ قانون بنانا ہر کس وناکس کا کام نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ اہل ملک

کچھ متعین لوگوں کو اس کام پر لگاتے ہیں یا غیر جمہوری نظاموں میں تنہا بادشاہ یا بادشاہ اور وزیر وغیرہ قانون بناتے اور نافذ کرتے ہیں۔ ملک بھر میں ہرگز کوئی اس کا مجاز نہیں ہوتا کہ اپنی طرف سے کوئی قانون نکالے۔ دین کے بارے میں جب ہم نے یہ مان لیا کہ وہ اللہ کا ایک مکمل دستور ہے اور کائنات کا خالق و مالک اور مختار کل ہونے کے باعث اللہ ہی اس کا مستحق بھی ہے کہ دستور بنائے اور حدود مقرر کرے تو یہ بات آپ سے آپ طے ہو جاتی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو قانون کی ایک بھی نئی دفعہ تراشنے کا اختیار نہیں ہا اور جو شخص ایسا کرے گا وہ گویا خود کو بھی کسی نہ کسی درجہ میں خدائی قوت و اقتدار کا شریک سمجھے گا، اسی کا نام شرک ہے۔

دوسرے پہلو سے یہ شرک کفر تک بھی پہنچتا ہے اور وہ یوں کہ دین میں دو ہی طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک تو وہ جو اللہ سے قربت حاصل کرنے اور اس کی رضا اور انعام پانے کا ذریعہ ہیں۔ دوسری وہ جو اس سے دور ہونے اور اس کا قہر و عتاب حاصل کرنے کا سبب ہیں۔ انسان کے پاس تو ایسی عقل و بصیرت تھی نہیں کہ وہ ہزار پردے میں نہاں ذوالجلال والاکرام کی مرضیات کو پا سکتا، وہ ہرگز نہیں جان سکتا تھا کہ رب اکبر کن اعمال و عقائد اور کن طریقوں سے خوش یا ناراض ہو سکتا ہے اور کن افعال پر انعام اور کن افعال پر عذاب دے سکتا ہے۔ اس علم و خبر کا واحد ذریعہ وہی دین ہے جسے اللہ جل شانہ نے اپنے نبی صادق کے ذریعہ انسانوں تک پہنچایا۔ اس دین میں وہ تمام طریقے اور اصول کھول کر بیان کر دیئے گئے جن سے اللہ خوش یا ناراض ہوتا ہے۔ کوئی کسر اس میں نہیں چھوڑی گئی اور ظاہر ہے کہ اللہ کے کام میں کسر کا کیا امکان۔ تب کوئی شخص اگر بالکل نیا کام نکالتا ہے۔ جس کیلئے دین

میں کوئی حکم نہیں دیا گیا اور سمجھتا ہے کہ اس سے اللہ کا تقرب اور ثواب آخرت حاصل ہوگا تو گویا وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ کا دین ناقص ہے جس میں حصولِ تقرب کا یہ طریقہ بیان نہیں کیا گیا۔ نیز وہ یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ نعوذ باللہ خود اللہ کو وہ طریقے معلوم نہ تھے جو اسے خوش کرنے کے ہو سکتے ہیں۔ جبھی تو اُس نے میرے اس نو ایجاد طریقے کو بیان نہیں کیا وہ اسکا بھی مدعی ہے کہ خدا کا آخری اور سب سے افضل رسولؐ بھی حصولِ تقرب اور وصولِ ثواب کا وہ طریقہ نہیں پا سکا جسے میں نے پا لیا ہے۔ ونعوذ باللہ من ذلک۔

حق یہ ہے کہ اعمالِ خیر سے ثواب کا حاصل ہونا کوئی حسابی یا سائنسی فارمولا نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ جس طرح دو اور دو لازماً چار ہوں گے یا جس طرح پانی آنچ پا کر لازماً بھاپ بن جائے گا۔ اسی طرح انسان عملِ خیر کر کے لازماً ثواب حاصل کر لے گا۔ بلکہ قرآن و حدیث اس پر شاہد اور صلحاء و اتقیا کا قول و عمل اس پر گواہ ہے کہ اعمالِ خیر تو صرف تعمیلِ حکمِ الٰہی کے درجہ میں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اُن کی حیثیت اُن الطاف و کرم پر شکریہ کی سی ہے جو اللہ جل شانہٗ نے انسان پر بطور احسان کر رکھے ہیں۔ جن اُخروی انعامات کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اعمالِ خیر پر فرمایا ہے وہ انسان کو تب ہی ملیں گے جب اس کے اعمالِ خیر اللہ کے یہاں مقبول بھی ہو جائیں۔ نامقبول ہوں تو ہزار سال کی عبادتیں بھی بے کار اور فضول ہیں۔

اب غور یہ کرنا چاہیئے کہ کونسا طریقہ ہے جسے اختیار کر کے یہ اُمید ہو سکتی ہے کہ اللہ ہمارے اعمال مقبول فرمائے گا۔ واحد جواب یہی ملے گا کہ خود کو سراپا بندۂ حکم بنا لینا اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کو مضبوطی

سے پکڑنا اور اس کے فرامین کو بغیر کمی بیشی کے قولاً اور عملاً تسلیم کر لینا مقبولیت کی اُمید دلا سکتا ہے۔ اپنا کوئی نیا طرزِ عبادت نکال کر یہ ثابت کرنا کہ اللہ کی بتائی ہوئی عبادتیں کافی نہیں ہیں۔ اللہ کے قہر و غضب کو بھڑکانے کا باعث ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ غلو فی الدین خواہ وہ دین میں افراط کے ذریعہ ہو یا تفریط کے، بے حد ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يَآ أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ۔ — اے کتاب والو! اپنے دین میں غلو مت کرو۔

رسول اللہؐ نے تین بار فرمایا:۔

هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ۔ — حد سے بڑھنے اور غلو کرنے والے ہلاک ہوئے۔

ایک اور موقع پر فرمایا:۔

إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قبلكم الغلوّ۔ — خبردار! غلو سے بچے رہنا۔ تم سے پہلے بہت سوں کو غلو نے برباد کیا۔

بدعت خواہ اس معنی میں ہو کہ حصولِ ثواب کے نئے طریقے ایجاد کئے جائیں جنھیں نہ اللہ اور رسولؐ نے بتایا نہ اصحابؓ نے اختیار کیا یا اس معنی میں ہو کہ اللہ اور رسولؐ نے اعمال و اعتقاد کی جو حدیں اور صورتیں متعین کر دی ہیں اُن میں آدمی خواہ مخواہ باریکیاں اور نکتے نکالے یا جن احکام، اشیاء، اور بندگانِ ذی مرتبہ کے جو مراتب، جو مقامات، جو درجات متعین فرما دیئے ہیں اُن میں اضافے کرتا چلا جائے۔ دونوں ہی صورتیں بربادی و خسران کی ہیں۔

اب میں آگے بڑھنے سے پہلے ناظرین کی خدمت میں چند معروضات پیش کروں گا۔ اگر آپ بعض ایسے اعمال و عقائد کے حامل ہیں جو میرے سابقہ اور آنیوالے

بیان کی روشنی میں بدعت ٹھیرتے ہیں تو آپ مکدر اور ناراض نہ ہوں' بلکہ انصاف کے ساتھ یہ غور فرمائیں کہ دین نہ میری جائداد ہے نہ آپ کی۔ دین میں کسی اضافہ یا کمی کا نہ مجھے اختیار ہے نہ آپ کو ــــ یہ بھول جائیے کہ میں اُس دیوبند کا رہنے والا ہوں جہاں کے علماء بہت سی رسوم رائجہ کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی نظرانداز کر دیجئے کہ وہابی یا اہلِ تقلید یا غیر مقلد وغیرہ کے کیا جھگڑے ہیں ــــ صرف یہ دیکھئے کہ دین تو قرآن و سنت کا نام ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور قرآن وسنت سے علم وعقل کی روشنی میں جو احکام واصول نکلتے ہیں وہی ایک مسلمان کے لئے واجب القبول ہیں اور جو طریقے اور رسمیں رائج ہیں وہ جس حد تک قرآن وسنت کے خلاف ہوں اُسی حد تک ترک واحتراز کے لائق ہیں۔ محض یہ بات کہ بعض طریقے نہ صرف عوام بلکہ بعض خواص میں بھی رائج ومقبول ہو گئے ہیں اور اُن کی ابتداء کرنے والوں میں بعض بڑے بڑے نیک عمل لوگ شامل ہیں' اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ اسے دین سمجھ لیا جائے۔ بلکہ دین وہی ہے جس کی تائید قرآن وسنت سے ہو اور کوئی دینی اصول اس سے ٹوٹتا نہ ہو۔ میں مناظرے کے طور پر نہیں' بلکہ خالص افہام وتفہیم کے طور پر بعض خلافِ دین اُمور کا ذکر کروں گا' جنھیں کچھ مسلمانوں نے جزوِ دین بنا لیا ہے اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ میری بات کو رد کر دینا اور اپنے عقیدے پر اَڑے رہنا میری دُنیا وآخرت کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں' بلکہ اگر میری بات فی الواقع صحیح ہے تو نقصان ضد کرنے والے ہی کا ہوگا۔ میں تو بڑے ادب اور عجز کے ساتھ اُس اللہ کی آیات اور اُس صادق ومصدوق سرورِ کونین محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جنھیں آپ واجب الاطاعت تسلیم کرتے ہیں۔ آپ خالی الذہن ہو کر خلوص' ایمانداری اور بُردباری کے ساتھ

غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ جن اعمال و عقائد پر آپ والہ و شیدا ہیں، اُن میں کسی طرح کا سقم و نقص تو نہیں ہے۔ وہ رضائے الٰہی کی بجائے عتاب الٰہی کے تو سزاوار نہیں ہیں۔ پھر یہ بھی یقین فرمائیے کہ یہ گذارش میں اپنی طرف سے نہیں کر رہا۔ بلکہ خود حضور علیہ التحیات والتسلیم نے فرمایا ہے:۔

فانہ من یعش منکم فسیریٰ اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا وعضوا علیہ بالنواجذ وایاکم و محدثات الامور فان کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔	تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ کثیر اختلافات دیکھے گا پس ایسی حالت میں تمھیں چاہئے کہ میری سنّت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنّت کا سہارا لو اور اُسے دانتوں سے پکڑ لو اور خبردار نئے نئے کاموں سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانا جہنّم ہے

+ + + + +

کیا آج کے دور میں اختلافات کا کچھ شمار رہ گیا ہے؟ کیا ٹھیک یہی دور نہیں جب حضورؐ کے اس فرمان کی تعمیل کی جائے؟

صحابہؓ کا طرزِ عمل

یہ بات ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جن بدعتوں سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے روکا ہے وہ ایسی نہیں ہوں گی جن پر احکام ظاہری کے لحاظ سے ہر شخص ممنوع و منکر ہونے کا فتویٰ لگا سکے۔ ممنوعات و منکرات کی توضیح تو اللہ اور اس کے رسولؐ نے متعدد مقامات پر کر دی۔ بلکہ بدعت سے مراد وہی اُمور ہو سکتے ہیں جو بظاہر باعتبارِ شکل و شباہت دینی اُمور معلوم ہوتے ہوں لیکن دین میں اُن کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ ایسے ہی اُمور انسان داخلِ دین کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور ایسے ہی اُمور سے حصولِ ثواب

کی غلط توقع وابستہ کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس حقیقت کو خوب سمجھا اور ایسی احتیاط برتی کہ حق ادا کر دیا۔ نمونے ملاحظہ ہوں:-

نمازِ فجر و عصر کے بعد امام کے داہنے یا بائیں مڑ کر کچھ دیر بیٹھنا امرِ معروف ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے بروایاتِ صحیحہ اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اب عبداللہ ابنِ مسعودؓ جیسے صحابیٔ جلیل کو دیکھئے۔ فرماتے ہیں:-

لا یجعل احدکم للشیطان شیئاً مِنْ صلوٰته یریٰ ان حقاً علیه ان لا ینصرف الا عن یمینه لقد رآیتُ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کثیراً ینصرف عن یساره۔ (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم)

تم میں سے کوئی شخص شیطان کو اپنی نماز میں حصہ دار نہ بنائے بایں طور کہ وہ صرف داہنی طرف مڑنے کی پابندی کرے۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بارہا بائیں جانب مڑتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

مشہور حنفی عالم ملا علی قاری اپنی شرح میں اس کے تحت لکھتے ہیں:-

مَنْ اصرَّ علی امرٍ مندوبٍ وَ جَعَلَهٗ عزماً ولم یعمل بالرخصة فقد اصاب منه الشیطان من الاضلال فکیف من اصرَّ علی بدعةٍ ومنکرةٍ (مرقات)

جس نے کسی امرِ مستحب پر اصرار کیا اور مضبوطی سے اس پر جما اور رخصت پر عمل نہیں کیا۔ پس یقیناً اس ذریعے سے شیطان نے گمراہ کرنے پہنچ گیا۔ پس جب امرِ مستحب کا یہ حال ہو تو (اس شخص کا کیا حال ہوگا جو بدعت یا منکر پر اصرار کرے۔

\+ + + + +

آپ اگر یہ کہیں کہ ملا علی قاری کی بات ہم نہیں مانتے تو بے شک آپ یہ کہہ سکتے ہیں، مگر فقیہ الامت ابنِ مسعودؓ کے بارے میں تو آپ ایسا نہیں کہہ سکتے۔ خود اُن کا یہ قول بتا رہا ہے کہ جو فعل بجائے خود مستحب ہو لیکن رسول اللہ ﷺ نے

اُس کی پابندی نہ کی ہو، اسے بھی پابندی کے ساتھ کرنا گویا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس فعل کو ضروری سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دین میں جس چیز کو جو درجہ دیا گیا ہے اُسے اس سے زیادہ درجہ دینا بھی اسی طرح بُرا ہے جس طرح کم درجہ دینا۔ پھر اس میں یہ بھی غور کیجئے کہ نیت اور عقیدے کا ذکر ابن مسعودؓ نے نہیں کیا۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ داہنی طرف مڑنے کو عقیدتاً ضروری سمجھنے والا اور دوسروں کو اس عقیدے کی تعلیم دینے والا گمراہ ہے۔ ایسے شخص کو تو کافر کہا جاتا کیونکہ وہ گویا بائیں طرف مڑنے کو گناہ ٹھیرا رہا ہے اور بائیں طرف مڑنا آنحضورؐ سے ثابت ہے۔ لہذا نعوذ باللہ اُس نے حضورؐ کو بھی گناہگار ٹھیرایا۔ ایسا نہیں بلکہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ نے مجرد اس طرزِ عمل ہی کو شیطنت ٹھیرایا ہے کہ امام ہمیشہ داہنی طرف مُڑا کرے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ کوئی بھی ایسا کام نکالنا جو عوام کے نزدیک تقرب الی اللہ اور ثواب کا ذریعہ ٹھیرے۔ حالانکہ قرآن و سنت سے اس کا اشارۃً بھی حکم نہ ملا ہو قطعاً بدعت ہے، خواہ نکالنے والے کی نیت اسے ضروری قرار دینے کی نہ ہو۔

یہی ابن مسعودؓ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ایک بار اپنے بعض شاگردوں کو دیکھا کہ ذکر و عبادت کے لئے ایک جگہ مقرر کر کے جمع ہوتے ہیں تو غصہ فرمایا اور تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اے لوگو! کیا تم رسول اللہؐ کے اصحاب سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ ہو؟ یا گمراہی کی طرف دَوڑ رہے ہو۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں تو مَیں نے اس طرح کا ذکر نہیں دیکھا پھر تم لوگ کیوں یہ نیا طریقہ نکال رہے ہو؟ — نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلہ رُک گیا۔ غور کا مقام ہے۔ ذکر الٰہی جیسا مقدس فعل لیکن ابن مسعودؓ جیسا عظیم الشان صحابی اس پر خفا ہے۔ صرف اس لئے کہ دین کے رنگ میں رنگی ہوئی مصفا ترین بصیرت خوب دیکھتی ہے کہ جو طریقے ابتداء میں نہایت

خلوص و للّٰہیت سے نکالے جاتے ہیں وہی کچھ عرصہ بعد کیا سے کیا بن جاتے ہیں اور وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ شیطان اللہ کے مومن بندوں کو نبیؐ کی سنت اور اللہ کے فرائض سے دُور لیجانے کے لئے کیسے کیسے خوبصورت حربے استعمال کرتا ہے وہ جن لوگوں کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ دُنیاوی متاع کی چمک دمک پر مائل ہونے والے نہیں، اُن کے لئے دین ہی کی نوعیت اور رنگ کے جال بُنتا ہے۔ دام ہمرنگ زمین بچھاتا ہے اور بہت کم اللہ کے بندے اس کے کید سے بچ پاتے ہیں۔ ابن مسعودؓ کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی کہ ذکر اللہ کے لئے ایسی اجتماعی شکلیں اختیار کی جائیں جن کی تعلیم عملاً یا قولاً رسول اللہؐ نے نہیں دی۔

ترمذی میں حضرت نافعؒ سے روایت ہے کہ:۔

ان رجلاً عطس الیٰ جنب ابن عمر قال الحمد للّٰہ والسلام علیٰ رسول اللّٰہ قال ابن عمر انا اقول الحمد للّٰہ والسلام علیٰ رسول اللّٰہ ولیس ھٰکذا علمنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علمنا ان نقول الحمد للّٰہ علیٰ کل حالٍ (مشکوٰۃ)

ایک شخص عبداللہ ابن عمرؓ کے پہلو میں ٹھہرا ہوئے چھینکا اور کہنے لگا "الحمدللہ والسلام علیٰ رسول اللہؐ"۔ ابن عمرؓ نے فرمایا یہ بات تو میں بھی کہتا ہوں۔ لیکن رسول اللہ نے ہمیں اس طرح نہیں سکھایا ہے، بلکہ یوں سکھایا کہ ہر حال میں الحمدللہ کہیں۔

+ + + + +

+ + + + +

اندازہ کیجئے کہ "والسلام علیٰ رسول اللہ" جیسا پاکیزہ جملہ لیکن ابن عمرؓ نے اسے بھی پسند نہیں کیا، کیوں؟ صرف اس لئے کہ چھینک کے بعد صرف "الحمدللہ" کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور اسی پر اکتفا کرنا دین کا تقاضا ہے۔ اس تقاضے کو آپ نے رسول اللہؐ ہی سے سمجھا تھا اور یہ بات انکی نظر میں

تھی کہ جس جگہ رسول اللہؐ نے لفظ "نبی" استعمال فرمایا ہو وہاں کسی کو "رسول" کہنے کا بھی اختیار نہیں۔

ہو سکتا ہے کوئی یوں کہے کہ اس حدیث کے بعد صاحب مشکوٰۃ نے "ھذا حدیث غریب" لکھا ہے اور صاحب مشکوٰۃ جب ایسا لکھتے ہیں تو بقول شیخ محدث دہلویؒ اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس حدیث میں کسی طرح کا طعن ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ فی الحقیقت صاحب مشکوٰۃ کے نہیں ہیں، بلکہ خود ترمذی کے ہیں اور ہر صاحب علم کو معلوم ہے کہ ترمذی ان الفاظ کو صاحب مشکوٰۃ کے معنی میں استعمال نہیں کرتے، بلکہ بارہا صحیح حدیث کے بارے میں بھی وہ فنی نقطۂ نظر سے ایسا کہہ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث کو غریب اس وجہ سے کہا کہ اس کے رُواۃ میں ایک راوی زیاد بن ربیع منفرد ہیں۔ لہٰذا اصطلاحاً اس پر "غرابت" کا اطلاق ہوا۔ ورنہ یہ راوی ہر لحاظ سے معتبر اور بخاری کے رُواۃ میں سے ہیں اور حدیث صحیح ہے۔

حضرت عمرؓ کا یہ عمل کسے معلوم نہیں کہ آپ نے اُس درخت کو کٹوا ڈالا تھا جس کے نیچے رسول اللہؐ نے بیعت لی تھی اور جس کی زیارت کرنے لوگ آنے لگے تھے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس درخت کا وجود عوام الناس میں بدعت و شرک پیدا کرے گا۔ پھر یہ بھی حضرت عمرؓ ہی کا واقعہ ہے کہ سفرِ حج سے لوٹتے ہوئے جب راہ میں ایک ایسی مسجد پڑی جس میں رسول اللہؐ نے نماز ادا فرمائی تھی تو لوگ اُس کی طرف دوڑے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اے لوگو! اہلِ کتاب انہی باتوں کی وجہ سے برباد ہوئے کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی یادگاروں کو عبادت گاہ بنا ڈالا۔"

اللہ اکبر! نگاہِ عمرؓ کتنی دور دیکھ رہی تھی —! آپ آج اپنی آنکھوں سے

بصیرتِ عمرؓ کا نظارہ فرمالیں، نبی تو بڑی چیز ہے۔ نبی کی خاکِ پا جیسے بزرگوں کی قبروں اور درگاہوں کا حال دیکھئے۔ جہلا ہی نہیں پڑھے لکھے بھی آپکو ملیں گے کہ خاک کے تودوں پہ سرِ نیاز خم کئے ہوئے ہیں اور جس فرقِ مقدس کے آگے کبھی فرشتوں نے سجدہ گذرانا تھا وہی فرقِ مقدس مٹی کے ڈھیروں کے آگے جھکا ہوا ہے۔ صحابہؓ جیسے عظیم مومن و مسلم اور رسول اللہؐ جیسے رسولِ اکرم کی محبت وعقیدت، لیکن پھر بھی حضرت عمرؓ نے ایک تہہ نشین خطرے اور فتنے کو اس فعلِ حَسَن کی گہرائیوں میں دیکھ لیا وہ فاروقؓ تھے — فارقِ حق و باطل — انہی کے لئے زبانِ صادق و مصدوقؐ نے کہا تھا کہ لو کان بعدی نبی لکان عمر (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوسکتا تو عمرؓ ہوتا) رضی اللہ عنہ۔

بدعت اور ایجاد فی الدین سے جلیل القدر صحابہ کتنے مجتنب تھے اس کے لئے متعین مثالوں کی احتیاج نہیں ان کی پوری سیرت ہی مجسم مثال ہے۔ ہاں ایک شبہ سطحی ذہن کو یہاں پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر مستحب امور پر اصرار اور دوام قابلِ اعتراض ہوسکتا ہے تو سنن کی متواتر تعمیل اور پابندی بھی ممنوع ہونی چاہئے کیونکہ بہرحال سنن فرض و واجب سے کم مرتبہ رکھتی ہیں۔ یہ شبہ اگر خلوصِ نیت کے ساتھ پیدا ہو اور اس کی تہ میں کوئی خاص مقصد پوشیدہ نہ ہو تو اس کا ازالہ بہت آسان ہے۔ جس فعل و عمل کے بارے میں یہ طے ہوگیا کہ وہ سنت ہے — یعنی حضورؐ کی طرف اس کی نسبت علمی حیثیت سے مسلم ہے اس کی پابندی میں اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بشرطیکہ اس پابندی سے حضورؐ کے کسی دوسرے قول و فعل کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔ قرآن و حدیث دونوں نے سنتِ رسول اور اسوۂ رسول کی اتباع کا حکم اصرار و تکرار کے ساتھ دیا ہے۔ البتہ امتِ مسلمہ کی آسانی اور انسانوں کی قوت و استعداد کے باہمی فرق اور دیگر مصالح کی بنا پر یہ ضروری تھا کہ علماء و فقہاء مختلف

اعمال وافعال کے مراتب ودرجات متعین کرتے تاکہ ہر عام وخاص پر واضح ہو جاتے کہ کونسے اعمال کس درجہ میں ضروری ہیں اور کس عمل کا کتنا ثواب یا عقاب ہے اگر اصطلاحوں کے ذریعہ فرقِ مراتب نہ کیا جاتا' بلکہ تمام ہی سُنن و مستحبات اور فرائض و واجبات کو ایک ہی درجہ میں لازم وضروری قرار دیدیا جاتا تو امت عظیم فتنے میں مبتلا ہو جاتی پس خود شارع کی دی ہوئی گنجائشوں اور عقلِ سلیم کے تقاضوں کے تحت اعمال کے درجے مقرر کئے گئے تاکہ عوام مطمئن ہو جائیں کہ مسلمان بننے کے لئے فرائض و واجبات کا بار ان کی طاقت سے باہر نہیں ہے' بلکہ آسانی سے قابلِ برداشت ہے اب جو لوگ صاحبِ عزم وہمت ہوں وہ خوشی سے سنن کی بھی پابندی کر سکتے ہیں اور یہ بداہتہً لائقِ تعریف فعل ہوگا۔ بلکہ ضابطے کے مسلمانوں کی صف سے اگلی صف میں آدمی سنن ہی کی مستقل پیروی سے پہنچتا ہے۔

اور اگر یہ شبہ محض مناظرانہ ذہنیت اور ضد کا پیدا کردہ ہے تو بہر حال اشتباہ واعتراض کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہو سکتا۔

قبر پرستی

قرآن وسنت کے صریح احکام کے بالکل برعکس رواج پا جانیوالی بدعات میں غالباً سب سے بدتر لیکن سب سے عام بدعت قبر پرستی ہے جو کافی مقبول ہو چکی ہے اور جس کی بہت سی صورتیں شرکِ جلی میں داخل ہیں۔

ہمارے سامنے آج تک ایک بھی دلیل ایسی نہیں آئی جس سے معلوم ہو سکتا کہ مروجہ قبر پرستی قرآن یا حدیث کے کس حکم یا اصول کے تحت اختیار کی گئی ہے۔ ہمیں تو غور وفکر اور مطالعے کے بعد یہی اندازہ ہوا کہ قبر پرستی کی تمام تر عمارت محض جہل' نادانی' نفس پرستی اور اندھی تقلید پر کھڑی ہوئی ہے۔ آپ کے غور وفکر کے لئے چند نصوص پیش خدمت ہیں:-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' قبروں پر مت

لاتجلسوعلی القبور ولاتصلوا الیھا بیٹھو اور ان کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھو۔

اگر کسی کو اس سے یہ غلط فہمی ہو کہ یہاں تو قبر پر چڑھ کے بیٹھنے کو منع کیا گیا ہے تو یہ درست نہیں ہے۔ کبھی اور کہیں بھی ایسا نہیں دیکھا یا سنا گیا کہ لوگ قبروں پر چڑھ کے بیٹھتے ہوں۔ لہذا حضورؐ کے حکم کو اس معنی میں لینا گویا رسول اللہؐ پر یہ الزام رکھنا ہے کہ آپؐ عبث باتیں بھی فرمایا کرتے تھے (نعوذ باللہ) ظاہر ہے کہ منع اُسی چیز کو کیا جاتا ہے جو زیر عمل آتی ہو۔ زیر عمل یہی چیز آتی رہی ہے کہ لوگ قبروں کے پاس بیٹھتے اور اس بیٹھنے کو متبرک سمجھتے رہے ہیں۔ باقاعدہ درگاہیں بنی ہیں اور وہاں نیاز مندیوں کے مختلف پیرائے اختیار کئے گئے ہیں۔ اسی سے حضورؐ نے منع فرمایا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ لوگ حضرت آدمؑ اور حضرت یوسفؑ کو سجدے کئے جانے کی دلیل سے قبروں کو اور غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا جواز لاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہؐ نے سجدہ کرنا تو درکنار قبروں کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے تک کو منع فرمایا کہ اس میں اشتباہ کا اندیشہ ہے اور قبر کو سجدہ کرنے کا ایہام ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی نہ کہا جائے کہ نماز تو چونکہ قبلہ رُخ ہو کر پڑھنی چاہئے اس لئے قبر کی طرف نماز پڑھنے کو منع فرمایا۔ یہ حکم رسول بلاشبہ اُسی صورت میں ہے جب کہ قبر قبلہ کیطرف واقع ہو رہی ہو، ورنہ کون دیوانہ مسلمان ہوگا جو قبلہ کے سوا کسی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا۔

مسلم اور ترمذی میں ہے:۔

قال علی رضی اللہ عنہ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالاً الا طمستہ ولا قبراً مشرفاً الا سویتہ۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کیا میں تمھیں اُس مہم پر نہ بھیجوں جس پر رسول اللہؐ نے مجھے بھیجا تھا۔ یہ کہ تم کسی مجسمہ کو مٹائے بغیر نہ رہو اور کسی اونچی قبر کو برابر کئے بغیر نہ چھوڑو۔

یہ میں نہیں کہہ رہا امام الاتقیاء خلیفہ چہارم رسول اللہؐ کے داماد حضرت علیؓ فرما رہے ہیں ۔ بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے :-

لما نزل برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طفق یطرح خمیصۃ لہ علی وجہہ واذا غتم کشفہا عن وجہہ فقال وھو کذالک "لعنۃ اللہ علی الیہود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد" یحذر ما صنعوا ولولا ذالک ابرز قبرہ غیر انہ خشی ان یتخذ مسجداً -

جب جانکنی کا عالم رسول اللہؐ پر طاری ہوا تو آپ نے چہرے پر چادر کھینچ لی۔ جب سانس گھٹتا چادر ہٹا دیتے اسی عالم میں فرمایا "یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادتگاہ بنا لیا" ایسا کہکر آپ امت کو اس طرح کی حرکتوں سے ڈرا رہے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو خود رسول اللہؐ کی قبر شریف بھی کھلی رکھی جاتی لیکن اسی خوف سے کہ اسے عبادتگاہ بنا لیا جائیگا بند رکھا ۔

اندازہ کیجئے۔ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے رسول اللہؐ کو کتنی نفرت و کراہت تھی۔ بہت ہی کم آپؐ کسی کے لئے "لعنت اللہ" کہا کرتے تھے۔ لیکن اس فعل کے کرنے والوں پر حضورؐ عالم جانکنی میں کس دلسوزی سے لعنت بھیج رہے ہیں۔ پھر انبیاء کی قبور کا جب یہ معاملہ ہو تو اُن لوگوں پر کس قدر لعنت برسے گی جو انبیاء سے بہت کم درجہ بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنائے ہوتے ہیں۔

ذرا ملاحظہ کیجئے۔ غیر انبیاء کی قبروں کا ذکر بھی حدیث رسولؐ میں ملتا ہے بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبش کے دو ایسے گرجاؤں کا ذکر رسول اللہ کے حضور کیا جس میں انھوں نے تصاویر دیکھی تھیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا :-

ان اولئک اذا کان فیھم الرجل

ان لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب ان میں کوئی

الصالح فمات بنوا علی قبرہ مسجداً وصوّروا فیہ تلک الصور اولئک شرار الخلق عند اللہ یوم القیامۃ

مرد صالح مر جاتا ہے تو اسکی قبر کو سجدہ گاہ بنالیتے ہیں اور صالحین کی تصویریں نقش کر لیتے ہیں یہی لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوں گے

دیکھا آپ نے۔ آج کی درگاہ سازی و قبر نوازی سے کتنی مطابقت رکھتی ہے یہ حدیث؟ اور سنئے "موطا امام مالک" کی روایت ہے:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللھم لا تجعل قبری وثناً یعبد اشتد غضب اللہ علی قومٍ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا دینا جسے پوجا جائے۔ اللہ کا سخت غضب آئے اس قوم پر جو اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالے۔

مسلم کی ایک اور روایت ملاحظہ کیجئے۔ قول رسول ہے:۔

ألا وانّ من کان من قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیائھم وصالحیھم مساجد۔ ألا فلا تتخذوا القبور مساجد انی انھاکم عن ذلک۔

خبردار ہو۔ تم سے پہلے لوگوں نے اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا تھا۔ خبردار تم ہرگز قبروں کو عبادت گاہ نہ بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔

\+ + + + +

روکنے اور منع کرنے کا وہ کونسا صریح اسلوب ہے جو اس سلسلہ میں حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار نہیں فرمایا۔ تنبیہ وتنذیر کے جو واضح ترین الفاظ تھے بار بار استعمال کئے۔ پھر بھی اگر مسلمان اس پر توجہ نہ کرے تو سوچئے روح پاک پر کیا گذرے گی اور آخرت میں کھلے نافرمان مسلمان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ اور لیجئے۔ مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، موطا امام احمد بھی میں یہ روایت ہے کہ:۔

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبر وان یقعد علیہ وان یبنیٰ علیہ۔

منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو گچ کرنے (چونے کنکریٹ وغیرہ سے پختہ کرنے) سے اور اس پر بیٹھنے سے اور اس پر عمارت بنانے سے۔

+ + + +

اور دیکھئے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے:۔

ان من شرار الناس من تدرکھم الساعۃ وھم احیاء والذین یتخذون القبور مساجد۔

بدترین ہیں وہ لوگ جن کی زندگی میں قیامت برپا ہوگی اور بدترین ہیں وہ لوگ جو قبروں کو سجدیں بنالیں گے۔

اور ملاحظہ کیجئے۔ ابن ماجہ، ترمذی، نسائی اور ابوداؤد کی روایت ہے:۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات القبور والمتخذین علیھا المساجد والسرج۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لعنت بھیجی رسول اللہ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور ان پر بھی جو قبروں کو سجدیں بنالیتے ہیں اور انپر چراغ جلاتے ہیں۔

گویا عورتوں کے لئے نفس زیارت ہی قابل لعنت ہے خواہ وہ وہاں کوئی مشرکانہ فعل کریں یا نہ کریں۔ یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ محولہ بالا روایتوں میں "مسجد" سے مراد گنبدوں اور میناروں والی اصطلاحی مسجد ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ قبروں کو ایسی جگہ نہ بنالو جہاں عبادت کی قسم سے کوئی عمل کیا جائے یا میلہ لگایا جائے۔ چنانچہ یہ تشریح حضورؐ ہی کے قول سے ثابت ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

جعلت لی الارض مسجداً وطھوراً میرے لئے تمام روئے زمین مسجد اور پاک بنادی گئی۔

ظاہر ہے کہ مسجد سے مراد یہی ہے کہ جہاں چاہوں اللہ کی عبادت کرلوں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ مسجد نام کی خاص عمارت ہی میں عبادت ہو سکے۔ گھر، جنگل، ریگستان، ہر جگہ نماز اور ہر عبادت ادا ہو سکتی ہے اور فرمایا:۔

لا تجعلوا قبری عیدا۔

میری قبر کو میلہ گاہ نہ بنانا۔

کفارِ عرب کے کئی بتوں مثلاً ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کے بارے میں تو بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ تشریح منقول ہے کہ یہ سب قومِ نوح کے نیک لوگ تھے جنھیں بعد میں بُت بنا کر پوجا گیا۔ مشہور بُت لات کے بارے میں ابنِ جریر نے مجاہد جیسے جلیل القدر عالم و فقیہ کی روایت بیان کی ہے کہ یہ ایک شخص تھا جو لوگوں کو ستو گھول کر پلایا کرتا تھا۔ گویا پہلے ہی سے اہلِ کفر میں نیک لوگوں کو اُن کی موت کے بعد پوجنے کی بیماری چلی آ رہی ہے اور یہی بیماری آج کثیر مسلمانوں میں پائی جاتی ہے۔ اتنی جرأت تو ان سے نہ ہو سکی کہ باقاعدہ بُت تراش لیتے۔ لیکن بزرگوں کی قبروں بعض حالتوں میں جعلی قبروں تک کے ساتھ معاملہ پرستش اور بندگی ہی کا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مندروں میں رکھے ہوئے سنگی بتوں اور درگاہوں میں سجی ہوئی سنگی قبروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہ گیا ہے۔

قبروں پر میلے اور عُرس

ایک طرف اس حدیث کو دیکھئے جس میں تین مسجدوں کے سوا کسی بھی مسجد یا مزار یا درگاہ کی طرف باقاعدہ سفر کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب تو یقیناً نہیں ہے کہ ہر طرح کے سفر ہی کو رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا۔ بلکہ باتفاق علماء اس کا یہ مطلب ہے کہ تقرب الی اللہ اور ثواب کی نیت سے صرف تین مساجد ہیں جن کی طرف سفر کرنا جائز ہے۔ مسجد اقصیٰ، مسجد حرام، مسجد نبوی۔ ان کے علاوہ تقرب الی اللہ کی نیت سے سفر ناجائز ہے۔

دوسری طرف وہ قولِ رسول اللہ دیکھئے جسے ابھی نقل کر آیا ہوں ــــ یعنی "میری قبر کو عید نہ بنالینا۔"

"عید" کے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنا۔ ہر وہ جگہ عید ہے جہاں لوگ بار بار جاتے ہیں۔ ہر وہ زمانہ اور وقت عید ہے جس میں کوئی کام بار بار کیا جاتا ہے۔ ہر وہ مجمع عید ہے جو بار بار اکٹھا ہوتا ہے۔ روایاتِ صحیحہ گواہ ہیں کہ صحابہؓ اور تابعین اور ائمہ و اتقیاء نے رسول اللہؐ کے حکم کی تعمیل کی اور قبرِ رسولؐ کو عید نہیں بنایا۔ وہاں کے لئے اوقات متعینہ میں جمع ہونا یا تنہا جانا جائز نہیں سمجھا۔ صحابہ میں سے بعض بغیر تعینِ وقت اور بغیر پابندی کے جاتے تو قبر پر کھڑے ہو کر صرف سلام کہتے۔ کیونکہ سلام کا حکم رسول اللہؐ نے دیا تھا اور بعض صحابہ بہت دور ہی سے سلام کہہ لیتے۔

یہ تو تھا تعلیمِ رسولؐ اور تعلیمِ صحابہؓ کا حال۔ اب ذرا ہمارے زمانہ کے عرسوں اور سالانہ میلوں کا حال دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ کثیر مسلمان کس ذوق و شوق سے سال بسال قبروں کے میلوں میں جاتے ہیں اور لاتعداد خرافات و منکرات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

قبروں پر دعا قبروں پر جا کر اہلِ قبر سے کچھ مانگنا تو کھلا شرک ہے ہی۔ لیکن قبروں پر جا کر براہِ راست اللہ سے مانگنے کی فضیلت و خصوصیت بھی قرآن و سنت میں کہیں نہیں ملتی۔ یعنی ایسا کہیں نہیں ملتا کہ قبروں کے پاس دعا مانگنا نسبتاً بہتر اور وجہِ برکت ہو۔ جتنی بھی روایات ہیں اُن میں صرف مُردوں کے لئے دعا ہے یا بعض ایسے الفاظ ہیں جو عبرت کا فائدہ دیتے ہیں۔ مثلاً:-

السلام علی اھل الدیار من المومنین والمسلمین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون نسأل لنا ولکم العافیۃ (مسلم)	سلام پہنچے ان بستیوں کے مومن اور مسلم رہنے والوں کو۔ ہم انشاء اللہ تم سے مل جانے والے ہیں۔ ہم اپنے اور تمہارے لئے عافیت کے طالب ہیں
(۲) السلام علیکم دار قوم مومنین انتم لنا فرط ونحن بکم لاحقون	اے مومنو! تم پر سلامتی ہو۔ تم ہمارے پیش رو ہو اور ہم تمہارے پیچھے آنے والے ہیں۔ خدایا

اللّٰهمّ لا تحرمنا اجرهم ولا تفتنّا بعدهم۔ ہمیں اُن کے ثواب سے محروم نہ کر اور ہمیں اُن کے بعد فتنہ میں نہ ڈال۔

ان دعاؤں میں مقصدِ اصلی مرحومین کے لئے دعا ہے اور اپنے لئے خیر و فلاح کی طلب ضمناً ہے۔ ہمارے زمانے میں مرحومین کے لئے دعا کا طریقہ تو ختم ہوا اور اُلٹی گنگا بہی کہ بزرگوں کی قبروں پر جاتے ہیں اور اُن کے لئے دعا تو اس لئے نہیں کرتے کہ اُن کی نجات و مغفرت پر ہم ایمان لا چکے ہیں۔ خود اپنے لئے دعا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ صاحبِ قبر کی برکت و فضیلت سے دعا پُر اثر ہو جاتی ہے گی۔ ایسا سمجھنا غلط اور خلافِ شرع ہے۔ کیونکہ قرآن و سنت میں اس کے لئے کوئی تعلیم نہیں معلوم نہیں کن لوگوں نے یہ گھڑ دیا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہ کہا کرتے تھے کہ جب کبھی مجھ پر کوئی سختی آن پڑتی ہے تو میں امام ابوحنیفہؒ کی قبر پر آکر دعا کرتا ہوں اور سختی دور ہو جاتی ہے۔ یہ محض جھوٹی روایت ہے جو نہ تو روایت کے مسلمہ اصولوں پر صحیح اُترتی ہے نہ عقل و قیاس کے مطابق ہے۔ امام شافعیؒ تو اپنی تحریروں میں قبروں کی تعظیم و تکریم مکروہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے حجاز، یمن، عراق، وشام اور مصر وغیرہ میں کتنے ہی صحابہ اور تابعین کی قبریں دیکھیں لیکن کبھی کسی قبر کی طرف رجوع نہیں فرمایا۔ حالانکہ صحابہ تو ظاہر ہے امام ابوحنیفہؒ سے بدرجہا افضل و برتر تھے۔ حق یہ ہے کہ امام شافعیؒ جب بغداد میں تشریف لائے تو وہاں کسی قبر پہ لوگ دعا کے لئے آتے تھے نہ یہ طریقۂ ناقص اُس دور میں مروّج تھا۔

بعض لوگ مشہور بزرگ معروف کرخیؒ کی قبر کے متعلق کسی بزرگ کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ وہ قبولِ دعا کے لئے تریاق اور مجرب ہے اور خود معروف کرخیؒ نے اپنے بھتیجے کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ میری قبر پر آکر دعا کیا کرے۔ نیز بعض نیک لوگوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ صلحاء اور انبیاء کی قبروں پر آکر دعا میں

کیا کرتے تھے اور دعائیں قبول ہو جاتی تھیں۔ نیز بعض فقیہوں نے قبر پر قرآن خوانی کا جواز لکھا ہے۔ یا بعض لوگوں نے اپنے تجربے بیان کئے کہ فلاں شیخ کے مزار پر ہم نے دعا کی اور مقبول ہوئی۔ یا بعض علماء اور زاہدین قبروں پر دعائیں کرتے اور جھکتے دیکھے گئے۔ لہذا یہ لوگ جاہل اور تارک شریعت نہیں ہو سکتے۔

اس طرح کی حجتیں لانا دین و شریعت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک دعا کے مقبول ہونے کا تعلق ہے تو کوئی بھی فیصلہ کن طور پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کس لئے مقبول یا رد ہوئی۔ دعا گھر کے کونے میں مقبول ہوتی ہے اور قبر رسولؐ تک پر نامقبول ہو جاتی ہے۔ دعا کافروں اور مشرکوں اور سخت گناہگاروں کی بھی قبول ہوتی ہے اور کفار بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں عمل کی وجہ سے یا فلاں گرجا کی برکت سے دعا قبول ہوئی ہے۔ ہندوؤں میں بھی عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں مندر یا فلاں استھان یا فلاں گھاٹ پر دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا کافروں اور مسلمانوں سب کی قبول و رد کرتا ہے۔ وہ رب العالمین ہے اور اگر کسی قبر پر دعا کرنے سے فوری قبولیت حاصل ہو جائے تو یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ مقبولیت اس قبر یا صاحب قبر کی برکت سے ہے' بلکہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ وقت ہی اللہ تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کا رکھا تھا اور اس وقت کسی بھی جگہ یہ دعا مانگ لی جاتی قبول ہوتی۔

رہا بعض بزرگوں کا قول۔ تو اول تو اس قول کی روایتیں ہی مستند نہیں ہیں۔ دوسرے کسی شخص کا بزرگ ہونا اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ اس کا ہر اجتہاد درست ہی مان لیا جائے۔ اگر وہ مجتہد کا درجہ رکھتا ہے تو یوں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسے اس اجتہاد پر کوئی گناہ نہیں ہوا۔ بلکہ ایک درجہ میں اجتہاد کا ثواب ہی ملا۔ لیکن جو لوگ محض تقلید میں اسے اختیار کرتے ہیں۔

وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔ کیونکہ مقلد کے لئے یہ مسئلہ اجتہادی نہیں۔ بلکہ غلط اجتہاد کی پیروی ہے۔ قول کے بعد فعل کا نمبر ہے تو اس کا بھی یہی حال ہے کہ کسی بزرگ کا خصوصی فعل شریعت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہر دور میں قبروں کی تعظیم اور اس پر دعا کی مخالفت کرنے والے بہت علماء رہے ہیں۔ لہذا اگر کچھ علماء وصلحاء تعظیم و دعا کو درست بھی کہیں تو یہ مسئلہ اختلافی ہوا اور اختلافی مسائل میں اللہ تعالیٰ کا کھلا حکم ہے کہ :-

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔ جب تم کسی مسئلہ میں باہم اختلاف کرنے لگو تو اسے اللہ اور اُسکے رسولؐ کی تعلیمات کی روشنی میں فیصل کرو۔

اور یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ دعا کا قبول کیا جانا الگ بات ہے اور فعلِ ممنوع کی سزا الگ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کافر بُت یا صلیب کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور اللہ اُس کی دعا قبول کر لیتے ہیں تو کیا اس قبولیت کے باوجود اُس کے یہ کافرانہ افعال مستحقِ سزا نہ ہوں گے۔ ہوں گے اور ضرور ہوں گے۔ اسی طرح قبر پر جا کر اگر کوئی مسلمان دعا کرتا ہے اور وہ قبول ہو جاتی ہے تو غلط اعتقادی اور ممنوع طرزِ عمل اختیار کرنے کا عذاب تو بہرحال ملے گا۔

پھر بعض دعاؤں کا قبول ہونا بھی عذابِ الٰہی کی ایک شکل ہوتا ہے۔ آدمی اپنے نزدیک جو چیز مفید سمجھتا ہے وہ مانگتا ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہی چیز اس کے لئے مصیبت و ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ جیسے مثلاً ایک شخص ثعلبہ نے آنحضورؐ سے درخواست کی کہ میرے لئے کثرتِ مال و اولاد کی دعا فرمائیں۔ آنحضورؐ نے فرمایا۔ ایسی خواہش مت کر تجھے نقصان رہیگا۔ لیکن اُس نے ضد کی اور آپؐ نے دعا فرما دی جو مقبول ہوئی۔ مگر یہی چیز

اس کے لئے تباہی کا باعث بن گئی۔ چنانچہ جب مال ملا تو اُس نے زکوٰۃ تک سے انکار کر دیا۔ ایسی ہی مثالیں آپ اپنے ارد گرد دیکھ سکتے ہیں۔ اولاد کی دعا قبول ہوتی ہے تو بعض حالتوں میں یہی اولاد ماں باپ کے لئے ہزاروں پریشانیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ وعلیٰ ہذا۔

زیارتِ قبور

قبروں کی زیارت کا بے شک حضورؐ نے اذن دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے کہ موت کو یاد رکھو، موت کو یاد رکھنا ظاہر ہے کہ بجائے خود مقصد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی موت کو یاد رکھے گا تو اچھے اعمال کی طرف راغب ہو گا، برائیوں سے بچے گا اور دُنیا کی زندگی میں محو نہیں ہو گا۔ مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا:۔

"میں نے اللہ سے اپنی والدہ کی مغفرت کی اجازت چاہی تو منع فرمادیا گیا۔ مگر اُن کی قبر کی زیارت کا اذن مانگا تو مل گیا۔"

دوسری روایت مُسلم ہی میں ہے کہ حضورؐ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اور اس قدر روئے کہ جو اصحاب ساتھ تھے وہ بھی رونے لگے۔ آپؐ نے فرمایا میں نے اپنی والدہ کے لئے مغفرت طلب کی تو انکار فرمادیا۔ لیکن قبر پر آنے کی اجازت دے دی۔ لہذا قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔

حضورؐ کے طرزِ عمل پر غور کیجئے۔ پھر یہ دیکھئے کہ آج کتنے لوگ موت کو یاد کرنے قبروں پر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لوگوں نے اس علتِ حکم ہی کو فراموش کر دیا اور محض صالحین کی قبروں پر تقرب الی اللہ اور برکت و سعادت کے لئے میلے لگانے لگے اور موت کی عبرت انگیز ویرانی و خموشی کو راگ رنگ، شور و شر اور فسق و فجور میں بدل دیا۔ یا حسرتا۔ زیادہ سے زیادہ مذکورہ فعلِ رسولؐ سے یہ نظریہ اخذ کیا

جاسکتا ہے کہ اپنے کسی عزیز و قریب یا دوست کی قبر پر بطور محبت جانا جائز ہے تو اس
میں بھی کچھ اعتراض نہیں۔ لیکن یہ محض رسمی چیز نہ بن جانی چاہیے۔ نہ اسے اجتماعی
شکلیں دینا درست ہے۔

راگ رنگ قوالی

"سماع" کے نام سے جو خرافات و منہیات رواج پا گئی ہیں وہ
سب کو معلوم ہیں۔ قرآن و حدیث اور تعامل صحابہؓ اور [illegible]
صحیحہ سے تو ان کے جواز پر کوئی دلیل ملتی ہی نہیں۔ بس بعض بعد کے صوفیائے کرام [illegible]
بنا کر لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا اور اس میں اتنے بڑھ گئے کہ صریح منہیات و [illegible]
کا ارتکاب کیا جانے لگا۔ اوّل تو پچھلے بعض بزرگوں نے جو "سماع" اختیار [illegible]
یہ اُن کا ذاتی فعل تھا جو ہرگز حجت نہیں ہو سکتا۔ پھر انھوں نے بہت سخت شرائط
اس کے لئے رکھیں جن کی تفصیل اُن کے قول و عمل میں ملتی ہے آج یہ شرائط [illegible] نظر انداز
کر دی گئیں اور محض لغویات و مزخرفات اختیار کر لی گئیں۔ ہم نہیں جانتے کہ
کون صحیح العقل مسلمان ہو سکتا ہے جو خلوص سے [illegible] قرآن و سنت کا مطالعہ
کرے اور پھر آج کل کے عرسوں، قوالیوں اور ناچ گانوں کی اہمیت و [illegible]
کا وہم بھی کر سکے۔ اس باب میں [illegible] معلوم ہو سکے گی کہ جس
طرح لہو و لعب کا فضول ہونا اور تماشہ [illegible] کا لغو ہونا ظاہر و باہر ہے اسی طرح
مروجہ راگ رنگ اور قوالی کا قبیح و مذموم ہونا ظاہر و باہر ہے۔

بدعت کی کسوٹی

میرا ارادہ تھا کہ مروجہ بدعات میں جو زیادہ مشہور و
مقبول ہیں ان میں سے ایک ایک پر مفصل تنقید کروں
لیکن ایک تو یہ کہ فاضل مدیر فاران کے اصرار کے باوجود میں عدم الفرصتی کے
باعث مناسب وقت پر مضمون شروع نہ کر سکا اور آغاز اس وقت کیا جب اُن کا
یہ خط آیا کہ مضمون فوراً بھیجو۔ دوسرے میرا قلم اس چیز نے روکا کہ یہ صرف مضمون [illegible]

کتاب نہیں۔ قرآن میں آخر اوروں کے بھی تو مضامین آتے ہیں۔ اگر میں نے الگ الگ بدعتوں کو لیا تو پوری کتاب بن جائے گی۔ صرف تبرکوں ہی کے معاملہ پر آپ دیکھئے کتنے صفحے صرف ہو گئے۔ حالانکہ اس میں بھی تے سب گوشے اور بسیط مطالب بیان نہیں سکتے۔ پھر بدعتیں اتنی کثیر ہیں کہ سب کو ایک ہی مضمون میں جمع کرنا اور ہر ایک کی خرابی الگ الگ بیان کرنا دفتر چاہتا ہے۔ جُدا جُدا بیان کرنے کے عوض میں مناسب سمجھتا ہوں کہ قرآن و سنّت کی روشنی میں ایسی کسوٹی آپ کے سامنے رکھ دوں جس پر آپ کسی بھی قول و فعل کو پرکھ کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ یہ بدعت ہے یا امرِ جائز، مقبول ہے یا مردُود۔ وباللہ التوفیق۔

لغت میں لفظ "بدعت" کے معنی ہر اُس کام کے ہیں جو نیا نیا کیا گیا ہو۔ اور اس سے پہلے اس پر عمل نہ ہوا ہو۔ لیکن شریعت میں یہ لغوی مفہوم مراد نہیں، بلکہ مراد صرف وہ نئے کام ہیں جنھیں دین کا جزو بنایا جا رہا ہو۔ یہ اتنی سیدھی اور صاف بات ہے کہ معاند یا احمق کے سوا کوئی اس سے اعراض نہیں کر سکتا۔

آدمی جو بھی کام کرتا ہے اس کا کچھ نہ کچھ مقصد اور منشاء ضرور ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ مقصد دنیا کی کوئی منفعت و مصلحت ہے یا آخرت کی۔ اگر دنیا کی ہے تو شریعت کو اس سے کوئی دشمنی نہیں، بس وہ تو اتنا کہتی ہے کہ حلال و حرام کی جو حدیں اللہ و رسولؐ نے متعین فرما دی ہیں وہ نہ ٹوٹیں اور آپ ان حدوں میں رہتے ہوئے جس طرح چاہیں مفادِ دنیاوی اور راحت و عزت حاصل کریں۔ مثلاً آپ نے ریل کا سفر کیا ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کے دور میں ریل نہیں تھی۔ لہٰذا از روئے لغت ریل کا سفر بدعت ہوا، مگر اس کا مقصد خالی دُنیاوی ہوتا ہی اور قرآن و سنت کے کسی لفظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اہلِ کفر کی ایجادات سے دنیاوی فائدہ نہ اُٹھاؤ، بلکہ اس کے برعکس اہلِ کفر کی مصنوعات کا استعمال خود فعلِ رسولؐ

سے ثابت ہے۔ لہذا شریعت کے نزدیک یہ بدعت نہ ہوگی۔ اسی طرح دیگر اُمور ہیں جو کسی حکم شرعی کے خلاف نہ ہوں اور باعتبار دورِ مبارک کے لغتاً بدعت ہوں۔ ان پر شریعت کو کچھ اعتراض نہیں۔ ہاں اگر اُن سے کوئی حکم شرعی ٹوٹتا ہو تو بیشک شریعت اُن پر معترض ہوتی ہے۔ مثلاً بینک کا کاروبار ہے، آنحضورؐ کے دور میں یہ کاروبار اپنی موجودہ شکل میں نہیں تھا اور آج یہ دنیاوی مقاصد کے لئے رائج کیا گیا ہے لیکن شریعت نے سود کے لئے جو احکام بیان کئے یہ کاروبار چونکہ اُن کو جھٹلاتا ہے اس لئے شریعت کے خلاف ٹھیرا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کام کا مقصد دنیاوی نہ ہو بلکہ اُخروی ہو۔ اس کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ اس کا حکم قرآن وسنت میں موجود ہے یا نہیں۔ اور صحابہؓ وائمہ نے اسے قرآن وسنت کے کسی لفظ یا جملہ سے اخذ کیا ہے یا نہیں۔ اگر دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت موجود ہے تو اس کام کے شرعی ہونے میں کوئی کلام نہیں، اور اگر کوئی صورت موجود نہیں ہے تو دیکھا جائے گا کہ جس مقصد اور سبب کی خاطر یہ کام کیا جا رہا ہے وہ مقصد اور سبب رسول اللہؐ کے دور میں بھی موجود تھا یا نہیں۔ نیز اگر موجود تھا تو رسول اللہؐ اور ان کے اصحاب کے لئے عملاً اس کام کو کر لینے میں کوئی رکاوٹ حائل تھی یا نہیں۔ اگر وہ مقصد و سبب اُس دور میں بھی موجود تھا اور اس کے حصول کے لئے آج جو کام کیا جا رہا ہے اس زمانہ میں بھی کر لینا ممکن تھا اور پھر بھی حضورؐ اور ان کے اصحاب نے نہیں کیا تو یقیناً کہا جائے گا کہ یہ کام بدعتِ شرعی میں داخل ہے۔ مثال کے طور پر بعض بدعت پسندوں کے اس طرزِ عمل کو لیجئے کہ وہ کسی ایک یا چند نماز کے بعد سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص وغیرہ پڑھنے کو نہ صرف اچھا سمجھتے ہیں بلکہ اس کی پابندی کرتے ہیں اور جو اُن کی تقلید نہ کرے اُسے وہابی وغیرہ کہتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اُن کا یہ عمل دُنیاوی مقاصد کے لئے ہے یا دینی مقاصد کے لئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ دُنیاوی فائدہ تو اسمیں ذرہ برابر نہیں۔ یہ لوگ ثواب اور برکت ہی کے مقصد سے یہ فعل کرتے ہیں جو اُخروی فائدہ میں داخل ہے اور تقرب الی اللہ کے سوا اس کا کوئی نفع متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ پس یہ مقصد تو دَورِ مبارک میں نہ صرف موجود تھا بلکہ اسی مقصد اور سبب کے لئے آنحضورؐ مبعوث ہوئے تھے اور یہی دین کا مقصد حاصل ہے۔ علاوہ ازیں کوئی مانع بھی ایسا موجود نہ تھا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حضورؐ اور آپ کے اصحاب بعد نماز فاتحہ اور سورۃ اخلاص کی پابندی نہ کر سکتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی قول و فعل سے نہ تو حضورؐ نے اسکی تعلیم دی نہ صحابہ نے اس پر عمل کیا۔ لہٰذا لازماً یہ بدعت ہے اور اس کو افضل و مقدس سمجھنے والا یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ اللہ کے تقرب اور حصولِ ثواب کے جن ذرائع سے میں واقف ہوں اُن کا علم رسول اللہؐ کو بھی نہ تھا نعوذ باللہ اندازہ کیجئے رسول اللہؐ تو جمعہ کو متعین کر کے روزہ رکھنے کو بھی منع فرماتے ہیں کہ اس طرح لوگوں میں یوم جمعہ کے لئے ایسے فضائل متصور کر لئے جائیں گے جو اس میں نہیں ہیں اور مدعیانِ اسلام نئی نئی عبادتیں گھڑ کے اُن پر خود جمتے اور لوگوں کو جماتے ہیں۔ حالانکہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص وغیرہ کی جو تعریفیں رسول اللہؐ سے منقول ہیں اُن کا اقتضا صرف یہ ہے کہ مسلمان وقتاً فوقتاً انھیں پڑھتا رہے اور دوسروں کو بتلائے کہ ان سورتوں کو پڑھا کریں مگر کسی وقت کے ساتھ انھیں خاص اور پابند کر دینا ایجاد و بدعت شمار ہوگا۔ کیونکہ جن مواقع پر ان کی پابندی اور دوام منقول نہیں اُن مواقع پر پابندی کرانا گویا آزادی اور رخصت کا وہ حق سلب کرنا ہے جو اللہ و رسولؐ نے مومنین کو دیا ہے۔ اس حق

کو سلب کرنے کا کسی کو کیا حق ہے۔ صرف اتنا اگر ہوتا کہ بعض لوگ سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کی کسی خاص مقدار اور ترتیب کو ثواب کی نیت سے اختیار کر لیتے تو یہ بے شک بدعت نہ تھا، کیونکہ ذکر اللہ کا یہ بھی ایک طریقہ تھا، لیکن اس طریقے کو اس طرح مؤکد بنا دینا کہ جو اس پر عمل نہ کرے نکو بنے [illegible] کہلائے، لائقِ طعن سمجھا جائے بدعت ہے۔ نیز یہ بھی بدعت ہے کہ امام باآوازِ بلند سورۃ فاتحہ وغیرہ پڑھے۔ کیونکہ اس طرح تمام مقتدی [illegible] پابند ہو جاتے ہیں اور اپنی الگ دعا سکون و طمانیت سے [illegible] ظاہر ہے کہ جس طرح امام کو شریعت نے اختیار دیا [illegible] [illegible] سورت کو چاہے پڑھے [illegible] دیا تھا کہ وہ اپنی پسندیدہ دعائیں اور کلمات و آیات [illegible] صواب [illegible] اور پسند کی پیروی پر دوسروں کو عملاً مجبور کر دے [illegible] ہو سکتا ہے۔

دوسری مثال مولود کی ہے جو یوم پیدائش پر سال بہ سال [illegible] اہتمام اور پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ مثال اس لحاظ سے بڑی نازک ہے کہ جب اس کے بدعت ہونے پر کلام کیا جائے تو بدعت پسند حضرات عوام کو جذباتی باتوں میں پھنسا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو صاحب یہ ذکرِ رسول کو بھی منع کرنے لگے۔ حالانکہ ذکرِ رسول ﷺ سے تو منع کا فریبی [illegible] ہے۔ ذکرِ رسول اپنی جگہ مسلّم۔ لیکن یہ یوم پیدائش پابندی سے منانے کا طریقہ اور منکرات و مکروہات سے آلودہ نمائشی محفلیں منعقد کرنے کا رواج کسی طرح شریعت کی میزان میں پورا نہیں اُترتا۔ بزرگوں کا یوم ولادت منانا اگر برکت اور ثواب کا کام ہوتا تو ضرور آنحضورؐ انبیائے سابق کا یوم پیدائش منایا

کرتے خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تو ضرور مناتے۔

حدیث ہے:-

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم المدینۃ فوجد الیھود صیاماً یوم عاشوراء فقال لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماھذا الیوم الذی تصومونہ فقالوا ھذا یوم عظیم انجی اللہ موسیٰ وقومہ وغرق فرعون وقومہ فصامہ موسیٰ شکراً فنحن نصومہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنحن احق بموسیٰ منکم فصامہ وامر الناس بصیامہ۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی یوم عاشورہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ پس آپ نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اُن لوگوں نے بتایا کہ یہ عظمت والا دن ہے اس میں اللہ نے موسیٰؑ کو اور اسکی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون کو غرق کیا تھا۔ پس موسیٰؑ نے بطور شکر کے روزہ رکھا تھا۔ پس ہم بھی روزہ رکھتے ہیں تو کہا رسول اللہؐ نے ہم موسیٰؑ کے معاملہ میں تم سے زیادہ حقدار ہیں پس آپ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور لوگوں کو رکھنے کا حکم دیا۔

اس کے ساتھ دوسری حدیث دیکھئے:-

عن ابی موسیٰ قال کان یوم عاشوراء یوماً یعظمہ الیھود وتتخذہ عیداً قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صوموہ انتم۔

ابو موسیٰ سے مروی ہے کہ یہودیوں کے نزدیک یوم عاشورہ ایک معظم دن تھا اور وہ اس دن عید منایا کرتے تھے۔ پس رسول اللہؐ نے کہا (مسلمانوں سے) کہ تم روزہ رکھو۔

ان حدیثوں کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ دیکھئے روزہ بطور شکر ایک

دینی فعل تھا۔ لہذا آنحضورؐ نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن بطور شکر سال بہ سال عید منانا قبول نہیں کیا۔ کیونکہ آپؐ جانتے تھے کہ اس طریقہ میں کوئی بھلائی نہیں۔ حالانکہ حضرت موسیٰؑ کا یوم نجات اور غرقابیِ فرعون بداہۃً خوشی منانے کے لئے بہت کافی وجہ ہے۔ کم سے کم نفسِ ولادت سے تو اس کا مرتبہ زیادہ ہے اس کے برخلاف حضرت موسیٰؑ کا فرعون جیسے جبارو قہار پہ فتح پانا اور فرعون کا غرق ہو جانا صراحتہً خاص اور اہم واقعہ ہے جس پر خوشی منائی جانی عقلاً نامناسب نہیں۔ مگر جس چیز کے بارے میں رسولِ خدا کو معلوم ہو کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں وجہ قربت نہیں بن سکتی اور عوام کے لئے اس میں فتنہ کے جراثیم پوشیدہ ہیں۔ اسے آپؐ کیسے اختیار کر سکتے تھے آپ جانتے تھے کہ میں نے اختیار کیا تو یہ امت کے لئے سنت بن جائے گی' اور دین کے اعتبار سے بے نتیجہ بلکہ فتنہ پرور باتوں کو سنت بنانا ایک سچے نبی کے لئے ممکن نہیں ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ تو چونکہ خود ہر نبی سے بلند مرتبہ تھے اس لئے آپؐ نے کسی نبی کا یوم ولادت نہیں منایا۔ چلئے مان لیا' لیکن کیا صحابہؓ بھی انبیاءؑ سے افضل تھے؟ کیا حضورؐ کے نزدیک اگر یوم پیدائش منانا برکت وسعادت کا ذریعہ ہوتا تو آپؐ صحابہؓ کو اس کا حکم نہ دے سکتے تھے؟ پھر آنحضورؐ کے بعد خود صحابہ کو بھی اتنی دینی فہم نہ ہوئی کہ آنحضورؐ کا یوم ولادت منالیا کریں۔

ایک یہ گوشہ نکالا جاتا ہے کہ ہم تو میلاد بطور وسیلہ خیر کرتے ہیں تاکہ لوگ دین کی طرف مائل ہوں' اس خیال و نیت کا ثبوت اگر عمل سے ملتا تو خیر بات وزنی بھی۔ مگر حال تو یہ ہے کہ میلاد کی محفلوں میں آیتِ قرآنی اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ کی بھی دل کھول کر نافرمانی کی جاتی ہے۔ کتابیں بھی غیر مستند پڑھی جاتی ہیں۔ قیام بھی کیا جاتا ہے' جو خلافِ شرع اعتقاد کا نتیجہ ہے اور دن تاریخ

کی ایسی پابندی کی جاتی ہے کہ روزہ نماز قضا ہو مگر یہ قضا نہ ہو۔ حالانکہ رسول اللہ اگر اس خاص مہینہ میں پیدا ہوئے تو وصال بھی آپؐ کا اسی مہینہ میں ہوا ہے تو یہ مہینہ مسرت کے ساتھ شدید ترین عبرت کے اسباب بھی اپنے اندر رکھتا ہے کہ اللہ تعالٰے کی ذات کے سوا ہر شے ہالک اور فانی ہے۔

بہرحال یہ ثابت ہو گیا کہ یوم ولادت منانے کا مقصد جو کچھ سمجھا جاتا ہے وہ آنحضورؐ اور صحابہؓ اور تابعینؒ سب کے دور میں موجود رہا ہے اور کوئی رکاوٹ بھی ایسی نہیں رہی کہ یہ حضرات اس عمل کو نہ کر سکتے۔ جب انہوں نے نہیں کیا تو ثابت ہوا کہ یہ عمل بدعت ہے۔

ہاں کسی بڑے شاعر یا ادیب یا لیڈر کا یوم پیدائش منانا چونکہ خالص دنیاوی معاملہ ہے اور تقرب الی اللہ اور ثواب و برکت سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ اسلئے شریعت کی اصطلاح میں اسے بدعت نہیں کہیں گے۔ البتہ جو اسراف اور تضیع اوقات اور ممنوع افعال اس میں کئے جائیں انھیں شریعت ممنوع قرار دے گی۔

دوسری صورت لیجئے کہ سبب تو موجود تھا، مگر عمل میں رکاوٹ تھی۔ اس کی مثال قرآن اور دینی کتابوں کو چھاپنا ہے ظاہر ہے کہ قرآن کی اشاعت و نشر کا مقصد دورِ مبارکؐ میں بھی موجود تھا اور آج بھی موجود ہے۔ اسی طرح علومِ دینیہ کو پھیلانے کا مقصد جب بھی تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن اُس زمانے میں پریس ایجاد نہیں ہوا تھا، لہذا چھپائی نہیں ہو سکی۔ اب پریس ہے لہذا چھپائی ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم قرآن کو محض تجارتی نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ برکت و ثواب اور نشر و اشاعت کی خاطر چھاپیں تب بھی باوجود دینی ہونے کے یہ فعل بدعت شرعی شمار نہ ہوگا۔ کیونکہ اگرچہ یہ عمل دورِ مبارک میں نہ ہوا اور مقصدِ عمل اس وقت بھی موجود تھا، لیکن اس عمل پر اس وقت قدرت ہی نہ تھی اور چھپائی کا عمل بجائے خود

کسی حکمِ شرعی کے خلاف نہیں ہے۔ یہ معاملہ ثواب کی خاطر کتابیں چھاپنے اور پوسٹر وغیرہ شائع کرنے کا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک نیا کام ہم نے جس مقصد کے لئے شروع کیا ہے وہ اگرچہ آخرت سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن وہ جس سبب کے لئے کیا جا رہا ہے وہ سبب ہی دورِ مبارک میں موجود نہ تھا۔ مثلاً آنحضورؐ کے بعد صحابہؓ کا قرآن جمع کرنا اور صحابہ و تابعین کا حدیث کی کتابیں ترتیب دینا۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں سے حفاظتِ دین اور تحفظِ مذہب مقصود ہے۔ یہ مقصود ابتداء ہی سے شرعی اور دینی ہے۔ لیکن قرآن و حدیث کے جمع و تدوین کے اسباب آنحضورؐ کے زمانہ میں موجود نہیں تھے۔ آپؐ کے بعد حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ جمع و تدوین کی ضرورت معلوم ہوئی، لہٰذا یہ وہ شرعی بدعت نہیں ہے جسے حدیث میں "ضلالت" کہا گیا ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو سبب دورِ مبارک میں نہیں تھا بلکہ بعد میں پیدا ہوا وہ سبب بجائے خود مسلمانوں ہی کی کسی غلطی کا نتیجہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ مثلاً خطبۂ عید بعد نماز عید مشروع ہے۔ اب بعض جگہ اگر مسلمانوں کا یہ حال ہو گیا کہ نماز ختم ہوتے ہی بھاگنے لگتے ہیں اور خطبہ نہیں سنتے تو یہ سبب اس بات کے لئے کافی نہیں سمجھا جائے گا کہ خطبہ نماز سے پہلے دیا جائے کیونکہ یہ سبب قدرتی نہیں بلکہ مسلمانوں کی بے حسی اور بدعملی سے پیدا ہوا ہے۔

بدعت کو پہچاننے کی یہ کسوٹی اگرچہ اس وقت ہمارے الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے آئی ہے لیکن فی الحقیقت یہ ہماری ایجاد کردہ نہیں بلکہ قرآن و سنت کے بخشے ہوئے دین نے اسے بنایا ہے۔ آخر آپ بھی تو یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ اللہ کے معاملہ میں رسول اللہؐ کا علم ہم لوگوں سے ہزاروں گنا زیادہ

اور یقینی تھا۔ وہ آخری نبی تھے جنہیں دُنیا کے سامنے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے تمام ممکنہ ذرائع کھول کر رکھ دینے تھے اور وہ انھوں نے رکھ دیئے ہماری عقلوں کو اتنی دسترس کہاں کہ ہم اللہ کی رضا یا ناراضی کے بارے میں رسول اللہ ؐ کی تعلیم سے قطع نظر کر کے کوئی یقینی فیصلہ کر سکیں۔ ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے۔ ہم تو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ فجر کی نماز صرف دو رکعت اور مغرب کی تین کیوں ہیں، باقی وقتوں میں چار رکعت کس لئے ہیں۔ عشاء کے بعد کس غرض سے وتر رکھے گئے ہیں۔ زکوٰۃ کی شرح ڈھائی فیصد کیوں ہے دو یا تین فی صد کیوں نہیں۔ ہمارا کام صرف اس قدر ہے کہ قرآن اور رسول اللہ ؐ نے جو حکم فرمایا اُسے پورا کریں۔ ایک غلام کو یہ زیب نہیں دیتا کہ آقا کے احکام میں حذف و اضافہ کرے۔ بدعت کو صریح طور پر بالتکرار منع کیا گیا اور ہم ہیں کہ اس منع کرنے والے کی صداقت و رسالت پر ایمان کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اپنی طرف سے نئے اعمال نکالتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ ان سے رسول اللہ ؐ خوش ہوں گے۔ اللہ کی رضا ملے گی برکت حاصل ہو گی۔ جب رسول اللہ ؐ کے رسول اور خداشناس ہونے پر ہم ایمان لے آئے تو خود بخود یہ بات لازم آجاتی ہے کہ خدا کا قرب اور ثواب و برکت حاصل کرنے کے لئے جو اعمال ہو سکتے تھے وہ حضورؐ نے قول و عمل سے واضح فرما دیئے اور جن اعمال کو اختیار نہیں فرمایا، حالانکہ اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ وہ یقیناً مفیدِ ثواب و برکت نہ ہوں گے۔

خیال آتا ہے کہ بدعت پسند حضرات حضرت عمر فاروق ؓ کے ایک جملہ کو اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں، وہ جملہ نمازِ تراویح کی باقاعدہ جماعت کے بارے میں ہے۔ الفاظ یہ ہیں۔ "نعمت البدعتہ ھٰذہٖ" (کیسی اچھی ہے یہ بدعت) یہ الفاظ آپ نے ان لوگوں کے جواب میں فرمائے تھے جنھوں نے کہا تھا کہ یہ جو آپ نے

پورے رمضان میں پابندی سے تراویح باجماعت کا سلسلہ مسجد میں شروع کرا دیا ہے۔ یہ تو بدعت معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکل حضورؐ کی زندگی میں نہیں تھی۔

اس جملہ سے یہ دلیل پکڑی جاتی ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں سیئہ اور حسنہ۔ حدیثوں کا مورد بدعاتِ سیئہ ہیں اور بدعاتِ حسنہ پسندیدہ و محبوب ہیں جیسا کہ خود حضرت عمرؓ کے قول سے معلوم ہوا۔ بظاہر بات بڑی ظاہر فریب ہے لیکن جب تجزیہ کیجئے تو تلبیس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حدیث کی ایک ایک کتاب اُٹھا کر دیکھئے۔ کسی جگہ آپ کو نہیں ملے گا کہ شریعت نے بدعت کی دو قسمیں کی ہوں جتنی بھی حدیثیں آپ نے بدعت کے بارے میں ابھی پڑھیں اور جتنی ان کے علاوہ ہیں سب میں "بدعت" بغیر کسی اضافت کے مطلقاً بولا گیا ہے اور مطلق کو مقید یا عام کو خاص کرنے کے لیئے جب تک مضبوط قرینہ نہ ہو، کسی کو تقیید یا تخصیص کی اجازت نہیں۔ بدعت کی تقسیم بعد کے لوگوں نے کی ہے اور اس لئے کی ہے کہ بعض اُمور ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بدعت کا پہلو تو معمولی سا ہوتا ہے اور دینی نفع کا پہلو ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے اُمور کو بعض لوگوں نے بدعتِ حسنہ کا نام دے لیا مثلاً بعض بزرگوں نے اپنی خاص طبیعت اور مزاج کے تحت یہ محسوس کیا کہ معرفت و تصوف کے اشعار ان پر بہت اثر کرتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے خوش آواز لوگوں سے اُنھیں سُننا شروع کیا اور اگرچہ وہ جانتے تھے کہ یہ "سماع" بدعت ہے۔ لیکن اس سے اُن کی رغبت الی اللہ زیادہ بڑھی اور تزکیۂ نفس کے لئے اسے اپنے حق میں زیادہ مؤثر پایا۔ لہٰذا "بدعتِ حسنہ" قرار دے لیا۔ ہو سکتا ہے خاص ان کے حق میں یہ بدعت باوجود ممنوع ہونے کے عتابِ الٰہی کا سبب نہ بنے۔ کیونکہ انھوں نے پورے اخلاص سے اسے اختیار کیا تھا اور کسی طرح کی خرافات کو اس میں داخل نہیں کیا تھا۔ نہ نفسانی

لذت حاصل کرنا ان کے پیشِ نظر تھا۔ نیز اُن کی زندگی چونکہ اعمالِ خیر اور عبادت و زہد سے لبریز تھی۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ بفحوائے قرآن اُن کی نیکیاں اس بدعت کو اللہ کی بارگاہ میں قابلِ نظر انداز ی بنا دیں۔ لیکن ہمہ شما کو ہرگز جائز نہیں کہ اُن کی تقلید کرے اور سماع کی بدعت کو۔ جو ہر حال میں بدعت ہے۔ فعلِ حسنہ تصور کرلے۔ بہر حال بدعتِ حسنہ شرعی اصطلاح میں کوئی چیز نہیں ہے اور حضرت عمرؓ نے جو بدعت کا لفظ فرمایا وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کام کو پوری طرح مفید اور نفع بخش اور بہتر جان کر اختیار کر رہے ہوں اور اس پر کچھ لوگ آپ سے کہیں کہ یہ کام مفید نہیں ہے، بلکہ نقصان دہ ہے۔ تب آپ ان لوگوں کو جواب دیں کہ اچھا نقصان دہ ہی سہی مگر اسکا نقصان بڑا مفید ہے۔ ظاہر ہے یہ متضاد قسم کا جملہ آپ نے اپنے اُس یقین کی بناء پر کہا ہے جو آپ کو اس کام کے مفید و بہتر ہونے پر ہے۔

اس دلیل کو اگر کوئی نہ مانے تو دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ لفظ "بدعت" شرعی معنی میں نہیں لغوی معنی میں استعمال کیا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک ہی لفظ ہم بعض دفعہ لغوی معنی میں بولتے ہیں اور بعض دفعہ اصطلاحی معنی میں۔ موقع محل خود بتا دیتا ہے کہ لفظ کس معنی میں بولا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں آپ کو خوب معلوم ہے کہ رسول اللہؐ کے حد درجہ کے تابع فرمان اُن کی سنت کے شیدا، اُن کی ادا ادا کے متوالے، اُن کے دین پر ثابت قدم نہایت عظیم صحابی تھے۔ جن کی تعریف میں نہ صرف یہ کہ رسول اللہ کی زبانِ صداقت نظام نے بہت کچھ کہا ہے، بلکہ متعدد بار وحی بھی اُن کی رائے کے موافق نازل ہوئی ہے۔ اُن کی زبان سے اگر کبھی کوئی ایسا جملہ نکلے جس کے دو معنی ہو سکیں تو عقل اور انصاف کا تقاضا کیا

یہ ہے کہ وہ معنی مراد لئے جائیں جو رسول اللہ کے صریح اقوال کے مخالف محسوس ہوتے ہوں۔ یا وہ معنی مراد لئے جائیں جن سے مخالفت نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جس کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا اور ایمان ہوگا وہ وہی مفہوم مراد لیگا جو رسول اللہؐ کے اقوال کی تردید نہ کرتا ہو۔ چنانچہ اس قولِ عمرؓ میں لفظ "بدعت" اگر شرعی معنی میں لیا جائے تو اقوالِ رسولؐ کی تکذیب صریح ہوگی۔ کیونکہ رسول اللہؐ نے تو بدعت کو مطلقاً بالکلیہ مردود ٹھیرایا اور حضرت عمرؓ گویا یوں کہہ رہے ہیں کہ نہیں تمام بدعتیں مردود نہیں ہیں۔ بلکہ بعض بدعتیں محمود و مقبول بھی ہیں۔

کیا حضرت عمرؓ جیسے جلیل صحابی کی طرف ایسے معانی منسوب کرنا اہلِ علم و عقل گوارا کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتے۔ تب قرینہ خود بخود پیدا ہو گیا کہ بدعت کو لغوی معنی میں لو۔ یعنی اپنی مجموعی شکل و ہیئت کے اعتبار سے تو بے شک جماعتِ تراویح کی باقاعدگی اور پابندی اور اس سے متعلق روشنی وغیرہ کا اہتمام ایک ایسا کام تھا جو نیا تھا۔ لیکن شرعی اعتبار سے یہ نیا نہ تھا۔ بلکہ شریعت ہی کا تقاضا اور منشاء تھا اور شریعت میں اس کے لیئے دلیل و شہادت پہلے ہی سے موجود تھی۔

اصحابِ سنن کے ہاں یہ روایت ملتی ہے کہ تراویح کا با جماعت پڑھنا تنہا پڑھنے سے افضل ہے۔ یہ بھی روایت ملتی ہے کہ آنحضورؐ نے رمضان میں دو یا تین راتوں کو تراویح جماعت سے پڑھی تھی اور رمضان کے آخری حصّہ میں بھی متعدد بار پڑھی تھی اور فرمایا تھا کہ جب آدمی امام کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے اور آخر تک ٹھہرا رہتا ہے تو اسے ساری رات کے قیام کا ثواب ملتا ہے۔ پورے مہینہ با جماعت تراویح نہ پڑھنے کا سبب بھی خود

حضورؐ ہی نے بیان فرمادیا کہ میں اس خیال سے نماز کے لئے بر آمد نہیں ہوا کہ کہیں وہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔ گویا تشریف نہ لانا اور باجماعت پابندی سے نہ پڑھنا اس لئے نہیں تھا کہ اس میں کوئی قباحت تھی۔ بلکہ اس لئے تھا کہ کہیں میرے دوام و استقلال سے لوگ اسے فرض و واجب کا درجہ نہ دے بیٹھیں۔

اب اندازہ فرمائیے کہ حضرت عمرؓ نے اگر رسول اللہؐ کے وصال کے بعد تراویح باجماعت کو مہینہ بھر پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا تو شرعاً یہ کیونکر بدعت ہو سکتا ہے۔ اس میں کسی بھی حیثیت سے شرعی مفہوم میں نیا پن نہیں ہے۔ ہاں لغتاً یہ نیا ہے۔ اس کے علاوہ خود رسول اللہؐ نے فرمایا۔ "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔" اس لئے خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کا کوئی طریقہ، کوئی اجتہاد، کوئی عمل بدعتِ شرعی ہو ہی نہیں سکتا کہ اُن کے طریقہ پر چلنا تو حکمِ رسولؐ کا اتباع و انقیاد ہے۔ ان کی جو رائے دیگر اصحاب نے درست مان لی وہ تمام اُمت پر لازم ہوئی اور جس سے کسی ایک یا چند اصحابؓ نے اختلاف کیا اُس میں اگرچہ ہمیں اُن کی رائے ترک کر کے دوسرے صحابی کی رائے مان لینے کا اختیار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی رائے باطل یا بدعت پر محمول تھی۔ رضی اللہ عنہ۔

اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ کا یہ جملہ اہلِ بدعت کے لئے واقعتاً بھی کوئی حجت اپنے اندر رکھتا ہے تو کیا وہ حضرت عمرؓ کے دیگر اقوال و افعال کو بھی حجت مانیں گے؟ اگر مان لیں تو ہمارا اور اُن کا اختلاف ہی ختم ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ ہی تو وہ ہیں جنھوں نے شجرۃ الرضوان کو کٹوایا اور کسی بھی چور دروازہ سے چھوٹی سی بدعت کو داخلہ کی اجازت نہیں دی۔ لیکن یہ حضرات دیگر اقوالِ عمرؓ اور اسوۂ فاروقی کو لائقِ حجت نہیں سمجھتے۔ تب انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اُن کے ایک مبیاختہ

اور متبادر جملہ کو بطور سند لائیں۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو تو بے شک یہ حق تھا کہ رسول اللہ کے کسی حکم عام میں کسی خاص دلیل سے کوئی استثنا نکال لیں۔ اُن کی دینی بصیرت، اصابت رائے اور تفقہ پر محض اُن کا اُسوہ ہی نہیں بلکہ سب سے مضبوط شہادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ علاوہ ازیں اُن کی "بدعت" کو تمام صحابہؓ کا بخوشی قبول کر لینا بھی اس بات کی شافی دلیل ہے کہ یہ بدعت شرعی بدعت تھی ہی نہیں۔ آخر صحابہؓ کے کردار اور کمالِ ایمان سے کون واقف نہیں۔ وہ دین کے معاملے میں کیا حضرت عمرؓ سے دب کر خلافِ حق کوئی فیصلہ قبول کر سکتے تھے۔ ... کوئی بے سواد ہی سوچ سکتا ہے۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ صحابہ کے لئے جان دے دینا آسان تھا، مگر خلافِ شریعت فیصلہ کو بخوشی قبول کر لینا ممکن نہ تھا۔

بتائیے صحابہؓ کے بعد ایسا کون ہے جسے یہ اختیار دیا جا سکتا ہو کہ وہ حضورؐ کے کسی حکم عام میں بغیر دلیل شرعی کے اپنی رائے سے تخصیص کرے یا مستثنیات نکالے کون ہے جس کی بصیرت، تفقہ، بالغ نظری، دینداری، تقویٰ، اصابت رائے اور حبِ رسولؐ پر خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہرِ تصدیق ثبت ہو۔ کوئی نہیں ہرگز کوئی نہیں۔ لیس علیہم بسلطان پھر کیسے بلا سند کے نئے طریقوں کو ... دین سمجھا جاتے۔ کیا کوئی صالح دعا بد اُمتی خدا کے آخری رسولؐ سے زیادہ دین کا علم اور مرضیاتِ الٰہی کا وجدان و ادراک رکھ سکتا ہے۔

اجتہاد و بدعت دین میں نئی باتیں نکالنے سے ممانعت کی دلیلوں کا کوئی توڑ نہ پاکر بعض حضرات اپنی ... بعض بدعات کے لئے روایات تلاش کر کے کہلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان روایات سے ہم نے فلاں کام نکالا اور اس کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسے فقہی جزئیات کی۔ گویا اجتہاد کی اصل

جس طرح بدعت نہیں جزو دین ہیں اسی طرح ہمارا استنباط بھی بدعت نہیں جزو دین ہے۔

بات قدرے جی لگتی ہے۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں گذارش کرینگے کہ کیا ان کے نزدیک اجتہاد کی تعریف یہ ہے کہ ہر عام وخاص احادیث و آیات سے اپنے علم وعقل کے مطابق مفہوم اور مطالب نکال لیا کرے۔ خواہ اس کے نکلے ہوئے مطالب ماہرین علم وفن کے فیصلوں کے خلاف پڑتے ہوں یا دین کے متفقہ احکام سے ٹکراتے ہوں۔ اگر اسی کا نام انھوں نے اجتہاد سمجھا ہے تو انھیں اپنی عقل کا علاج کرانا چاہئے۔ اجتہاد کچھ مذاق نہیں ہے۔ ساری دنیا مانتی ہے کہ کسی بھی علم وفن کے اصول سے فروعات کا نکالنا اور ایک جزئی کو دوسری جزئی پر قیاس کرنا انھی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو اس علم وفن پر پورا عبور اور دسترس رکھتے ہوں۔ اور یہی عقل و انصاف کا نہ صرف تقاضا ہے، بلکہ اس کے ماننے پر انسان مجبور بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہر علم وفن فاسد و باطل ہو جائے گا۔ تب دین وشریعت جیسے مہتم بالشان علم کے باب میں یہ کون سمجھدار کہہ سکتا ہے کہ اس میں اجتہاد و قیاس کے لئے شرائط وقیود نہیں ہیں۔ شرائط ہیں اور ضرور ہیں۔ چنانچہ اہل علم نے جانچ تول کر صرف انھی حضرات کو مجتہد مانا جن میں شرائط اجتہاد پائی جاتی تھیں اور یہی مجتہدین تھے جنھوں نے زندگیاں کھپا کر قرآن وسنت کے اصول و کلیات سے فروعات کا استنباط کر کے اسلام کا عظیم الشان قانون و دستور مدون کیا۔

ان کے بعد اگرچہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا اور ہونا بھی نہیں چاہئے جب کہ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات میں اس کی لازماً ضرورت باقی رہتی ہے۔ لیکن انھی لوگوں کو اس کا حق دیا جا سکتا ہے جو اپنے کارناموں اور قول

فعل سے یہ ثابت کر دیں کہ اُن میں شرائطِ اجتہاد پائی جاتی ہیں۔

جب یہ طے ہو گیا تو سمجھنا چاہئے کہ کسی شخص کا خواہ مخواہ یہ دعوٰے کرنا معتبر نہیں ہے کہ اس نے اجتہاد کے ذریعہ کوئی نیا نظریہ یا اصول یا عمل قرآن و سنّت سے نکالا ہے۔ جب تک وہ اپنا شرائطِ اجتہاد سے متصف ہونا عملاً ثابت نہ کر دے ورنہ جس چیز کو وہ اجتہاد کہہ رہا ہے اُسے تنگ بندی اور ہوائی قلعہ اور ثمرۂ ہوائے نفس کہا جائے گا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قبر پرستی اور راگ رنگ اور عرس و قوالی اور فاتحہ خوانی اور نذر لغیر اللہ اور اسی طرح کے اُمورِ رائجہ پر اجتہاد و قیاس کا دعویٰ کرنے والے شرائطِ اجتہاد سے تو کیا اُن شرائط سے بھی پوری طرح متصف نہیں ہیں جو ایک اچھے مسلمان کے لئے قرآن و سنت نے بیان کئے ہیں یا بعض اگر اُن میں عملاً اچھے مسلمان ہیں بھی تو علم و فن میں اپنی مہارت و دسترس کا کوئی ثبوت انھوں نے دنیا کے آگے پیش نہیں کیا۔ ایسی صورت میں اُن کے ایسے اجتہادات کیونکر قبول کر لئے جائیں۔ جو نہ تو قرآن و سنت کی میزان میں پورے اُترتے ہیں نہ مجتہدینِ سلف نے اُن کی تائید کی ہے۔ نہ عقلِ سلیم اُنھیں مانتی ہے۔

یہ تو ایک خرابی ہوئی۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ لوگ یا تو بالکل وہ روائتیں لاتے ہیں جو حدیث کی معتبر کتابوں میں نہیں ہیں۔ یا معتبر کتاب میں ہیں بھی تو ماہرینِ فن روایت نے ان کی کمزوری اور خطا واضح کر دی ہے۔ یا پھر صحیح روایات سے ایسے مطالب و معانی پیدا کرتے ہیں کہ جو قطعاً من گھڑت ہوتے ہیں اور دوسری صحیح روائتیں اُن کے خلاف ہوتی ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ایک کتاب میں ہم نے دیکھا کہ جوازِ قبر پرستی کے سلسلہ میں روایت بیان کی گئی کہ :-

"بعض علماء نے کہا ہے کہ جو کوئی رسول اللہؐ کے مزار پر یہ آیت پڑھے اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ اور پھر ۷۰ مرتبہ صلی اللہ علیک یا محمد کہے تو ایک فرشتہ پکار کر اس سے کہتا ہے کہ اے شخص تجھ پر خدا کا درود ہو۔ اسکے بعد اس شخص کی جو مُراد ہوگی پوری ہوگی"

یہ روایت ہی اوّل تو ناقابلِ اعتبار ہے، باعتبارِ سند بھی اور باعتبارِ عقل وقیاس بھی۔ سند کا تو یہ حال ہے کہ اس کے راوی ایک شخص ابن ابی فدیک ہیں۔ جو تابعی تک نہیں اور انھوں نے جس سے روایت لی ہے وہ مجہول الحال شخص ہے اور عقلاً یوں کہ اوّل تو خیر القرون کے علماء سے اس طرح کی کوئی بات منقول نہیں ہے۔ دوسرے یہ روایات اُس حدیث صحیح کے بالکل خلاف ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اُس پر اللہ دس دفعہ درود بھیجتا ہے۔ اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ ستّر مرتبہ درود بھیجنے والے کے لئے اللہ کی طرف سے سات سو درود ہوں لیکن ابی فدیک کی روایت بتاتی ہے کہ ستّر مرتبہ درود کے بدلے اللہ سے صرف ایک درود ملا۔

ایک جگہ یہ روایت دیکھی کہ :-

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب کوئی معاملہ کسی طرح تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اہلِ قبور سے مدد حاصل کرو"

سَو فی صدی جھوٹی روایت ہے۔ علماء جس کے کذب پر متفق ہیں۔ مگر اس سے حجت پکڑنے والوں کو نہ تحقیق سے مطلب ہے نہ اس کا سیقہ۔

ایک یہ روایت دیکھی کہ :-

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص میری قبر کی زیارت
کرے گا میں قیامت کے دن اس کا شفیع و شہید ہوں گا۔"

یہ روایت ابن ابی الدنیا کی "کتاب القبور" میں ملتی ہے جسے ابن ابی فدیک سے نقل کیا گیا ہے۔ ہم ابھی کہہ چکے کہ یہ شخص تابعی تک نہیں اور انھوں نے یہ حدیث حضرت انسؓ کے حوالے سے بیان کی ہے۔ حالانکہ جب تک ابن ابی فدیک اور حضرت انسؓ کے درمیانی راویوں کا پتہ نہ چلے ہرگز روایت معتبر نہیں ہو سکتی۔ کسی مستند کتابِ حدیث میں اس روایت کو نہیں لیا گیا اور لوگ ہیں کہ اس سے قبر پرستی کی ترکیب نکال رہے ہیں۔

ایک یہ روایت سُنی کہ :۔

"فرمایا رسول اللہؐ نے جس شخص نے میری اور میرے پدر ابراہیم
خلیل اللہؑ کی زیارت ایک ہی سال کے اندر اندر کی۔ میں اس کے لئے
جنت کا ذمہ دار ہوں۔"

یہ بھی ایجادِ بندہ۔ قطعاً بے بنیاد۔

یہ ناقابلِ اعتماد روایتوں کی مثالیں ہیں۔ ایک دو معتبر روایات سے قیاس و اجتہاد بھی دیکھئے۔ بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ :۔

"ام سلیمؓ نے رسول اللہؐ کی گرسنگی (بھوکا ہونا) کی خبر پا کر دو روٹیاں
دوپٹہ کے پلو میں باندھیں۔" یہ قصہ لمبا ہے۔ خاتمہ یہ ہے کہ "حضورؐ نے ان
روٹیوں کو ملیدے کی طرح تڑوایا اور برتن میں جو کچھ گھی لگا ہوا تھا وہ اس
میں ٹپکا دیا۔ پھر حضورؐ نے از قسم دعا کچھ الفاظ اس پر اور دس دس
آدمیوں کو بُلا کر کھلانا شروع کیا۔ اسّی آدمیوں نے پیٹ بھر کھالیے تھے
سلیم کے گھر بھر نے کھایا اور پھر بھی بچ رہا۔"

اس روایت سے ایک سلیم العقل اور انصاف پسند مسلمان اس کے سوا کیا مطلب اخذ کر سکتا ہے کہ یہ منجملہ معجزات ہے جو رسول اللہؐ سے صادر ہوتے رہے ہیں۔ آمنا و صدقنا' جو پل بھر میں آسمانوں کی سیر کر آیا۔ اس کے لئے ایسے معجزے اللہ نے بہت سے دیئے۔ مگر بدعت پسند حضرات کو دیکھئے کہ وہ اس سے کھانے پر فاتحہ پڑھنے کا اجتہاد فرماتے ہیں۔ یا للعجب۔

غور کا مقام ہے کہ آنحضورؐ نے کھانے پر فاتحہ نہیں پڑھی۔ بلکہ دعائیہ الفاظ ادا کئے اور آپ کو اُمید تھی کہ اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرما کر کھانے میں معجزانہ برکت عطا کر دے گا۔ یہ اُمید پوری ہوئی اور کتنے ہی بھوکوں کے پیٹ بھر گئے۔ ہمارے فاتحہ خواں حضرات کھانے پر فاتحہ پڑھتے ہیں ... پھر مقصد ایصالِ ثواب ہوتا ہے نہ کہ کھانے میں اضافہ۔ قیا... کوئی تک بھی ہو۔ سوچنے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ مساکین وغ... کھانا کھلاتے تھے اور اتنا کھلاتے تھے کہ کوئی کیا کھلائے گا ... پروری میں کم نہ تھے اور سورۂ فاتحہ رسول اللہؐ اور ان۔ ... تھی اور اس کے فضائل بھی وہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں؟ مگر ... نے کھانوں پر اسے پڑھا ہو اور اس کا ثواب مُردوں کی روحوں کو پہنچ...

ایک اور روایت جو نفی فاتحہ کی سنئے:۔

"مشکوٰۃ میں غزوہ تبوک کے بارے میں مروی ہے کہ جب لوگ بھوکے ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے رسول اللہؐ سے دعا کرانی چاہی۔ تب حضورؐ نے دسترخوان بچھوایا اور کہا جو بناؤ جس کے پاس جو کچھ ہے لے آؤ۔ اس پر کوئی مٹھی بھر اس سے بخت پکڑنے وہ بھر کھجور' کوئی روٹی کا ٹکڑا۔ غرض جس کے پاس کھانے کی ایک سے جو کچھ تھا لے آیا۔ معمولی سا ذخیرہ جمع ہوا۔ حضورؐ نے اس پر دعا

فرمائی اور کہا بھر لو اپنے برتن۔ تمام لشکر نے اپنے برتن بھر لئے اور خوب کھایا اور پھر بھی بچ رہا۔"

اس حدیث کے متن میں دعا بالبرکۃ کے الفاظ ہیں۔ یعنی حضورؐ نے فاتحہ نہیں برکت کی دعا پڑھی۔ اب عقل و قیاس کی کونسی قسم سے یہ فاتحہ کے لئے دلیل بن سکتی ہے۔ فی الحقیقت یہ روایت تو دعا یا کسی بھی سورۂ قرآنیہ کے پڑھنے پر دلیل نہیں۔ کیونکہ یہ فعلِ رسولؐ از قسم احکام و عبادات نہیں، بلکہ قبیلِ معجزات سے ہے معجزہ انبیاء کی خاص چیز ہے۔ اسی لئے تمام کتبِ معتبرہ اُٹھا کر دیکھ لیجئے، کسی مشہور صحابی کو آپ نہیں دیکھیں گے کہ اُس نے حضورؐ کے اس فعل کو حجت بنا کر کھانوں پر دعا یا فاتحہ یا کوئی سورۂ قرآنیہ پڑھنی شروع کر دی ہو۔

ایک اور نمونہ دیکھئے:۔

"بخاری و مسلم میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ میری والدہ نے ایک برتن میں کھجور، کھانا اور گھی اور دہی کا مرکب بنا کر حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ حضورؐ نے اس پر کچھ پڑھا جو کچھ اللہ کو منظور تھا۔ پھر حضرتؐ دس دس آدمیوں کو بلاتے گئے۔ تین سو کے قریب آدمیوں کو کھلایا پھر مجھ سے فرمایا کہ اے انس! اپنا بادیہ اُٹھا لے۔ میں نے اُٹھایا تو حیران رہ گیا کہ اب بھی اس میں کھانا اُس سے زیادہ موجود تھا جتنا پہلے تھا۔"

اس حدیث سے بھی مروجہ فاتحہ کا ذرہ برابر تعلق نہیں معجزات کے باب میں جو شخص حضورؐ کی اُلٹی سُلٹی نقل کرتا ہے اُسے صاحبِ علم تو کیا ہوشمند بھی کہنا مشکل ہے۔

ایسے ہی ایک حدیث قبروں پر پھول وغیرہ چڑھانے کے سلسلہ میں بطور دلیل لائی جاتی ہے کہ حضورؐ ایک مرتبہ کسی قبر سے گذر رہے تھے تو آپؐ نے

کسی درخت کی ایک ٹہنی توڑ کر قبر پر پھیری یا گاڑ دی۔ جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس قبر کی میت پر عذاب ہو رہا تھا۔ یہ ٹہنی مُردے کے لئے دعائے مغفرت کرے گی۔

مجھے مستحضر نہیں کہ یہ روایت کس کتاب میں ہے۔ نہ لکھنے والے نے کوئی حوالہ دیا ہے۔ میں اس روایت کو جُوں کا توں صحیح مانکر بھی اہلِ عقل سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس سے کسی بھی پہلو قبورِ اولیاء پر پھول چڑھانے کا جواز نکلتا ہے؟ یہ روایت تو بتاتی ہے کہ حضورؐ نے پھول نہیں ٹہنی چھوائی تھی۔ آپ ٹہنی کی بجائے پھولوں کی بات کرتے ہیں۔ حضورؐ نے عذاب سے نجات دلانے کے لئے یہ عمل کیا تھا۔ آپ ان بزرگوں کی قبر پر بطور عقیدت و نیازمندی پھول چڑھا رہے ہیں۔ جن کے متعلق آپ عذاب کا وہم بھی گناہ سمجھتے ہیں اور فرض کیجئے آپ اپنے عزیز و اقربا ہی کی قبروں پر اُن کے عذاب کو ہلکا کرنے کے لئے پھول چڑھانے لگیں تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ آپ بھی خود کو رسول اللہؐ کی طرح مقبول بارگاہِ الٰہ سمجھتے ہیں۔ آپ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ کے دستِ مبارک سے ڈالے ہوئے پھول عذاب ہلکا کر دیں گے۔ آپ کے نزدیک گویا میت کے عذاب کو ہلکا کرنے کی تاثیر دستِ رسولؐ میں اور دعائے رسول میں نہیں تھی۔ بلکہ خود ٹہنی میں تھی اور آپ ٹہنی نہ ملنے کی وجہ سے پھول چڑھا رہے ہیں کہ پھولوں میں بھی عذاب کم کرنے کی خاصیت ہے ۔۔۔ اللّٰھم حفظنا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ مزاروں پر پھول چڑھانا منتیں ماننا۔ چادریں چڑھانا کھانوں پر فاتحہ پڑھنا سب عجمی تہذیب و تمدن کے انعامات ہیں۔ جنھیں آپ نے اپنے دین کے سانچے میں ڈھال لیا ہے اور خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن پر آپ کو انعامِ آخرت دے گا۔ زہے خوش خیالی۔

اجتہاد کا ذکر چھڑا ہے تو ایک اور مفید بات بیان کر دوں۔ اہلِ بدعت ویسے تو دُرِّ مختار اور اس نہج کی دیگر کتب فقہ کے احکامات اور روایات کو خاطر خواہ لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ مگر کوئی بات اپنے مطلب کی مل جائے تو انہی کتابوں سے حجت پکڑنے لگتے ہیں۔ مثلاً دُرِّ مختار وغیرہ میں انھیں نظر آئی کہ حضرت علی رض نے ایک شخص کو دیکھا کہ عید کی نماز کے بعد عین عید گاہ میں نماز پڑھ رہا ہے آپ نے اسے نہ روکا۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ آپ کیوں نہیں منع کرتے۔ حضرت علی رض نے کہا مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میں بھی ان لوگوں میں نہ شمار کر لیا جاؤں جنھیں اللہ تعالیٰ نے جھڑکا ہے۔ ارایت الذی ینھی عبدا اذا صلی (کیا دیکھا ہے اُسے جو بندہ کو نماز سے روکتا ہے)۔ اہلِ بدعت کیلئے یہ روایت وحی آسمانی بن گئی اور عملِ او تراویٰ حجت ٹھیر گیا۔ لیکن انھیں اگر مجمع البحرین کی وہ عبارت دکھائی جائے جس سے حضرت علی رض کا نقطۂ نظر اور عقیدہ اس مذکورہ طرزِ عمل کے برعکس معلوم ہوتا ہے تو ہرگز نہ مانیں گے۔ عبارت دیکھئے:۔

ان رجلاً یوم العید اراد ان یصلی قبل صلوٰۃ العید فنھاہ علی فقال الرجل یا امیر المومنین انی اعلم ان اللہ لا یعذب علی الصلوٰۃ فقال علی ولنی اعلم ان اللہ لا یثیبہ علی فعل حتی یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او یحث علیہ فیکون صلوٰتک عبثاً والعبث حراماً۔

ایک شخص نے عید کے روز ارادہ کیا کہ نمازِ عید سے پہلے نماز پڑھے۔ اسے حضرت علی نے روکا اس نے کہا یا امیر المومنین میں جانتا ہوں کہ اللہ نماز پڑھنے پر عذاب نہیں دے گا۔ حضرت علی رض نے فرمایا اور میں جانتا ہوں کہ اللہ کسی ایسے فعل پر ثواب نہیں دیتا کہ جسے نہ تو رسول اللہ صلعم نے کیا ہو نہ اس کا ایما فرمایا ہو۔ پس تیری نماز فعل عبث ہوگی۔ اور فعلِ عبث حرام ہے۔

اہلِ بدعت کچھ بھی کہیں لیکن طالبانِ حق ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ اعمال کے مستحق اجر و ثواب ہونے کے متعلق اُس جلیل القدر صحابی کا کیا زاویۂ نظر تھا جس سے اہلِ طریقت تمام رشتہ ہائے ولایت جوڑتے ہیں اور جسے رسول اللہؐ نے "باب العلم" کہا ہے اور جس کا زہد و اتقا مشہور زمانہ ہے۔ ہم بدعت کے مردود اور ناقابلِ اجر ہونے پر متعدد صفحات میں جو بات سلیقے سے نہ کہہ سکے اسے امیر المومنین حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے چند لفظوں میں کس قدر سلیقے، صفائی اور قطعیت کیساتھ بیان فرما دیا۔ کرّم اللہ وجہہ۔

اَرْبَاباً مِّن دُوْنِ اللّٰہ

قرآن میں ایک دو جگہ نہیں بہت آیتوں میں خدا کے سوا کسی کو "ارباباً من دون اللہ" بنانے پر تنبیہ اور وعید آئی ہے۔ پیرایہ بدل بدل کر اللہ نے شرک سے منع فرمایا ہے:۔

مثلاً:۔ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ○ (سورۂ یونس)

اور مت پکارو اللہ کے سوا کسی کو کہ نہ کوئی تجھے نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ پس اگر تو نے پکارا تو یقیناً تو ظالموں سے ہے۔

یا مثلاً:۔ قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ (سورۂ سبا)

کہہ دے اے محمدؐ بھلا پکارو تو اللہ کے سوا اُن کو جن کے بارے میں تمھیں خوش فہمیاں ہیں۔ نہیں قدرت ہے انھیں آسمانوں اور زمین میں ذرہ برابر۔

اب اگر اس طرح کی آیتیں سُنا کر اہلِ بدعت سے گذارش کی جاتی ہے کہ مرحوم یا زندہ بزرگوں سے دعا کرنا ظلم و شرک ہے۔ اس سے باز آئیے یہ لاحاصل ہی نہیں دوزخ میں پہنچانے والا فعل ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیتیں تو ان کیلئے نازل ہوئی ہیں جو بتوں کو پوجتے تھے، کافر تھے، مشرک تھے، ہم نعوذ باللہ بتوں کو کہاں

پوجتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کہا جائے کہ آیات میں آخر بتوں کا ذکر کہاں ہے وہاں تو من دون اللہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا۔ تو کیا اللہ کے سوا صرف بُت ہیں؟ مرحوم یا زندہ بزرگ اللہ میں داخل ہیں؟ (نعوذ باللہ) وہ کہتے ہیں ہم پوجتے کب ہیں، گویا اُن کے نزدیک پوجنا بس یہ ہے کہ اُن کے آگے سجدہ کیا جائے، اُن کی نماز پڑھی جائے۔ حالانکہ میں آپ کو قولِ رسول ہی سے بتاؤں کہ پوجنا صرف یہی نہیں ہے بلکہ پوجنا یہ بھی ہے کہ جس چیز کو آپ کے بزرگ حلال یا حرام کہہ دیں اُسے آپ قرآن و سنّت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے حلال و حرام مان لیں۔ دیکھئے قرآن میں آتا ہے:۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

اُنھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور فقراء کو اور مسیح ابن مریمؑ کو خدا ٹھیرا لیا ہے۔ حالانکہ انھیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک ہی خدا کی عبادت کریں۔ جسکے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک ہے اُن کے شرک سے۔

حضرت عدی بن حاتم جو ایک عیسائی تھے اور بعد میں ایمان لائے۔ انھوں نے جب یہ آیت سُنی تو رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ اہلِ کتاب نے اپنے علماء اور درویشوں کی عبادت تو کبھی نہیں کی۔ حضورؐ نے جواب دیا عبادت تو نہیں کی مگر ان علماء و فقراء نے بعض حرام چیزوں کو حلال کر دیا اور اہلِ کتاب نے ان کی بات مان لی۔ اسی طرح انھوں نے بعض حلال چیزوں کو حرام کر دیا اور اہلِ کتاب نے اسے قبول کر لیا۔ (ترمذی)

کیا یہ روایت صراحۃً نہیں بتاتی کہ "اربابًا من دون اللہ" بنانے کا مطلب صرف پوجنا نہیں بلکہ حرام و حلال کے معاملہ میں خدا کی ہدایت سے بے نیاز

ہو کر کسی کی بات کو حق اور قابلِ تسلیم سمجھنا بھی پوجنے ہی میں داخل ہے۔ عقل کا واضح تقاضا بھی یہی ہے کہ جب حلت وحرمت کا مکمل اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے تو جسے بھی اس اختیار کا حامل سمجھ لیا جائے وہ اس سمجھنے والے کے نزدیک گویا خدا ہی ہوگا۔ چاہے وہ الفاظ کی حد تک اسے خدا نہ مانتا ہو۔ آج آپ عام طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ لوگ اپنے شیوخ اور مرشدین کی۔ ہر بات کو بلا چون وچرا حق مان لیتے ہیں۔ خواہ قرآن وسنت کے صریح خلاف ہو۔ پیر قوالی سننے، طبلہ، ہارمونیم بجانے اور عرس کرنے کو قولاً اور عملاً کارِ خیر ٹھیرائے گا اور مریدین آمنّا وصدقنا کہہ دیں گے۔ حالانکہ یہ چیزیں قرآن وسنّت سے حرام ثابت ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ نذرونیاز، ٹوٹکا ٹونا سکھائیگا۔ باطل عقائد کا سبق دیگا یہ مان لیں گے۔ زبان ہی سے نہیں دل سے۔ کوئی لاکھ انھیں سمجھائے۔ آیات و احادیث سنائے، ائمہ وفقہا کے ارشادات پیش کرے۔ مگر توبہ، یہ سب کو اس دلیل سے ٹھکرا دیں گے کہ ہمارے اتنے بڑے پیر بھلا کیسے گناہ کا کام کر سکتے ہیں؟ یہ "اربابًا من دون اللّٰہ" بنا لینا نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ شرک نہیں تو شرک کس چڑیا کا نام ہے۔ یہ گمراہی نہیں تو گمراہی کسے کہتے ہیں؟

حق فرمایا صادق ومصدوق فداہ اُمّی وابیؐ نے:۔

اِنَّ لِقلبِ ابنِ آدمَ بِکُلِّ وادٍ شعبۃٌ فمن اَتبعَ قلبَہٗ الشُّعبَ کلَّھا لَمْ یُبالِ اللّٰہُ بایِّ وادٍ اَھلکہٗ، ومن توکّل علی اللّٰہِ کفاہُ الشّعبَ۔ (مشکوٰۃ)	یقیناً آدمی کے دل کی ہر سمت راہ ہے۔ پس جو شخص اپنے دل کو سب راہوں پر چلاتا ہے تو اللہ کو اس کی کچھ پروا نہیں ہوتی جس راہ میں چاہے ہلاک کر دے اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے سب راہوں کی کفایت کرنے والا ہے۔

+ + + + +

یعنی دُنیا میں فکر و نظر اور حرکت و عمل کی بے شمار راہیں ہیں۔ خواہشات کی تکمیل کے گوناگوں وسائل ہیں۔ مطلب برآری اور حصولِ مقصد کے اَن گنت اسباب و ذرائع ہیں۔ آدمی اگر ہوائے نفس اور عقل کے تابع ہو کر ہر طرف دوڑے ہر قسم کے وسیلے اختیار کرے، ہر طریقہ کو حصولِ مقصد کے کام میں لائے حلال و حرام، درست و نادرست اور ثواب و عذاب کی کچھ پرواہ نہ کرے تو اللہ بھی اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور گمراہی اُسے آگھیرتی ہے۔ پھر وہ راہِ گمراہی پر یہی جہاں تہاں برباد و ہلاک ہو جاتا ہے اور اگر وہ مناسب و جائز حد تک جدوجہد کرتے ہوئے اللہ پر بھروسہ رکھے اس سے اُمید باندھے اور اس کی طرف رجوع ہو تو اللہ بہ آسانی اُسے کامیاب کر دیتا ہے اور وہ رنگ برنگی راہوں میں ٹھوکریں کھانے سے بچ جاتا ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر قبروں اور پیروں سے اُمیدِ کارسازی رکھنے والوں کا حال یہ ہے کہ مرادیں حاصل کرنے کے لئے وہ جائز و ناجائز کی ذرا پروا نہیں کرتے اور جس قبر کے بارے میں شہرت سُن لی کہ وہاں مرادیں ملتی ہیں۔ بس اسی کی طرف دوڑے۔ خدائے ذوالجلال مومنین کا حال یہ بتلاتا ہے کہ:۔

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ (سجدۃ)

ہماری آیات پر ایمان وہ لاتے ہیں کہ جب اگر سمجھایا جائے اور ہماری آیات یاد دلائی جائیں تو سجدے میں گر پڑیں اور اپنے لائق تعریف رب کو یاد کرنے لگیں۔

+ + + + +

لیکن بدعت پسند حضرات ـــــ خواہ وہ کسی ملک، کسی شہر، کسی قریہ کے ہوں خواہ میرے ہی شہر کے ہوں، خواہ پردہ دار ہوں یا فاحش، خواہ صوفیت کے جامہ میں ہوں یا علم و تفقہ کے لباس میں ـــــ اُن کا حال یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی سُنکر

ربّ العزت کے جلال و کبریائی کے احساس سے اثر پذیر اور متأثر ہوتا تو بجا۔ برعلاوہ اپنے پیروں، مرشدوں اور بزرگوں کی "آیات" مقابلہ میں لاتے ہیں، اور زبان و عمل دونوں سے اُن کا یہ اعتقاد مترشح ہوتا ہے کہ اللہ کی آیات ہمارے فلک رسا بزرگوں کی "آیات" سے کچھ زیادہ ضروری نہیں ہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (روم)

آدمیوں کی اپنی کارگذاریوں اور کرتوتوں سے خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا۔

جی بے اختیار چند اور آیاتِ قرآنیہ نقل کرنے کو چاہتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٍ مُّنِيْرٍ ٥ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ۔ (سورۂ لقمان)

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے باب میں جھگڑتے ہیں۔ حالانکہ نہ اُن کے پاس علم ہے نہ ہدایت نہ کتاب روشن۔ اور جب اُن سے کہا جائے کہ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا ہے اُسے مانو تو کہہ دیتے ہیں نہیں ہم تو وہی مانیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو جمے ہوئے پایا ہے۔ بھلا اور اگر شیطان انھیں دوزخ کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو پھر بھی۔

\+ + + + +

اسی سورۃ میں ذرا آگے ہے:-

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ٥

اگر روئے زمین کے تمام درختوں کو قلم اور سمندر کو روشنائی بنالیا جائے اور سات سمندر اور بھی روشنائی کے طور پر موجود ہوں نہیں تمام ہو سکتیں اللہ کی باتیں۔ بے شبہ اللہ ہی بڑی قوت والا۔ زبردست حکمت والا۔

\+ + + + +

یہ آیاتِ قرآنیہ زیبِ سخن کے لئے نہیں اس غرض سے نقل کی گئی ہیں کہ،

برادرانِ اسلام ان پر خلوصِ نیت سے غور کریں۔ جو لوگ کارسازی و عطا کے لئے نعوذ باللہ اللہ ربّ العزت کو ناکافی سمجھ کر مُردہ یا زندہ بزرگوں کو پکارتے ہیں۔ قبروں اور استھانوں سے آس لگاتے ہیں۔ ٹوٹکوں، گنڈوں اور نجوم و سحر کے چکر میں پھنستے ہیں۔ کیا انھیں اللہ قدیر و توانا کی اُن لامتناہی قوتوں کا شعور و یقین ہو سکتا ہے۔ جن کو اگر لکھا جائے تو تمام روئے زمین کے درخت قلم بن کر سات سمندروں کی روشنائی سے انھیں پورا نہیں لکھ سکتے۔ یہ حضرات تو یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ نے یہ باتیں عالم بد ہن محض تفریحاً فرما دی ہیں اور بندوں کیلئے ان میں کوئی سبق، کوئی نصیحت، کوئی تعلیم نہیں۔

غلو کا جنون توحیدِ حقیقی کی حقیقت و لذت سے بے خبر اور اسلام کی روح سے ناواقف لوگ کسی طرح اُن حدوں میں رہنا گوارا نہیں کرتے جو اللہ نے اپنے رسولؐ کے واسطے سے صریح و جلی طور پر متعین فرما دی ہیں۔ وہ صالحین و اتقیا کو انسانیت کے مراتب و خصوصیات سے بڑھا کر الوہی صفات سے متصف کرتے ہیں اور جب صالحین کے ساتھ یہ معاملہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سب کے سردار اور افضل البشر ہیں۔ انھیں تو یہ حضرات بالکل خدا ہی بنا ڈالتے ہیں۔ میرا یا وہی عقیدے، کھلم کھلا مشرکانہ عقائد اگر دیکھنے ہوں تو ایسے مبتدعین کی کتابیں دیکھئے اور صوفیوں کی محفلوں کے اشعار ملاحظہ کیجئے اور عرس و قوالی کی نعتیں سُنئے۔ کیا نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو بڑھایا ہو گا جو مبتدعین نے رسول اللہؐ کو بڑھایا اور لطف یہ کہ یہ بڑھانا اور غلو کرنا اس مقصد سے نہیں کہ حضورؐ کی پیروی اور فرمانبرداری میں بھی شدت و غلو کیا جائے۔ بلکہ عمل میں تو یہ حضرات اکثر و بیشتر متساہل اور تارک ملیں گے۔ غلو اور افراط صرف ہوائے نفس

کے تحت کرتے ہیں لذتِ سخن اور گرمیِ گفتار کے لئے کرتے ہیں۔ دل پسند افعال
کے جواز کے لئے ... رتے ہیں۔ رسول اللہؐ اُن کے نزدیک عالم الغیب بھی تھے
قادر بالذات بھی تھے۔ حاضر و ناظر بھی تھے۔ بلکہ آج بھی یہ سب کچھ ہیں سبحانہٗ
تعالیٰ عما یشرکون۔ ان کے گوناگوں مشرکانہ عقائد کی تفصیل میں جانے کے بجائے
آئیے چند نصوص ... آپ کو دکھاؤں:۔

سب سے پہلے کلمۂ شہادت ہی کو دیکھئے کہ جس پر مدارِ ایمان ہے:۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہی ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اُسکے بندے اور رسول ہیں

اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ عبد کو یعنی بندہ ہونے کو پہلے بیان کیا گیا، رسولؐ ہونے کو بعد میں۔ گویا ہر مسلمان رسول اللہؐ کی عظمت و فضیلت جاننے سے پہلے یہ حقیقت اچھی طرح سے سمجھ لے کہ محمدؐ صرف ایک بندہ ہی ہیں۔ اللہ کے عبد، اُلوہی قوت و عظمت میں اُن کی کوئی شرکت نہیں۔

پھر قرآن میں متعدد بار صراحت و وضاحت کی انتہائی ممکنہ حدوں تک حضورؐ کی عبدیت و بشریت کو بیان کیا گیا:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (کہف)

کہہ دے (اے محمدؐ) میں تو ایک بشر ہوں میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تمہیں بتاؤں تمہارا معبود خدائے واحد ہے۔

یہی تنبیہ و توثیق سورۃ فصلت میں کی گئی۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ

یہ اَن ہونی بات ہے کہ ایک بشر کو اللہ کتاب اور قوتِ فیصلہ اور نبوت دے پھر یہ بشر لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائے

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔
اللہ کے سوا۔

گویا یہاں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا گیا کہ جس کے بعد کسی بھی نبی کے لئے مافوق البشر سمجھے جانے کی گنجائش ہی نہیں اور سورۃ ابراہیمؑ میں جملہ انبیائے سابق کے قول کو بھی اسی حقیقت کی وضاحت کے لئے بیان فرمایا گیا:۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔

رسولوں نے اُنسے کہا کہ ہم تو صرف بشر ہیں تمہاری طرح۔ ہاں اللہ اپنے جس بندے پر چاہے احسان فرماتا ہے (یعنی اللہ نے احسان فرما کر ہمیں نبوت عطا کر دی)

آخر ان آیات سے زیادہ صریح اور کن الفاظ میں اللہ تعالیٰ یہ بتاتا کہ ہر نبی اور رسول فقط بشر ہوتا ہے۔ مافوق البشر اس میں کوئی قوت نہیں ہوتی اور جو معجزہ اس سے ظہور میں آتا ہے وہ اللہ ہی کی عطاء اور احسان ہے نہ کہ بجائے خود نبی کے اقتدار و قوت کی دلیل۔ کن واضح بے ریب لفظوں میں اللہ نبی سے کہلواتا ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف)

(اے محمدؐ) کہہ دے میں اپنی جان کے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں، لیکن جو کچھ اللہ چاہے اور اگر میں غیب کا حال جانتا تو بہت بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے برائی کبھی نہ پہنچتی میں تو بس ڈرانے والا ہوں اور خوشخبری دینے والا ہوں۔ ایماندار لوگوں کو۔

بعینہٖ یہی شروع کے الفاظ سورۃ یونس میں وارد ہوئے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں پہلے ضر ہے اور پھر نفع۔ سورۃ جن میں فرمایا گیا:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ

کہہ دے میں تو بس اپنے رب کو پکارتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں کرتا۔ کہہ دے میرے قبضہ

لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا۔ میں نہیں تمہارا نقصان اور تمہیں راہ پہ لانا۔

یہ تو چند آیات قرآنیہ ہوئیں۔ ذرا خود ارشادات رسولؐ کو بھی دیکھئے نسائی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ:-

"کچھ لوگ رسول اللہؐ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ اے رسول اللہؐ اے وہ کہ ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے بیٹے ہو، اور سردار اور سردار کے بیٹے ہو......"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی حضورؐ نے قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا:-

يا ايها الناس قولوا بقولكم ولا يستهوينكم الشيطان انا محمد عبد الله ورسوله ما احب ان ترفعوني فوق منزلتي التي انزلني الله عز وجل۔

اے لوگو! اپنی معمولی باتیں کرو اور تمہیں شیطان بہکانہ دے۔ میں محمد ہوں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مجھے یہ پسند نہیں کہ تم لوگ مجھے اس درجہ سے بڑھاؤ جو درجہ اللہ نے مجھے دیا ہے۔

دیکھ لیجئے۔ کہنے والوں نے کوئی خلاف واقعہ بات نہیں کہی تھی کوئی شرک نہیں کیا تھا۔ لیکن حضورؐ نے اس سے بھی روکا اسے بھی شیطان کی دراندازی خیال فرمایا۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ غلو پسندی آدمی کو کہاں تک لے جاتی ہے اور بے قید و بے محل قصیدہ پڑھنے والا مزاج و ذہن کس افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے

بخاری و مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لا تطروني كما اطرت النصارى ابن مريم انما انا عبد فقولوا عبد الله ورسوله۔

دیکھو مجھے حد سے نہ بڑھانا جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو حد سے بڑھا دیا۔ میں صرف اللہ کا بندہ ہوں، لہٰذا تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

مشکوٰۃ میں بخاری سے ایک حدیث منقول ہے کہ :-

"کچھ چھوکریاں حضورؐ کے سامنے آپس میں کہنے لگیں کہ ہمارے بڑے بوڑھے بدر میں مارے گئے ایک چھوکری نے کہا ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو کل کی بات جانتا ہے" اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا :-

دعی ھٰذا وقولی بالذی کنت تقولین۔ یہ بات چھوڑو بلکہ وہی باتیں کرو جو تم پہلے کر رہی تھیں۔

یعنی اور باتیں کہے سُنے جاؤ یہ "کل کی بات جاننے" والا کلام چھوڑ دو حالانکہ ہو سکتا تھا ان چھوکریوں نے یہ جملہ اس مفہوم میں بولا ہو کہ نبیؐ چونکہ مرنے کے بعد کا حال بتا رہے ہیں اس لئے گویا وہ آئندہ کی بات بتا رہے ہیں۔ لیکن چونکہ اُن کے الفاظ علمِ غیب کے موہم تھے اس لئے حضورؐ نے روک دیا۔

اور دیکھئے۔ مشکوٰۃ ہی میں بخاری سے نقل کیا ہے :-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لا ادری وانا رسول اللہ مایفعل بی ولا بکم۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم اللہ کی میں اللہ کا رسول ہونیکے باوجود نہیں جانتا کہ میرے ساتھ اللہ کا کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا۔

+ + + +

حد ہے اس وضاحت و تصریح کی کوئی ؟ ممکن رہا مومن کے لئے رسول اللہ کو عالم الغیب یا حاضر و ناظر یا اور کسی حیثیت میں مافوق البشر ماننا ؟ قال اللہ تعالٰے

وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ۔ (انعام) اللہ نے فرمایا کہ اسی کے پاس کُنجیاں ہیں غیب کی، نہیں جانتا انہیں کوئی بھی اُسکے سوا۔

یہ تو چند آیات و احادیث ہیں۔ قرآن و احادیث دونوں ہی سے ناقابلِ انکار طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نہ عالم الغیب تھے نہ خدا کی طرح

حاضر و ناظر، نہ معجزات میں آپؐ کی ذاتی قدرت کو دخل تھا۔ نہ آپؐ اپنے طور پر کسی کو ہدایت نصیب کرنے یا نفع و نقصان پہنچانے یا بخشنے پر قادر تھے۔ سب کچھ اللہ کی طرف سے تھا اور جو شخص انھیں عالم الغیب کہتا ہے۔ وہ بقول حضرت عائشہ صدیقہؓ بڑا بھاری بہتان باندھتا ہے۔ (بخاری)

حدیث کی سب سے مستند اور مقبول کتابیں بخاری اور مسلم اُٹھا کر دیکھئے ملے گا کہ آنحضورؐ انسانوں کی طرح کبھی بھولتے بھی تھے۔ بعض خبروں کے منتظر بھی رہتے تھے۔ اصحاب سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ دُنیادی اُمور میں آپؐ کے خیال کا کبھی کبھار وہ نتیجہ نہیں نکلا جو حضورؐ سمجھتے تھے۔ جس پر آپ نے فرمایا۔ انتم اعلمون بامور دُنیاکم۔ مبتدعین کی جسارت کی انتہا ہے کہ صحیح آیات و احادیث پر تو توجہ نہیں کرتے اور دُور دراز باتیں ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ مثلاً وہ روایت اُنھیں نظر پڑ گئی جس میں حضورؐ نے ایکم مثلی کہہ کر نسبتُ کا حد کم فرمایا ہے۔ یعنی "تم میں سے کون میری مانند ہے۔ میں تم جیسا نہیں ہوں۔" بس پھر کیا تھا' ساری آیاتِ قرآنیہ اور احادیث صریحہ صحیحہ پسِ پشت ڈال دی گئیں اور کہا گیا کہ دیکھا حضورؐ خود فرما رہے ہیں کہ میں تم جیسا نہیں اور اس "تم جیسا نہ ہونے کا" مطلب اُن کی نگاہ میں یہ ہوا کہ اب جتنی چاہیں صفاتِ اُلوہیہ اور مافوق البشر قدرتیں حضور کے لئے فرض کرتے چلے جائیں۔ اگر عرض کیا جائے کہ اس کا یہ مشرکانہ مطلب نہیں ہے۔ بلکہ آنحضورؐ کا فضیلتِ اُخروی کے علاوہ قوائے انسانیہ میں نسبتاً ممتاز ہونا سب پر ظاہر و باہر ہے اُسی امتیاز و فرق کی طرف حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے اور خدا کے رسولِ خاص ہونے کی بناء پر اُن کے ساتھ اللہ کا معاملہ سب سے جداگانہ ہونا بھی چاہئے۔ تب یہ کہیں گے کہ نہیں صاحب آپ غلط کہتے ہیں۔

خیر ہماری بات چھوڑئیے۔ آیتِ قرآنی دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب میں امہات المومنین سے خطاب فرماتے ہیں:۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ۔	اے نبی کی عورتو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔

اگر آں حضورؐ کے "لستُ باحدکم" کا مطلب یہی ہے کہ حضورؐ کیلئے اب ہر فوق البشر قوت وقدرت کے اثبات کا دروازہ کھل گیا تو اُمہات المومنین ازواجِ مطہرات کے لئے بھی اس کا دروازہ کھول دیجئے۔ انکو بھی عالم الغیب اور حاضر و ناظر مانئے۔ وہ تو حدیث ہی تھی یہ قرآن ہے۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا)

میں ابھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن وقت کی کمی اور طوالت کے خوف سے رُک جاتا ہوں۔ تاہم جو کچھ میں نے کہا ہے وہی اتنا کافی ہے کہ اگر اس پر خلوص اور دیانت سے توجہ کی جائے تو کتنی ہی بُرائیوں اور غلط عقیدتمندیوں سے پناہ مل سکتی ہے۔ مجھ کم حیثیت اور بے بضاعت کی نہیں اُس آمرِ مطلق اور حاکم حقیقی اور مالک وخالق کی سُنئے جو فرماتا ہے کہ:۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ (روم)	سیدھا رکھ اپنا منہ سیدھی راہ پر۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آپہنچے جس کا ٹلنا اللہ کیطرف سے مقدور نہیں ہے۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ اس اُمت کا آغاز جس چیز سے سنوارا ہے اسی سے اس کا آخر بھی سنورے گا۔ آج کے ہمہ گیر بگاڑ کو سنوارنا ہے تو اپنے اپنے گروہی معتقدات اور عصبیتوں کو چھوڑ کر قرنِ مبارکہ کی طرح قرآن وسنت کی طرف آیئے اور قرآن وسنت ہی کو عقیدہ وعمل کا مبنیٰ بنائیے۔

بدعت کے عظیم نقصانات

آپ اسلام کی تاریخ پر غور فرمائیں تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کو اگرچہ غیر مسلم قوموں نے بارہا عظیم نقصان پہنچایا ہے لیکن خود "اسلام" کو اُن سے ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچا۔ یہ حقیقت آپ اس وقت ٹھیک طرح سمجھیں گے جب یہ غلط خیال اپنے دماغ سے نکال دیں کہ اسلام اور مسلمان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یا یہ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے نمائندے اور ترجمان ہیں۔ اس غلط خیال کو صراحتاً تو کوئی بھی سمجھدار ظاہر نہیں کر سکتا۔ لیکن عملاً دیکھا جا رہا ہے کہ مدت سے عوام میں ان دونوں کے مقام و منصب اور حقیقی فرق کا صحیح شعور نہیں ہے اور بعض پڑھے لکھے تک اپنی تحریروں میں ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں کہ گویا اسلام قرآن و سنّت اور اجماع و قیاس تک محدود نہیں ہے بلکہ بعض اولیاء اور اتقیاء کے ذاتی رجحانات و عادات بھی اس کا جزو لازم ہیں یا یہ کہ کوئی عابد و زاہد شخص اگر بعض اعمال کر گیا ہے تو ان اعمال کو قرآن و سنت پر پیش کئے بغیر بھی اسلام کی ترجمانی اور نمائندگی کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے یا اگر کسی مسلمان بادشاہ نے کچھ اسلامی قوانین رائج کئے تو اس کے تمام ہی رائج کردہ قوانین اور طریقوں کو قرآن و سنّت کی مطابقت کے بغیر اسلامی کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط خیال کو عام کرنے میں اس سیاسی اصطلاح کو بھی دخل ہے جو مسلمانوں کی ہر سلطنت کو "اسلامی سلطنت" لکھ دینے کی شکل میں رائج ہوئی بہرحال یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام الگ چیز ہے اور مسلمان الگ۔ اسلام ایک نظام حیات اور دستورِ زندگی ہے جو قرآن و حدیث اور اس سے مستنبط کی ہوئی مستند کتابوں میں تحریر ہے اور مسلمان وہ ہے جس نے اس نظام و دستور پر ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ مدعی اگر اس ایمان کے عملی تقاضے پورا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے اور جو اُمور اس دستور میں جرم و گناہ کے خانہ میں درج ہیں انھیں اختیار کر لیتا ہے

تو یہ قصور خود اس کا ہے اور محض اس بنیاد پر کہ وہ اسلام قبول کرنے کا دعوے دار ہے۔ اس کے جرم و گناہ کو نیکی اور بھلائی کے خانہ میں نہیں لکھا جائے گا۔

یہ سیدھی سی بات سمجھ لینے کے بعد یہ جاننا بالکل آسان ہے کہ اہلِ کفر نے مختلف زمانوں میں مسلمانوں پر جو تاخت کی اور اُن کی سلطنتیں چھینیں اور جان و مال برباد کیا اور اُن پر طرح طرح کے ظلم توڑے تو بے شک وہ مسلمانوں کا نقصان تھا۔ لیکن نفسِ اسلام پر اس کی زد نہیں پڑی۔ نفسِ اسلام کا نقصان تو یہ تھا کہ اہلِ کفر اس کے اصول یا جزئیات و فروعات میں کچھ غیر اسلامی نظریات و فروعات اس طرح خلط ملط کر دیتے کہ انھیں اسلامی دستور سے الگ ہی نہ کیا جا سکتا۔ اور جس طرح دیگر اہلِ کتاب کے دین غلط و صحیح کا ایسا مجموعہ بن گئے کہ ان کی تنقیح ممکن ہی نہیں رہی ایسا ہی یا اس سے کچھ کم حال اسلام کا بھی ہو جاتا۔ لیکن اہلِ کفر ایسی کوئی خرابی پیدا نہ کر سکے اور اس کی وجہ جہاں یہ تھی کہ اسلامی مزاج براہِ راست اہلِ کفر سے کوئی نظریہ و اصول قبول کرنے کو تیار نہ تھا وہیں یہ بھی تھی کہ اسلامی ماہرین و مجاہدین نے دستور اسلامی کی تدوین اور تحفظ کے اتنے مضبوط اور محکم طریقے اختیار فرمائے تھے کہ کسی غیر مسلم قوم کے لئے ان میں رخنہ اندازی اور فساد انگیزی ممکن ہی نہ تھی۔

ہاں نقصان اگر اسلام کو پہنچا ہے تو یا تو اُن مسلمانوں سے جنھوں نے میدانِ تکلّم کی شہسواری کے شوق میں عجمی فلسفے، طرزِ فکر، رجحان و مزاج، اسٹائل آئیڈیالوجی اور افراط و غلو کو اسلام میں لا گھسایا۔ یہ حضرات چونکہ نہ صرف مسلمان تھے، بلکہ بہت سے ان میں عبادت گذار اور عالم اور صاحبِ جبّہ و دستار بھی تھے اور حق بیں [illegible] ان کی متکلمانہ زور آزمائیوں سے اسلام کو کتنے ہی محاذوں پر بھی پہنچ [illegible] مسلمان ان کی وجہ سے باطل پرستوں کے مقابلہ میں سُرخ رو

بھی ہوتے۔ لیکن ساتھ ہی کچھ غیر اسلامی نظریات اور نکات اور طریقے اُن کے ذریعہ اسلام میں اس طرح گھس آئے کہ وہ کثیر مسلمانوں کی نگاہ میں اسلامی ہی ٹھہرے اور اُن کے اثرات دین کی جڑوں میں پھیلتے چلے گئے۔

یا پھر دین خالص کو نقصان اُن لوگوں سے پہنچا ہے جو علم و عمل کے اعتبار سے خاصے اچھے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے مزاج اور افتادِ طبع اور علمی اعتبار سے ناقص اجتہاد کے تحت کچھ نئی عبادتیں نکالیں، کچھ نئے طُرقِ طاعت بنائے، کچھ نئے معمولات تشکیلِ دین اختیار کئے۔ یہ لوگ چونکہ عملاً نکوکار اور عابد و زاہد تھے۔ اس لئے عوام نے ان کی نکالی ہوئی بدعتوں کو دین سمجھ کر قبول کر لیا اور بہت سے اُن خواص نے بھی اُنھیں قبول کیا جو یا تو قرآن و سنت کا گہرا علم نہ رکھتے تھے۔ یا ان حضرات سے خصوصی عقیدت ان کے دل میں تھی۔ بہر حال بدعتیں چلیں اور جیسا کہ نفسیات کا تقاضا ہے لوگوں نے ان میں سے نئے نئے سوت اور گوشے اور شوشے نکالے۔ بدعت جو اسلام کی نگاہ میں قانون شکنی اور بغاوت کے اندازکی شے ہے۔ اپنا مزاج بھی جرموں ہی جیسا رکھتی ہے۔ ایک جرم کرنے کے بعد آدمی دوسرا جرم بھی نسبتاً آسانی سے اور تیسرا پوری ڈھٹائی سے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بدعت اختیار کرنے کے بعد دوسری اور تیسری اور چوتھی کی طرف پیش قدمی کرنا عوام اور بعض خواص کے لئے آسان ہو جاتا ہے شیطان کی شعبدہ گری ایک طرف، بے عملی بلکہ بدعملی کے قبیح اثرات دوسری طرف۔ کم علمی مستزاد اور عجمی ماحول و تمدن کے عوامل نورٌ علیٰ نور۔ نتیجہ وہی ہوا جو آج سب کے سامنے ہے۔ مسلمانوں نے اسلام ہی کے نام پر گمراہی کو سینوں سے لگایا۔ اندھیرے کو اُجالا سمجھا، سانپ کو مچھلی جانا۔

اصل یہ ہے کہ جن متکلمین کا میں نے اشارۃً ذکر کیا۔ اُن کا پہنچایا ہوا نقصان

نسبتاً کم اور مبتدعین کا اس سے بہت زیادہ تھا۔ بلکہ گہرائی میں جائیے تو متکلمین کے غیر اسلامی نظریات و مباحث بھی بدعت ہی کی قسم سے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اُن کے ساتھ "علمی" کا لفظ بڑھا دیجئے یعنی "بدعتِ علمی" حاصل یہ کہ بدعتِ علمی کے علمبرداروں کا نقصان تو پھیلاؤ میں کم رہا۔ کیونکہ دقیق اور عالمانہ مسائل سے اس کا تعلق تھا اور علماء کے طبقہ میں ایسے لوگوں کا فقدان نہ تھا جو تجزیہ و تنقید کے ذریعہ غلط اور صحیح، اسلامی اور غیر اسلامی کو الگ الگ کر کے دکھا سکیں۔ لیکن مبتدعین کا نقصان چڑھتے ہوئے دریا کی طرح پھیلا۔ کیونکہ عوام بھیڑ چال کے عادی ہوتے ہیں اور عقیدت و نیاز مندی اُن کے معمولی شعور و فہم پر پوری طرح چھا جاتی ہے۔ جس کے بعد دلیل اور علم کی قوت بہت مشکل سے بہت دیر میں اُن پر کارگر ہوتی ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ عملاً بدعات کی کثرت اور بدعات کی تعلیم دینے والی کتابوں کی اشاعت نے اسلامی قوانین میں اس طرح بدعات کو آمیز کر دیا کہ صحیح اور غلط کا جدا کرنا محال ہو گیا۔ یہ اس لئے نہیں ہوا کہ قرآن و حدیث کو مسخ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی اور سلف صالحین نے علم و فن اور اجتہاد و تفقہ کا جو آئینہ خلف کو دیا ہے وہ بے غبار اور بہت مضبوط تھا۔ مگر اس آئینہ سے فائدہ اُٹھانا اور قرآن و سنّت کو معیار و مستدل بنانا گنے چُنے خواص ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ باقی امت بدعت کا ہدف بن گئی۔ جنھیں دین کی کچھ فہم تھی وہ کم بگڑے جو نافہم تھے وہ زیادہ بگڑ گئے۔ اس بگاڑ کا ایک نقصانِ عظیم تو یہ ہوا کہ اسلام کی تحریک اور دعوتِ اقامتِ دین انبیاء و صحابہ کی راہِ عزیمت پر چلنے کے بجائے اُن غلط راہوں پر مُڑ گئی جن میں رہبانیت ہے تقشف اور لاحاصل شور و غوغا اور بے روح و عبث رسوم و رواج کی بہتات،

بدعتوں نے سنتوں کو نگل لیا۔ ریا اخلاص کو کھا گئی۔ دین میدانِ عزیمت و جہاد سے سمٹ کر درگاہوں، خانقاہوں، قبروں اور محفلوں میں آگیا۔

دوسرا عظیم نقصان یہ ہوا کہ غیر مسلم اقوام کی رائے اسلام کے بارے میں بگڑتی چلی گئی اور جو کشش اس کے اصول و احکام میں تھی اور جس کی وجہ سے یہ حیرت انگیز رفتار سے پھیلا تھا وہ نہ صرف معطل ہو گئی، بلکہ اس کی جگہ بدنمائی اور کثافت نے لے لی۔ ظاہر ہے کہ دیگر اقوام کے عوام کو اس کی فرصت اور اہلیت کہاں کہ وہ براہِ راست قرآن و سنت اور دین کی مستند کتابوں سے صحیح اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں اور کیوں کریں؟ دُنیا کا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے کہ کسی قوم کے دینی اعتقادات و اُصول کا اندازہ اس کے ان اعمال و افعال سے لگاتی ہے جو اس میں بطور مراسمِ مذہبی رواج پائے ہوتے ہوں اور اعتقادات و اُصول ہوتے بھی حقیقت میں اسی لئے ہیں کہ اعمال و افعال میں اُن کا ظہور ہو۔ دُنیا نے جب عُرسوں، قوالیوں، قبر پرستیوں، درگاہ سازیوں اور اسی نوع کی متعدد چیزوں کو مسلمانوں میں دینی حیثیت سے رائج پایا تو گمان کر لیا کہ یہ سب اسلامی احکام و اُصول کا ظہور ہے اور اس غلط گمان کو تقویت اس صورتِ حال نے دی کہ جو لوگ ان اعمال میں مبتلا تھے وہ زبان و بیان سے نمائندگیِ اسلام کے مدعی بھی تھے اور ان میں سے بہت سوں کا ظاہر بھی ایسا تھا کہ سطح بین نگاہیں انھیں ترجمانِ اسلام سمجھنے پر قدرتاً مجبور تھیں۔ چنانچہ نفسِ اسلام کے بارے میں دُنیا کو غلط فہمیاں ہوئیں اور وہ توحیدِ خالص اور تعلیمِ مصفّا جو اسلام میں وجہِ کشش تھی، شرک و بدعت کی بدنمائی اور کثافت میں دب گئی۔ اسلام کا شکوہ، وقار، تقدس اور جاذبیت مجروح ہو گئی۔

میں مانتا ہوں کہ اسلام کے پھیلاؤ اور اشاعت کے رُک جانے میں

یہ خود مسلمانوں کی بداعمالیوں اور غلط کوششوں کا ہے۔ لیکن جو بداعمالیاں مسلمانوں
دین کی آڑ لے کر نہیں، بلکہ خالص دُنیادارانہ طور پر کیں، اُن سے دیگر اقوام
بارے خود مسلمانوں کے حق میں چاہے کتنی ہی خراب ہو گئی ہو۔ مگر نفسِ اسلام
کے متعلق نظری طور پر اُنھیں بدگمانیاں نہیں ہوئیں۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ یہ سب
بُرائیاں نہیں اہلِ مذہب کے اپنے کرتوت ہیں۔ ان بُرائیوں کا سہرا مذہب
پر نہیں اہلِ مذہب کے سر ہے اس کے برخلاف دین کے نام پر عبادت و طاعت
رنگ میں کی جانے والی بُرائیوں نے اُنھیں نفسِ اسلام ہی سے بدگمان کیا
اسلام سے اُن کی دُوری صرف تعصب اور جذباتی عناد کے تحت نہیں رہ گئی۔
اسے عقلی و شعوری دلائل بھی مل گئے۔

دیگر اقوام کے علاوہ خود مسلمانوں ہی کے عقائد و نظریات کو بدعات نے
طور فاسد کیا کہ بیچارے کم علم عوام کے مخلص افراد اگر خلوص اور ایمانداری کے
احکامِ اسلامی کو جامۂ عمل پہنانے کی طرف مائل ہوئے تو اُن کی استعداد کے مطابق
لٹریچر اُن کے ہاتھ آیا اُس میں پہلے ہی سے صحیح کے ساتھ غلط اور اسلام کے
بدعت کی آمیزش تھی اور جو وعظ محراب و منبر سے اُنھیں سُنائے گئے اُن میں
بدعت کی تعلیم کسی نہ کسی درجہ میں موجود تھی۔ اب اُن بیچاروں کے پاس نہ قابلیت
تجزیہ و تنقیح کر کے اسلام و غیر اسلام کو جُدا کر سکیں معصومیت و خلوص سے
رطب و یابس قبول کرتے چلے گئے اور بدعت کا زہر اُن کے ذہن و قلب ،
اور اعمال و افعال میں پھیلتا چلا گیا۔

ریا کے بارے میں آپ جان چکے کہ رسول اللہؐ نے اس کا اندراج شرک کے
میں کیا ہے۔ بدعت اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے دکھاوے اور نمود اور
کو پسند کرتی ہے۔ یہ چیزیں ریا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ گویا بدعت کے

غیر حق میں شرک ہے اور ابتداء میں شرک خفی [illegible]
عملی کی منزل تک پہنچ لیتی ہے۔ شجر بدعت کے برگ و بار [illegible]
دونوں اعتبار سے ان پر شرک کی تعریف صادق نظر آئے گی۔
منکرات و محرمات شرعیہ کا مرتکب مسلمان تو ممکن ہے کہ کسی وقت توبہ
استغفار کی طرف مائل ہو جائے۔ کیونکہ وہ بہر حال گناہ کو گناہ ہی سمجھ رہا ہے اور اس کے
اعتقادات مسخ و فاسد نہیں ہوتے ہیں۔ مگر بدعت پسندوں کے لئے توبہ کا [illegible]
بھی کم ہے۔ کیونکہ وہ جس گمراہی میں مبتلا ہیں وہ تو اُن کی نظر میں عین [illegible]
اور اُن کے اعتقادات مسخ و فاسد ہو چکے ہیں۔

اللھم احفظنا۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ والصلوٰۃ
والسلام علی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عامر عثمانی

دونوں جہاں کے سردار ختم الرسل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ

جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے

فَهُوَ رَدٌّ (بخاری و مسلم)

وہ مردود ہے

نیز فرمایا

اِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰهِ وَخَیْرَ الْهُدٰی

بہترین باتوں کی کتاب قرآن ہے اور بہترین راستہ محمدؐ کا راستہ ہے

هُدٰی مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا

اور بدترین اُمور وہ ہیں جو دین میں نئے نکالے جائیں اور دین میں

وَکُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (مسلم)

ایجاد کی ہوئی ہر نئی چیز گمراہی ہے